"پردہ اٹھتا ہے" مصنف مولانا سید شاہد زعیم فاطمی شہید علیہ رحمہ

پردہ اٹھتا ہے

شہید سید شاہد زعیم فاطمی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ

شیعہ ورلڈ فیڈریشن آف لندن

"پردہ اٹھتا ہے" مصنف مولانا سید شاہد زعیم فاطمی شہید علیہ رحمہ

پردہ اُٹھتا ہے

شہید سید شاہد زعیم فاطمی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ

شیعہ ورلڈ فیڈریشن آف لندن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نام کتاب : پردہ اٹھتا ہے

مؤلف : شہید سید شاہد زعیم فاطمی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ

ایڈیٹر : سید علی مہدی باقری

ناشر : شیعہ ورلڈ فیڈریشن لندن

سال اشاعت : ۱۹۹۱ء

کاتب : عارف سہسوانی

طابع : ایرانین آرٹ پریس دہلی

اِس کتاب کی اِشاعت کے مصارف شیعہ ورلڈ فیڈریشن لندن نے تامین کئے ہیں۔

باہتمام ایشین پبلیشرز
اے۔سی۔۴/۵۶ سی
شالیمار باغ۔ نئی دہلی ۔ ۵۲

ASIAN PUBLISHERS
AC IV / 56C, SHALIMAR BAGH
NEW DELHI - 52

قیمت : ۸۰ روپیہ ، ۵ پاونڈز ، ۱۰ ڈالرز

مومنین سے درخواست ہے کہ شیعہ ورلڈ فیڈریشن کے حصول ومقاصد اور توفیق کے واسطہ دعا فرمائیں

پردہ اٹھتا ہے

حضرت شہید سید شاہد زعیم فاطمی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ

شیعہ ورلڈ فیڈریشن آف لندن

کی پیش کش

زیر سرپرستی جناب حجۃ الاسلام والمسلمین

الحاج اصغر علی محمد جعفر المعروف ملا اصغر مدظلہ

بانی وصدر شیعہ ورلڈ فیڈریشن۔ لندن

زیر سرپرستی جناب حجۃ الاسلام والمسلمین

ایڈیٹر سید علی مہدی باقری

بااہتمام ایشین پبلیشرز: اے سی ۴/۵۶-سی

شالیمار باغ۔ نئی دہلی — ۱۱۰۰۵۲

فون : 7233629

فہرست مطالب

۱- شیعت ایک مطالعہ ایک تجربہ	۵
۲- تمہید	۲۰
۳- در دل پر دستک	۷۷
۴- دو متضاد سمتوں کا مسافر	۸۱
۵- عہد صحابہ کی تاریخ۔ ایک افسوس ناک ورق	۸۴
۶- قضیۂ فدک	۸۸
۷- تاریخی پسِ منظر	۹۵
۸- جیش اسامہ	۹۸
۹- شرم ناک اور شرانگیز خطبہ	۱۰۰
۱۰- شتر کینہ قوم	۱۰۴
۱۱- کیا یہ اقتدار کی جنگ تھی	۱۰۷
۱۲- حدیث غدیر	۱۱۰
۱۳- ایمان ابو طالب	۱۱۵
۱۴- تاریخ کی تضاد بیانی	۱۲۳
۱۵- یار غار کون	۱۲۶
۱۶- بساطِ سیاست کے دو مہرے	۱۳۰

۱۷- خلافت راشدہ یعنی چہ ۱۳۷
۱۸- غصب حقوق کی منصوبہ بندی ۱۴۰
۱۹- صحابہ یا خرابہ ۱۴۷
۲۰- آئینہ ان کو دکھایا تو برا مان گئے ۱۵۲
۲۱- اسوۂ ابراہیمی ۱۵۵
۲۲- معاویہ اور اسلام ۱۶۳
۲۳- استبداد ۱۶۶
۲۴- کہہ مکرنی ۱۶۹
۲۵- دس جنتی یا آٹھ جہنمی ۱۷۳
۲۶ ریت کی دیواریں ۱۸۵
۲۷ گستاخ رسولؐ ۱۹۳
۲۸ مرکز محبت کون ہے ۲۰۳
۲۹ آل عبا ر ۲۱۲
۳۰ آل رسول سے بغض ۲۱۴
۳۱ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبوب شخصیتیں ۲۱۶
۳۲ ایک اعتراض اور اس کا جواب ۲۲۰
۳۳ ڈھول کا پول ۲۲۹
۳۴ شاہ اسمٰعیل کی شہادت ۲۳۵
۳۵ خدارا یے چہرہ دستاں ! سخت ہیں فطرت کی تعذیریں ۲۳۸
۳۶ تمثیل عین اسلام ہے ۲۴۲
۳۷ فن تاریخ پر ستم ۲۴۵

۳۸	کتب حدیث کی افادیت	۲۴۸
۳۹	ابوہریرہ ضمیر فروش راوی	۲۵۲
۴۰	ایمان ابوطالب (ع)	۲۶۰
۴۱	ایک اور ضمیر فروش صحابی	۲۶۶
۴۲	مغیرہ بن شعبہ . ایک بدفطرت انسان	۲۶۸
۴۳	اجتہادی غلطی کا اصل روپ	۲۷۳
۴۴	زانی سپہ سالار خالد بن ولید	۲۷۵
۴۵	دس جنتیوں والی روایت اور اس کا جھوٹا راوی عبدالرحمٰن بن عوف	۲۷۸
۴۶	خلیفہ دوم کی تضاد بیانیاں	۲۸۴
۴۷	خلافت راشدہ کا اسلام - ایک خون آشام مذہب	۲۹۵
۴۸	غزوہ تبوک اور پیغمبر اسلام کی امن پسندی	۲۹۷
۴۹	تاریخ انسانیت کا بدترین دور	۳۰۲
۵۰	شتر کینہ قوم	۳۰۸
۵۱	اصلی مجرم	۳۱۱
۵۲	مولائے کائنات (ع)	۳۲۵
۵۳	بنی امیہ کی اسلام دشمنی	۳۲۷
۵۴	شان صحابہ ایک بے معنی لفظ	۳۳۷
۵۵	چت بھی میرا اپٹ بھی میرا	۳۴۳
۵۶	ولایت و امامت علی پر ایک مستند سنی عالم کی دستاویزی شہادت	۳۴۶
۵۷	صحابہ سے ہمدردی کا مروڑ کیوں اٹھ رہا ہے .	۳۵۴
۵۸	بنت پیغمبر سے بدسلوکی	۳۵۸

۵۹	درود ابراہیمی	۳۶۱
۶۰	مجرمانہ ذہنیت کے لوگ	۳۶۴
۶۱	صحابی پیغمبرؐ سے بھی افضل ہیں اہل سنت کا عقیدہ	۳۷۱
۶۲	بخاری ایک بد نہاد محدث	۳۷۳
۶۳	حرامیوں کی پہچان	۳۷۶
۶۴	گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے	۳۸۵
۶۵	معاویہ بن ابی سفیان	۳۸۹
۶۶	خلیفہ دوم کی شراب نوشی ۔ عہد خلافت راشدہ کی ایک جھلک	۴۰۲

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿٦١﴾

(آل عمران پارہ ۳)

... آؤ رو در رو ہو کر بات طے کریں تم اپنے خاندان کے افراد کو لے آؤ ہم اپنے خاندان کے افراد کو لے آتے ہیں. پھر خدا کے حضور سچ اور جھوٹ کے درمیان امتیاز کی درخواست پیش کرتے ہیں تاکہ جھوٹوں پر خدا کی پھٹکار ڈالیں.

(آل عمران پارہ ۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

یہ کتاب شریف "پردہ اٹھتا ہے"، حضرت شہید سید زعیم فاطمی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کی تحقیق اور استبصار کی روشنی ہے۔ حضرت حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ الحاج آقای اصغر علی محمد جعفر المعروف ملا اصغر صاحب قبلہ حفظ اللہ تعالیٰ بانی وموسس اور صدر شیعہ ورلڈ فیڈریشن کی حسب فرمائش۔ جہت احقاق الحق ہندوستان میں شائع کرنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت کے مصارف شیعہ ورلڈ فیڈریشن آف لندن نے فراہم کئے ہیں۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ شیعہ ورلڈ فیڈریشن اور اس کے بانی اور جمیع اولیاء کو زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے۔

شیعہ ورلڈ فیڈریشن کی طرف سے ایشین پبلیشرز کے اہتمام سے حسب ذیل کتابیں شائع کی ہیں۔

۱۔ مکتب تشیع	قیمت ۶۰ روپیہ
۲۔ انقلاب اسلامی حضرت امیر مختار علیہ السلام	" ۵۰ "
۳۔ ہدایت الحق	" ۷۵ "
۴۔ TO WARDS KARBALA	" ۷۰ "
۵۔ مع الصادقین۔ سچوں کے ساتھ	" ۷۵ "
۶۔ حضرت مولائے کائنات اور ان کے سیاسی حریف	" ۵۰ "
۷۔ پردہ اٹھتا ہے	" ۷۵ "

خواہش مند حضرات مذکورہ کتابوں کو ایشین پبلیشرز سے طلب فرمائیں شیعہ ورلڈ فیڈریشن دنیا بھر میں اسی طرح ہر زبان میں شیعہ مکتب فکر کی کتابوں کو شائع ونشر کرتی ہے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضرات اہلِ بیت طاہرین (ع) کے وسیلہ سے درخواست کرتا ہوں کہ شیعہ ورلڈ فیڈریشن آف لندن اور اس کے بانی وصدر محترم جناب ملا اصغر صاحب قبلہ مدظلہ کو طول عمر عطا فرمائے اور ان کے فیض کو عام کرے۔ آمین۔

سید علی مہدی باقری

۲ دسمبر ۱۹۹۱ء

ان کے بڑے گہرے روابط برقرار تھے۔

جناب مُلّا اصغر صاحب نے مومباسا میں اپنی تعلیم حاصل کی اور انگریزی، گجراتی، اُردو، عربی، فارسی اور سہیلی زبانوں پر کامل تسلّط حاصل کیا۔ جناب مُلّا صاحب ان زبانوں میں بہترین تقریر کرتے اور مجلس پڑھا کرتے ہیں۔ ملّا صاحب نے اپنی دینی اور سماجی خدمات کو ۱۹۵۱ء میں مومباسا سے شروع کیا یعنی عنفوانِ جوانی میں وہ بزرگانِ قوم سے دادِ تحسین وصول کر چکے ہیں وہ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۸ء تک خوجہ شیعہ اثنی عشری جماعت افریقہ کے آنریری سکریٹری رہے ہیں۔

۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۳ء تک جماعت کے نائب صدر رہے۔ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۵ء تک وہ موموباسا سے نیروبی سکونت کے لئے چلے گئے اور وہاں انھوں نے مختلف میدانوں میں جماعت کی بہترین خدمات انجام دی ہیں۔

۱۹۸۲ء میں وہ عتباتِ عالیہ کی زیادات کے لئے ایران اور عراق تشریف لے گئے اور عراق میں چار ماہ تک ملّا صاحب ظالم و جابر طاغوت کی سخت قید و بند میں گرفتار رہے اور اس عرصہ میں آنجناب نے شیاطین دژخیمان کے ہر قسم کے آزار ستم اور مظالم سہے۔ قیدِ ظلم سے رہائی کے بعد لندن تشریف لائے اور ۱۹۸۲ء میں لندن ہی میں مقیم ہو گئے۔ وہ ابھی نیروبی ہی میں تھے کہ شیعہ ورلڈ فیڈریشن کی ۱۹۷۶ء میں بنیاد ڈالی اور ۱۹۷۹ء تک صدر رہے۔ اس کے بعد ۱۹۸۲ء میں لندن میں مستقل طور پر سکونت اختیار کی، اور فیڈریشن کا آفس نیروبی سے لندن منتقل ہو گیا۔ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۸ء تک فیڈریشن کے مدیر رہے۔ پھر ۱۹۸۸ء میں انھیں دوسری مرتبہ فیڈریشن کا صدر منتخب کیا گیا اور اب ۱۹۹۱ء میں، پھر صدارت کے عہدہ کے لئے ان کا انتخاب کیا گیا۔

جناب ملّا اصغر صاحب قبلہ ہمیشہ تبلیغِ دین اور خدماتِ عامہ کے عنوان سے دوسرے ممالک۔ کا دورہ کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے متعدد مرتبہ ہند، پاکستان، کناڈا

ذکرِ جمیل

اپنے محترم قارئین کے شدید اصرار کے سامنے جز تسلیم ہونے کے راہِ چارہ نہیں تھی۔ ہمارے دوست و احباب بار بار یہ فرمائش کرتے تھے کہ حضرت حجتہ الاسلام والمسلمین الحاج علامہ آقائے اصغر علی المعروف بملا اصغر حفظہ اللہ تعالیٰ کی ہمہ گیرو ہر دلعزیز شخصیت کے اطراف و جوانب کو خامۂ تحریر سے مرقسم کر دیں۔ لیکن یہ کام ہمارے واسطے بیحد دشوار اور مشکل ہے۔ کیونکہ ہمہ آتشہ اور متعدد ابعاد والی ہستی کی صحیح تعریف بہت ہی مشکل ہوتی ہے۔ یہاں منطقی ناطقہ بھی دم توڑ دیتا ہے۔ لیکن دوستوں کے حکم سے سرپیچی بھی کوئی لائق تحسین کام نہیں ہے۔ ہندوستان اور پاکستان سے سیکڑوں کی تعداد میں مومنین نے فرمائش کی ہے کہ ایشین پبلشرز کی طرف سے شائع ہونے والی کسی کتاب میں حضرت علامہ اصغر علی ملا اصغر مدظلہ کی سوانح حیات پیش کر دیں تاکہ راہِ خدا میں قدم رکھنے والوں کو حوصلہ ملے اور سنگِ میل کے عنوان سے نقشِ قدم کا سہارا مل جائے۔ یہاں محسوس ہو رہا ہے کہ ایسی عظیم الشان اور ہمہ آتشہ ہستی کے بارے میں قلم اٹھانا بیشک ایک مشکل امر ہے۔

جناب ملا اصغر مدظلہ مرجعِ تقلید نہیں ہیں۔ ہاں بیشک مرجعیت کی تشخیص میں وہ یقیناً ایک خدا شناس اہلِ خبرہ ہیں۔ میرا چشم دید واقعہ ہے کہ جب نجفِ اشرف

اور امور میں غور و فکر کرنے کی مجال کب پاتے ہیں۔ وہ کیا جانیں کہ وہ ہیں کیا اور کیوں آئے ہیں؟ کہاں جائیں گے؟ وہ صرف کھانے پینے والے انسان ہیں اور دُنیا والوں نے کبھی اس کو حیوانِ ناطق کہا اور کبھی سماجی حیوان۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ اگر اندیشہ سے بھی آراستہ ہو تب بھی حیوان ہی ہے۔ اور اگر وہ اپنے سماج کا سچّا خدمت گذار ہو تب بھی حیوان ہی ہے۔

اسلام آیا اور اُس نے معیارِ فضیلت ہی بدل دیا۔ اسلام نے کہا کہ انسان ایک خدائی مخلوق ہے۔ انسان کے اس خطاب میں اس کی اصلی عزّت و افتخار ہے۔ انسانِ خدائی کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو صرف خدا کا ہو کر رہنا ہے یعنی اُس کا ہر کام خُدا کے لئے ہو۔ اُس کی موت خدا کے لئے ہو، اس کا حشر خدا کے لئے ہو اور نشر بھی خدا کے لئے ہو۔

ہمارا رہبر قائد، لیڈر حضرت علّامہ الحاج اصغر علی مُلّا اصغر مدظلہٗ لاریب خدا کے لئے ہے۔ ان کی ہستی، وجود، اعضاء و جوارح ہمگی للہ رب العالمین ان کا سب کچھ خدا کے لئے ہے۔

جناب اصغر علی مُلّا اصغر صاحب مدظلہٗ نے مشرقی افریقہ کے مومباسا شہر میں ۱۹۳۶ء میں اس دنیا میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد صاحب جناب مُلّا محمد جعفر رح مشہور و معروف ذاکر حسین (ع) اور خطیب آلِ محمدؐ تھے۔ وہ مدّتوں مومباسا میں حُسینی نائٹ اسکول کے پرنسپل رہے ہیں۔ ان کے جدِّ امجد حاجی محمد جعفر شریف دیوجی بھی مشہور ذاکر حسینؑ اور بڑے پایہ کے تاجر تھے۔ انھوں نے اسلامی علوم میں بیس سے زیادہ کتابیں گجراتی زبان میں لکھی ہیں۔ ان کی دو کتابیں "امامِ زمانہ" اور "رویتِ ہلال" کا اُردو میں ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ انھیں کے مُبارک ہاتھوں سے مومباسا میں حسینی نائٹ اسکول کی بنیاد پڑی اور آنمرحوم سالہا سال اس اسکول کے پرنسپل رہے ہیں۔ انھوں نے افریقہ کے کونے کونے میں صدائے توحید کا پرچار کیا ہے۔ ہندوستان بھر کے علماء اور مدارس سے

یوروپ، امریکہ کے فیڈریشن کی طرف سے دورے کئے اور کرتے رہتے ہیں۔ آنجناب نے ۱۹۸۶ء میں مدرسہ سید الخوئیؒ کی بنیاد ڈالی۔ اس مدرسہ میں اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ ملا صاحب بہ نفسِ نفیس اس مدرسہ کے مُدیرِ اعلیٰ ہیں۔

۱۹۸۶ء سے آج تک شبِ شنبہ کو مرکزِ اسلامی اسٹینمور میں انگریزی میں ملا صاحب کا لیکچر ہوا کرتا ہے! اس لیکچر کا آفاق میں شہرہ ہے۔ موسمِ سرما میں شنبہ اور یکشنبہ کے روز صبح کی نماز کی امامت اور بعد نماز علومِ اسلامی کے موضوعات پر تقریر فرماتے ہیں۔ ملا صاحب کی تقاریر اور مجالس ویڈیو اور آڈیو کیسٹ پر دُنیا بھر میں سُنی جاتی ہیں! اسلامی مرکز اسٹینمور میں نمازِ جماعت کی امامت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

مُلا صاحب کی ہمہ جانبہ جذاب شخصیت نے انھیں قوم میں ہر دلعزیز بنا دیا ہے۔

ان کی محبوب ہستی کے بارے میں کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ لیکن میں اختصار سے کام لیتے ہوئے بس اُن کے حق میں دُعائے خیر کے کلمات پر اکتفا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضرت محمدؐ و آلِ محمدؐ کے واسطہ سے دُعا کرتا ہوں کہ ہمارے اس سچے، اچھے، مہربان رہبر اور قائد کو صحت و عافیت کے ساتھ طولِ عمر اور توفیق عطا فرمائے۔ اور شیطانی فطرت والے حاسدین اور دُشمنوں کی نظرِ بد سے محفوظ رکھے اُن کے دشمنوں کی آنکھوں میں خاک اور دوستوں کے دل شاد۔ آمین یا الٰہی آمین۔

سید علی مہدی باقری

۲۰ نومبر ۱۹۹۱ء۔ دہلی۔

علماء و مجتہدین اور علوم آلِ محمدؐ کا مرکز تھا۔ اس وقت وہاں کے مجتہدین اور بڑے پایہ کے علماء کی نظر میں جناب مُلّا اصغر مدظلہٗ کا ایک مقام و مرتبہ اور احترام تھا حضرت آیات عظام آقائے محسن الحکیم رضوان اللہ تعالیٰ علیہ و آقائے سید ابوالقاسم الخوئی۔ آقائے سید عبدالاعلیٰ سبزواری۔ آقائے سید رضا صدر۔ آقائے سید محمد رضا گلپایگانی آقائے سید علی خامنہ ای مدظلہم نے انھیں اپنا اپنا وکیلِ مطلق نامزد کیا ہے۔ اور ہر مرجع تقلید نے ملّا صاحب کو اپنا خاص نمائندہ مقرر کرتے ہوئے فخر و انتخار محسوس کیا ہے۔

جناب ملّا اصغر مدظلہٗ کی شخصیت کے بارے میں دوسرا پہلو ان کے مبلغ علم کا ہے یہاں بھی اختصار گوئی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ عرض کردینا کافی ہوگا کہ لندن میں مشہور و معروف مدرسہ خوئی میں دنیا بھر سے آتے ہوئے علم و دانش کے پیاسوں کو سیراب کرتے ہیں۔ اور فقہ و اُصول، فلسفہ و منطق، تفسیر و حدیث اور علمِ کلام میں محققین کی راہنمائی کرتے ہیں۔

خطابت کے میدان میں ملّا اصغر صاحب اُردو، انگریزی، سہیلی، فارسی اور عربی، زبان میں قدرتمند فصیح و بلیغ سخنور اور خطیب ہیں۔ اور دنیا بھر میں ان کی تقریروں کی ویڈیو اور آڈیو کیسٹنز بڑے شوق سے سُنی جاتی ہیں اور اہلِ حق اپنی علمی پیاس بجھاتے ہیں۔

آستانہ اہلِ بیت اطہار (ع) سے ملّا صاحب کی وابستگی محکم و استوار ہے اور مذہب اہلِ حق کے پیروکار انھیں اپنا رہبر مانتے ہیں۔

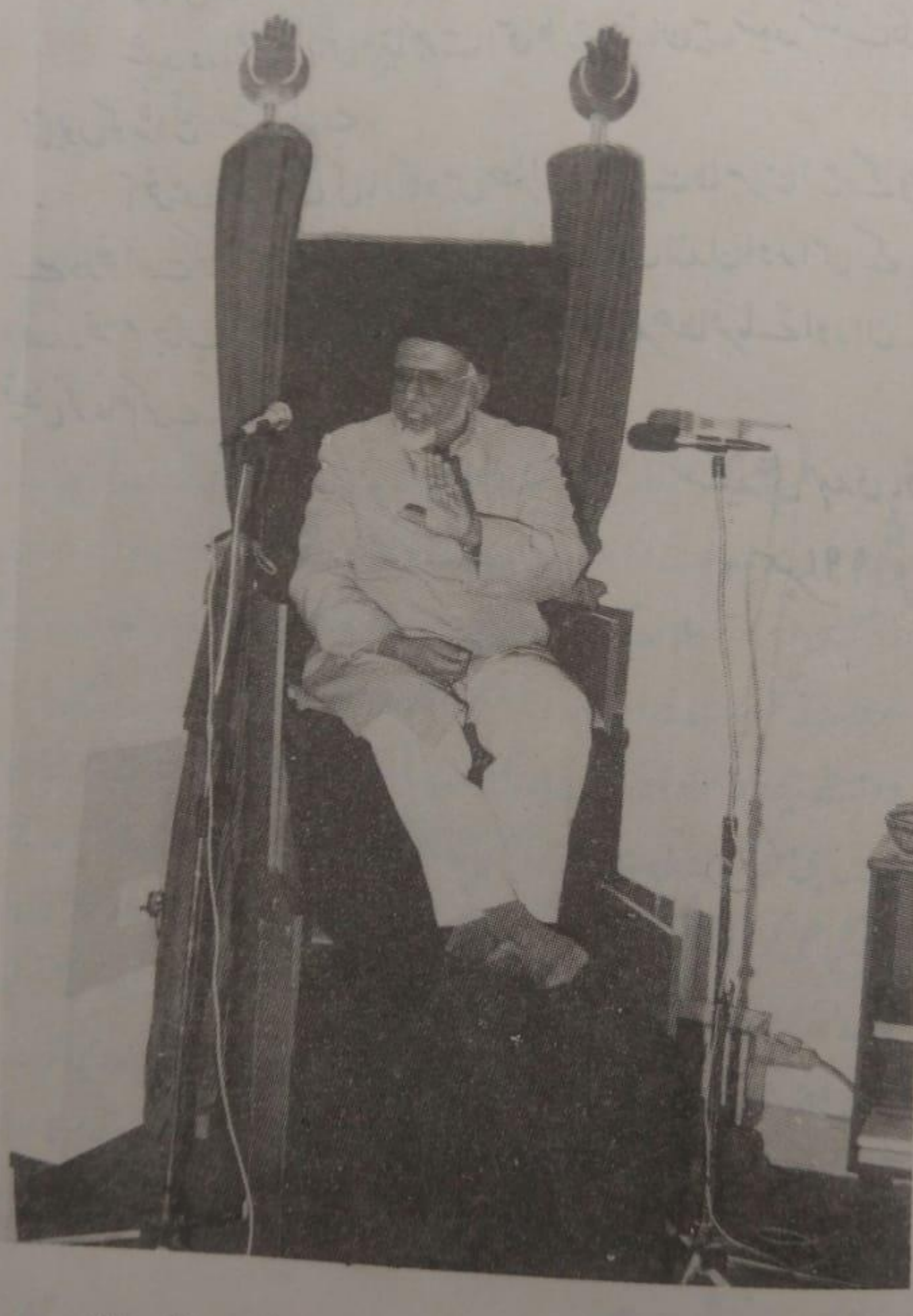
جناب مُلّا اصغر صاحب مدظلہٗ کی خواہش ہے کہ افراد بشر علوم آلِ محمدؐ سے زیادہ سے زیادہ آشنا ہوں اس لئے ان کا حکم ہے کہ دنیا بھر کی زبانوں میں ایسی کتابیں شائع ہوتی رہیں کہ جن کے مطالعہ سے لوگ آلِ محمدؐ کی معرفت حاصل کریں۔ اور اُن کی

ذات میں حق کی حمایت کا جذبہ بیدار ہو۔

خدمتِ خلق کی مثال ہیں۔ ملا صاحب کی کوشش ہوتی ہے کہ ہر بیمار آدمی کو علاج معالجہ کی سہولتیں فراہم ہوں۔ شیعہ ہوں یا سُنّی۔ ہندو ہو یا مسلمان۔ یہودی ہو یا عیسائی۔ مگر انسان ہو تو ملاّ صاحب اس کے علاج کی سبیل کرتے ہیں۔ وہ دنیا بھر میں اسپتال قائم کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ خانۂ خدا کے حجّاج کی ناگہانی بیماری سے حفاظت کے لئے ماہر ڈاکٹروں کی برجستہ ٹیم کو موسمِ حج میں مکہ معظّمہ کے لئے روانہ کرتے ہیں۔ غریب نادار اور مستحق سادات طالب علموں کی سرپرستی فرماتے ہیں۔ ملاّ صاحب کی ہستی مکارم اخلاق کی ہر صفت اور فضیلت سے آراستہ ہے اور وہ فضیلتِ انسانی کے ہر میدان میں فارس اور شہسوار ہیں۔

وہ ایک سچّے مسُلمان۔ دیندار، متّقی، پرہیزگار صاحب زہدُ و ورع، تقویٰ اور فضیلت ہیں۔ وہ ایک برجستہ انسان اور نمونۂ اخلاقِ حسنہ ہیں۔ انکسار و تواضع میں وہ بے مثال ہیں۔ وہ ایک ذمّہ دار، دل سوز مہربان، مخلص، اندیشمند اور دُور اندیش رہبر ہیں۔ وہ ہمیشہ افرادِ بشر کی نجات اور سعادت کی فکر میں رہتے ہیں۔ وہ دن رات میں ۱۸ گھنٹے خدا کے لئے کام کرتے ہیں۔ وہ ایک باعمل برجستہ عالِم دین ہیں۔ مرجع نہ سہی مگر مرجعیت کے تعیّن میں ان کا مشورہ اوّلیت کا حامل ہوتا ہے۔ وہ تمام مراجعوں کی طرف سے تنہا نمائندۂ جہانی ہیں۔ جناب مُلاّ اصغر صاحب مدظلہٗ نے ایک بین الاقوامی ادارہ "شیعہ ورلڈ فیڈریشن" قائم کیا ہے۔ اس ادارہ کے مقاصد میں افرادِ بشر اور مسلمان بالخصوص شیعہ حضرات کی سعادت و خوشحالی کی خوابوں کی تعبیر مضمر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ ہمارے رہبر کو طولِ عمر، صحت و سلامتی اور توفیق عطا فرمائے! اور آنجناب کے دینی اور دنیوی مقاصد میں کامیاب قرار دے۔

اِس دُنیا میں لوگ قدم رکھتے ہیں زندہ رہے اور چل بسے۔ وہ یہاں سوچنے سمجھنے



حضرت مستطاب جناب علامہ الحاج آقای آقا اصغر علی ملا اصغر مدظلہ
بانی و موسس اور صدر شیعہ ورلڈ فیڈریشن آف لندن

انتساب

یہ ۲۲ نومبر ۱۹۷۷ء کی گرم رات تھی۔ میں ممباسہ (کینیا) کے ایک مسافر خانے میں ٹھہرا ہوا تھا وہاں ایک شیعی کتب خانہ سے "شبہائے پشاور"[1] نام کی ایک کتاب میرے ہاتھ لگی۔ میں نے اسے پڑھنا شروع کیا۔ دورانِ مطالعہ جب اس مقام پر پہونچا جہاں دشمنانِ خاندان رسالت کی طرف سے سیدہ فاطمہ سلام اللہ کے ساتھ بدسلوکی اور گستاخانہ رویہ کے شرمناک مظاہرے کا تذکرہ کیا گیا تھا تو طبیعت پر غم و اندوہ کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ میں زار و قطار رونے لگا۔ شدتِ غم والم میں میں نے اس بے مروت ٹولے اور اس کے سرغنہ پر پہلی بار لعن و تبرا بھیجا اسی مبارک و مسعود رات کے آخری حصے میں میں نے خواب دیکھا کہ میں حضرت عباسؑ کے روضۂ اطہر پر حاضر ہوں اور گریہ و بکا کی ایسی حالت میں ہوں کہ اس سے قبل کبھی اس طرح ٹوٹ کر نہیں رویا تھا۔ اس حسین خواب کو اذانِ صبح گاہی کی آواز نے منقطع کیا اور میں بیداری کے بعد بھی دیر تک حیرت و سرگشتگی کے عالم میں خواب کے اس منظر سے محظوظ ہوتا رہا۔ حضرت عباسؑ علمدار کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ شہدائے کربلا کے ضمن میں ان کا نام سنی حلقوں میں غیر معروف ہے اور چونکہ شعور و آگہی کا ایک طویل

---

[1] اس کتاب کا اردو ترجمہ خورشید خاور مکتبہ اصلاح سے دو جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اب تک متعدد ایڈیشن چھپ کر ختم ہو چکے ہیں۔

عرصہ اسی حلقے میں گزرا تھا اس لیے حضرت عباس بن علی بن ابی طالب کی جلالت شان اور رفعت قدر کا مجھے ٹھیک ٹھیک اندازہ نہ تھا۔ ابھی شیعیت کی حلقہ بگوشی پر ایک سال بھی پورا نہ ہو پایا تھا۔ اس لیے رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ اس خواب کی تعبیر کیا ہوگی۔

لیکن ابھی اس خواب کے واقعہ پر چار ماہ کا عرصہ نہ گزرا تھا کہ توفیق الٰہی کی دستگیری نے مجھ بے سروسامان انسان کو کربلائے معلّٰی کی خاک بوسی کا شرف بخشا۔ سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کے آستانہ شہادت پر آنسوؤں کا پورا ذخیرہ نذر کرکے جب حضرت عباس علمدار کے آستانہ عالیہ کی جانب روانہ ہوا تو طبیعت پر رقت و گداز کی ادنیٰ سی کیفیت بھی نہیں تھی۔ طبیعت بالکل سپاٹ اور ہر قسم کے ارتعاش سے اک دم خالی ہو چکی تھی۔ اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ خواب میں حضرت عباسؑ کے مزار مقدس پر گریہ و بکا کا جو منظر آنکھوں نے دیکھا تھا کہیں وہ تشنہ تعبیر نہ رہ جائے۔ پھر خیال آیا کہ امام حسین علیہ السلام کے آستانہ قدس پر رونا اور حضرت عباسؑ کی بارگاہ میں آنسو بہانا ایک ہی بات ہے ؏

فعاعنی فھذا اکلہ قبر مالک

بہر حال سوچ کے ایسے تانے بانے بنتا ہوا صحن مقبرہ حضرت ابوالفضل العباسؑ میں داخل ہوا۔ کچھ دیر وہاں رک کر طبیعت کو گریہ و بکا پر آمادہ کرتا رہا۔ کبھی کربلا کی جنگ کا نقشہ ذہن میں لاتا کبھی شہدائے کربلا کی پیاس کا تصور باندھتا کبھی اہلبیتؑ کی مظلومیت کے واقعات ایک ایک کرکے ذہن کے سراپردوں پر ابھرتے کبھی "ھل من ناصر ینصرنا" کی رقت انگیز صدا سماعت سے ٹکراتی، مگر گھٹا برس چکی تھی اور مطلع صاف ہو چکا تھا اسی اضطراب و پریشانی کے عالم میں رکتا اور جھجکتا ہوا حجرہ ضریح تک پہونچ گیا اجازت کے کلمات دہراتا اور اذن باریابی کی اُمید کرتا جب اندر داخل ہوا تو ہو بہو خواب کا منظر آنکھوں کے سامنے تھا اور اب جو

آنسوؤں کا بند ٹوٹا ہے تو میں بچوں کی طرح بلبلا بلبلا کر رونے لگا اور اتنا رویا کہ آج تک آہ وزاری کی اس کیفیت پر رشک محسوس کرتا ہوں۔ ع

الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے

سو میں اس کتاب کو خواب کے اس حیران کن واقعہ کی یاد میں قمر بنی ہاشم حضرت ابوالفضل العباس ع کی بارگاہ فضیلت مآب میں ایک حقیر نذرانے کے طور پر پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں اور ان کی، ان کے والد گرامی اور ان کے برادران ذی جاہ کی نظرِ کرم کا خواستگار ہوں۔

آنانکہ آب را گہر پر بہا کنند آنانکہ باورانفس جاں فزا کنند
آنانکہ نار را بہ نور و ضیا کنند آنانکہ خاک بہ نظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشہ چشمے بہ ما کنند

مؤلف

مقدمہ

شیعیت ایک مطالعہ ایک تجربہ

حرفِ آغاز ایک ایسے پُرآشوب اور فتنہ پرور دور میں جبکہ خارجیت پہلے سے کہیں زیادہ قوت کے ساتھ سر اُٹھا رہی ہے۔ شیعہ حلقوں میں "وحدت" کی ہوائیں چل رہی ہیں اور رواداری برتنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ پسپائی اور خودسپردگی کا یہ انداز سنی شیعہ روابط میں تلخی کو کم کرسکتا ہے۔ نہ اس سے شیعہ مسلک ہی کو کسی نوع کا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ قرآن مقدس نے بہت پہلے رواداری کے اس فریب کا پردہ چاک کیا تھا۔

"ولن ترضی عنك الیهود ولا النصاری حتی تتبع ملتهم قل ان هدی الله هو الهدی" یہود و نصاریٰ آپ سے اس وقت تک خوش نہیں ہوسکتے جب تک آپ ان کے ملک و ملت کو اختیار نہ کریں۔ آپ کہہ دیجئے راہِ راست تو صرف ہدایت خداوندی ہی کے ذریعے ممکن ہے۔"

حق و باطل کی کشمکش میں اپنی بات کھل کر نہ کہنا ایمان کی جان کنی ہے وقت کا تقاضا ہے کہ حق بات ڈنکے کی چوٹ کی جائے اور جسم و جان پر گزرنے والی آفتوں کی پروا نہ کی جائے۔

اس وقت سُنّی حلقوں کی جانب سے رد و ابطال شیعیت پر جتنی کتابیں

لچھپ رہی ہیں ان کا انداز نہایت جارحانہ ہے۔ میں نے اس کتاب میں یہی انداز اپنایا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ نہ شیعہ اس سے خوش ہوں گے نہ سُنّی۔ اگر کسی کو یہ رائے دم زدن ہے تو آئے اور اس کتاب کے مندرجات پر حرف گیری کرے۔

بل نقذف بالحق علی الباطل فید مغہ فاذا ھو زاھق ولکم الویل مما تصفون۔

شہید سید شاہد زعیم فاطمی رضوان اللہ تعالیٰ
۱۲ر دسمبر سنہ ۱۹۷۹ء

مقدمۂ اوّل

دیباچہ قرطاس ابیض

دنیا جہان کا دستور ہے کہ جب کبھی کوئی حکمران ظلم و تعدی کا بازار گرم کرتا ہے اور اپنی ہی رعایا کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے لگتا ہے تو اس کی بساطِ اقتدار کے الٹ دیے جانے کے بعد ایسے ظالم حکمراں کی چیرہ دستیوں اس کے کرتوتوں اور اس کی بدعنوانیوں پر قرطاس ابیض (WHITE PAPER) شائع کیا جاتا ہے اور اس میں دستاویزی ثبوت کے ساتھ دنیا پر واضح کیا جاتا ہے کہ پیش رو حکمراں کس قدر گھناؤنے کردار کا حامل تھا۔

خلافت راشدہ جس کا آج دنیا میں ڈنکا بجایا جا رہا ہے۔ اپنی سفا کی اور ظلم و جبر کی بھیانک واردات کے اعتبار سے ایک ایسا دورِ حکومت اور عہدِ ستم رانی ہے کہ اس پر بھی ایک قرطاس ابیض شائع کرنے کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ یہ خلافت راشدہ جس نے اپنے تین خلیفوں کے زمانہ اقتدار میں اپنوں پر بھی شب خون مارے اور بیگانوں پر بھی تگ و تاز کی اس کا کچا چٹھا بیان کرنے کے لیے بھی ایک طویل دفتر درکار ہے۔

زیر نظر کتاب "پردہ اٹھتا ہے" تو اس قرطاس ابیض کی ایک ابتدائی جھلک ہے۔ اس (WHITE PAPER) کا اسے دیباچہ کہہ لیجیے۔ خلفائے ثلاثہ کی داستان جبر و تشدد کے لیے ایک الگ اور مستقبل کتاب "خلافت راشدہ اور اس کا نظام حکومت" کے عنوان سے معرض تحریر میں ہے جو اس موضوع پر حرف آخر ہوگی اور تب دنیا کو پتہ چلے گا کہ جس نظام حکومت کو خلافت راشدہ کے پرفریب نام سے تعبیر کیا جا رہا ہے وہ انسانیت کی تذلیل کا ایک ایسا سیاہ دور تھا کہ اس کی خوں ریزیوں اور سفاکیوں کے سامنے چنگیز و ہلاکو کی داستانیں اور روایتیں دم توڑتی نظر آتی ہیں۔

پیغمبر امن و انسانیت محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقدس مشن کو اس عہد زبوں کار میں جس طرح پامال کیا گیا وہ تاریخ کا سیاہ ورق ہے۔ اور اسے نہ تو جھوٹے پروپیگنڈے سے نہ خود ساختہ جعلی اور وضعی روایتوں جھوٹی تاویلوں کے بل پر جھٹلایا جا سکتا ہے۔ اس کی سیاہ روئی میں کوئی کمی کی جا سکتی ہے۔ یہ ایک شرمناک باب ہے کہ اگر کسی دوسری قوم کی تاریخ میں اس قسم کا باب شامل ہوتا تو وہ شاید اجتماعی خودکشی کے ذریعے اپنے دامن کے ان داغوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتی مگر کیا حوصلہ ہے مسلمان قوم کا کہ وہ دامن کے ان بدنما داغوں پر زندہ باد کے نعرہ لگاتی اور خوشی کے مارے پھولی نہیں سماتی۔ کسی شخص کی بد طینتی اور اس کے خبث باطن کے لیے یہی بات کیا کم ہے کہ وہ احسان فراموشی کا مرتکب ہو۔ ساری دنیا کی نگاہ پر ایک احسان فراموش انسان سے بڑھ کر کم ظرف اور فرومایہ انسان اور کوئی نہیں ہوتا اور کسی بھی مہذب معاشرہ

ہیں ایسے شخص کی اوقات دو ٹکے کی بھی نہیں ہوتی لیکن آپ دیکھیں کہ پیغمبرؐ کی جوتیوں کے صدقہ میں مسند اقتدار پر قابض ہونے والے لوگوں نے خود پیغمبرؐ کے خاندان سے کیا سلوک روا رکھا۔ کس طرح پیغمبرؐ کی اکلوتی بیٹیؑ کا حق غصب کیا کس طرح پیغمبرؐ کے نامزد کردہ جانشینؑ سے بدسلوکی کی کس طرح خانوادۂ نبوت کو اقتصادی مار مارنے کی ناپاک کوشش کی کس طرح ایک بدنہاد انسان لکڑیاں لے کر پیغمبرؐ کی لخت جگر کے مکان کو آگ لگانے پہونچا اور کس طرح اس نے اس موقع پر دہ اودھم مچایا کہ غنڈے اور بدمعاش بھی اس قسم کی ذلیل حرکتوں کا تصوّر نہیں کر سکتے لیکن باایں ہمہ آج وہی بدقماش لوگ مسلمان قوم کے ہیرو ہیں اور لوگ ان کے نام پر بغلیں بجاتے اور نعرے لگاتے ہیں۔

ڈرو غضب سے خدا کے تو ایک بات بھی ہے
نبیؐ کی غصّہ میں ڈوبی ہوئی نگہ سے ڈرو

اور اس طرزِ حکمرانی پر داد کے ڈونگرے برسانے والے کون ہیں وہ جو پیغمبرؐ کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ اُس پر اور اُس کی آلؑ پر درود بھیجتے ہیں اور اس پیغمبرؐ کا نام نامی سن کر انگوٹھے چومتے ہیں لیکن انھیں کبھی یہ سوچنے کی توفیق نہیں ہوتی اگر ان کی اولاد سے کوئی ان کا نام نہاد دوست ایسی بدسلوکی کرے تو ایسے شخص کے بارے میں ان کا ردّ عمل کیا ہوگا۔

کیا محمدؐ عربی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کی وہ قدر و منزلت بھی نہیں جو خود ہماری اولاد کی ہماری نگاہ میں ہے کیا اسی کا نام محبت ہے۔

ابوبکر نے عمر نے عثمان نے عبدالرحمٰن بن عوف نے طلحہ نے اور زبیر نے خالد بن ولید نے اور ابوہریرہ نے عبیدہ ابن جراح نے اور عمروؑ بن عاص نے جو بدمعاملگی

دھاندلی، دھونس اور بے مروتی کی کیا اس کے بعد بھی ان لوگوں کی شان میں قصیدہ خوانی کا کوئی جواز باقی رہ جاتا ہے۔

کیا وفاداری کا مرکز و محور پیغمبرؐ کی ذات ہے یا کوئی اور۔

بس اس ایک بات پر سارے قضیہ کا فیصلہ ہوا چاہتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ دل میں انصاف بھی ہو اور ایمان بھی۔

شاہد زعیم فاطمی

اپنی پہلی کتاب "سیدنا علیؑ ابن ابی طالب اور ان کے سیاسی حریف" کے پیش لفظ میں میں نے لکھا تھا۔

" اپنی تمامتر روسیاہیوں کے باوصف اور اپنے گناہ گار ہونے کے اعتراف کے باوجود ایک راسخ العقیدہ مسلمان، ایک محب اہل بیتؑ نبوت نیز خانوادۂ بنو ہاشم کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے مجھ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ میں ان بیہودہ الزامات اور بے سروپا اتہامات کی تردید کے لیے جو چند بد نہاد لوگ سیدنا علیؑ ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ، اور ان کی اولاد امجاد کی جانب منسوب کرتے ہیں۔ اپنے قلم کو حرکت میں لاؤں

ایک عرصہ تک میں اس بیہودگی کے مظاہر کا بچشم خود مطالعہ کرتا رہا جو نام نہاد اہل سنت کی بعض ذمہ دار شخصیتوں کی جانب سے سرزد ہوتے رہے۔ لیکن تابکے ؟ اب جبکہ ان " احبار سوء " کے ساتھ ساتھ عامتہ الناس میں بھی ایسے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جو بد طینتی کے اس ناپاک کھیل کو سر عام کھیلنے لگے ہیں اور تحقیق و تاریخ کے نام پر توہین اہل بیتؑ کا مذموم سلسلہ

چل نکلا ہے تو بادل نا خواستہ، کلوخ انداز را پاداش سنگ است" کے مصداق ضرورت محسوس ہوئی کہ ان چہروں سے نقاب سرکایا جائے جنھیں اگر غور کی نگاہ سے دیکھا جائے تو پتہ چلے کہ

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

اس کے بعد "پردہ اٹھتا ہے" کے عنوان سے ایک اور کتاب کی ترتیب بھی ہمارے پیش نظر ہے جس میں ہم اہل سنت کی بعض نامور شخصیتوں اور اس گروہ کی کچھ ایسی نمایاں ہستیوں کے رُخ کردار سے پردہ اٹھائیں گے جن کو آج تک عصمت انبیاء کا سا تقدس حاصل رہا ہے اور تب پتہ چلے گا کہ اہل سُنّت جہاں کھڑے ہیں وہاں ان کے پاؤں کے نیچے زمین نہیں ہے۔

انا صحرۃ الوادی اذا مازوحمت
واذا نطقت فاننی الجوزاء

آج اس کتاب کی صورت میں میں اپنی اس ذمّہ داری کو پورا کر رہا ہوں جو خدا و خلق کی جانب سے مجھ پر عاید ہوتی ہے۔

علیؑ ابن ابی طالبؑ اور انکے سیاسی حریف

علیؑ بن ابی طالبؑ اور ان کے سیاسی حریف" کتاب پر حکومت نے پابندی عاید کردی اور ڈیفنس آف پاکستان رولز" کے تحت اسکی اشاعت روک دی گئی گویا اب ماضی کی تاریخ کا تذکرہ بھی ناقابل برداشت ہوگیا ہے۔

اپنی تاریخ پر وہی قوم پابندی عاید کرنے کا سوچتی ہے جسے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کا ماضی شرمناک ہے اور اقوام عالم کی صف میں اس کا کردار جگ ہنسائی کا موجب بنا ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ مسلمان قوم کی تاریخ ناسپاسی، ناشکرگزاری، احسان فراموشی اور بے مروتی کی داستانوں سے بھری پڑی ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تاریخ نسل انسانی میں کسی بدترین سے بدترین قوم کا کردار ایسا گھناونا نہیں، جیسا کہ مسلمان قوم کا رہا ہے۔

خلافت کے لیے پیغمبر علیہ السلام کی دلی خواہش کو یکسر نظر انداز کردیا۔ پہلے اور دوسرے خلیفہ کے عہد اقتدار میں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے بدترین حریف قبیلہ کو برسرِ اقتدار لانے کی خفیہ اور منظم سازش کرنا اور تیسرے خلیفہ کے اپنے خاندان کے نااہل اور قابلِ نفرت افراد کو کلیدی عہدوں پر فائز کرنا اس قوم کے بعض ایسے کارنامے ہیں جن پر تاریخ کا ماتم آج بھی جاری ہے۔

خاندانِ نبوتؐ کے ساتھ سرد مہری کا سلوک، حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی اکلوتی اور چہیتی بیٹیؑ کے ساتھ بے مروتی کا برتاؤ فیض یافتگان صحبتِ نبویؐ کی باہمی چپقلش اور ان کا قبائلی عصبیت کا مظاہرہ ایسے کارنامے نہیں ہیں کہ ان پر کوئی قوم فخر کر سکے۔ ہاں فرق صرف اتنا ہے کہ دوسری قوموں پر بدبختی کی یہ آفت پانچ سات نسلوں کے بعد آئی لیکن مسلمانوں کو یہ شرف حاصل ہے کہ ان کی بدبختی کا آغاز ان کے پیغمبرؐ کی آنکھیں بند ہوتے ہی ہو گیا۔ دوسری قوموں نے جس سفر کا آغاز صدیوں بعد کیا مسلمانوں نے پہلے ہی دن اس راہ پر چلنا شروع کر دیا۔

"علیؑ ابن ابی طالبؑ اور ان کے سیاسی حریف" کتاب کیا شائع ہوئی "اہلِ سنت والجماعت" کے ایوان یزیدیت میں زلزلہ آ گیا اس گروہ کے لوگ انگاروں پہ لوٹ رہے ہیں ان کے ہاں صف ماتم بچھی ہوئی ہے اور گویا ایک حشر برپا ہے کچھ لوگ تو اس بات پر تلملا رہے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والا شخص جس کے ددھیال اور ننھیال میں دور دور تک شیعیت کا سراغ نہیں ملتا۔ اس نے براہ راست شیعی مکتب فکر کی حمایت کا ناقابل معافی جرم کیسے کیا اور کیوں کیا؟

بلاشبہ ماحول اور خاندانی اثرات کا انسان کے عقائد و اعمال پر گہرا اور دیرپا اثر قائم ہوتا ہے اور اگر توفیق الٰہی کی دست گیری شاملِ

حال نہ ہو تو انسان اس "تقلید اعمیٰ" سے کبھی چھٹکارا نہیں پا سکتا اور خاندانی عقاید و نظریات کی بھول بھلیوں سے باہر نہیں نکل سکتا۔

لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک معمولی سا واقعہ انقلاب حال کی تمہید بن جاتا ہے اور صدیوں کی مذہبی اور خاندانی روایتوں میں جکڑا ہوا انسان دفعتًہ ان زنجیروں کو کاٹ پھینکتا ہے۔

"موسیو لیبان" مشہور فرانسیسی دانشور کی کتاب "روح الاجتماع" میں آج سے تیس برس قبل جب یہ پڑھا تھا کہ "کسی خاص جماعت سے وابستگی کے دور میں انسان اپنے ذہن اور اپنے دماغ سے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے"، تو اس وقت اس کا صحیح مفہوم سمجھنے میں مشکل پیش آئی تھی لیکن جب "اہل سنت والجماعت" کی گروہی عصبیت سے بالاتر ہو کر تاریخ کا جائزہ لیا تو آنکھوں کے سامنے سے دھند چھٹتی ہوئی محسوس ہوئی اور پہلی بار اندازہ ہوا کہ اجتماعی نفسیات کے تحت عقل و شعور پر جو دبیز پردے پڑ جاتے ہیں ان پردوں کو اٹھانے کی ایک ہی صورت ہے کہ انسان دوسروں کے ذہنوں اور دماغوں سے کام لینے کی بجائے خود اپنے دل و دماغ سے کام لے اور حقائق کے ادراک میں خدائے دانا و بینا کی عطا کردہ علم و دانش کی روشنی سے استفادہ کرے اور خبیث و طیب میں خود امتیاز پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

میری محولہ بالا کتاب دراصل حقائق تک رسائی کی ایک ابتدائی کوشش تھی۔ یہ کتاب تحقیق و تلاش و جستجو کا کوئی ایسا قابل ذکر کارنامہ نہیں تھا کہ "دشمن ایمان و آگہی" گروہ اس پر یوں ..... سیخ پا ہوتا اس لیے کہ میں نے اسے ایک کتاب کی بجائے ایک سرسری احتجاجی مضمون کی صورت میں لکھا تھا اور موضوعِ بحث تھا

"یوم معاویہ" پر اظہار ناپسندیدگی.

اگر اس کتاب کو علم و تحقیق کے انداز میں لکھنا مقصود ہوتا تو اس میں فکر و نظر کے دوسرے بہت سے مباحث بھی معرض تحریر میں آتے اور ایسا بشیتر علمی اور تاریخی مواد بھی اس میں شامل ہوتا جس سے امیر المومنین سیدنا علی علیہ السلام کی قرار واقعی عظمت کو تحسین کا خراج شایان شان طریق پر پیش کیا جاتا۔

لیکن اس سرسری مضمون پر اہل سنت والجماعت کے حلقوں میں جو شدید ردعمل رونما ہوا اس نے جہاں اس فرقہ کی علمی بے بضاعتی اور تحقیقی بے مائیگی کا پردہ فاش کیا وہاں اس تلخ حقیقت کا بھی اندازہ ہوا کہ اپنی اکثریت کا ڈھنڈورہ پیٹنے والا یہ فرقہ اپنی بھاری اکثریت کے باوجود اقلیتی فرقہ کے ایک عام سے احتجاجی نعرہ کا مقابلہ کرنے کی بھی تاب نہیں لاسکتا. اور اس میں حقائق کا سامنا کرنے کی نہ جرأت ہے نہ ہمت، وہ استدلال کے میدان میں کھڑا ہونے کی اہلیت سے یکسر محروم ہے اس کتاب کی اشاعت سے یہ انکشاف بھی ہوا کہ اہل سنت خود اپنی کتابوں کے مندرجات سے بھی پوری طرح آگاہ نہیں ہیں اور اگر ان کے سامنے صرف انہی کے مسلمہ و متفقہ کتابوں کا وہ رخ پیش کیا جائے جو اس فرقہ کی ممدوح شخصیتوں کے کردار اور چال چلن سے متعلق ہے تو یقین ہے کہ وہ ان شخصیتوں کے بتوں کو خود اپنے ہاتھوں توڑ دینے میں کوئی تامل نہیں کریں گے واقعہ یہ ہے کہ ان بے چاروں کو علم ہی نہیں ہے کہ انھوں نے جن لوگوں کو اپنے نہاں خانۂ دل میں سجا کر رکھا ہے کہ وہ کس قماش کے لوگ اور کس کردار کے انسان تھے۔ انھوں نے محض سنی سنائی باتوں کو جو ان کے "احبار سوء" اور رہبانان بد نے طوطے کی طرح رٹ رکھے ہیں عقائد کی صورت میں

قبول کر رکھا ہے اور اپنی بے سروپا باتوں کو وہ قرآن وحدیث سے زیادہ اہمیت دیتے رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان لوگوں کے سامنے صحیح واقعات رکھے جائیں اور انہیں ان کے خاندانی پس منظر میں ساری صورت حال سے آگاہ کیا جائے تو شاید ہی کوئی انصاف پسند اور معقول شخص ہوگا جو جائز حق داروں اور غاصبوں کے درمیان واضح فرق محسوس کیے بغیر رہ جائے

اس سلسلے میں خود اپنی مثال پیش کرتا ہوں کچھ عرصہ پہلے تک میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ خلفائے ثلاثہ ابو بکر و عثمان و عمر کے بارے میں کوئی ایسی بات بھی کہی جا سکتی ہے جو تنقید و جرح کا پہلو لیے ہوئے ہو لیکن جب اہل سنت ہی کی کتابوں کے بے لاگ مطالعہ کا اتفاق ہوا تو عقل و دماغ پر پڑے ہوئے سارے پردے ایک ایک کر کے اٹھ گئے اور تب نظر آیا کہ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

خاندانی بندشوں سے بڑھ کر خرافات کا وہ طومار انسان کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے جسے ایک خاص منصوبہ کے تحت دور بنی امیہ و بنی عباس کے خود فروش اور بے ضمیر راویان حدیث اور فقہ نے مرتب کیا ہے۔

خرافات کے اس انبار میں اس حدیث کا بڑا چرچا ہے جو سراسر موضوع اور بے اصل ہے اور مشہور خارجی مصنف ابن تیمیہ تک نے اسے "من گھڑت" تسلیم کیا ہے[۱]۔ لیکن سنی علما جانتے بوجھتے ہوئے کہ یہ حدیث وضعی اور جعلی ہے

---

[۱] یہ حدیث بے بنیاد ہے (کتاب المنتقیٰ ابن تیمیہ ص۵۵۱) اس روایت کے وضعی اور جعلی ہونے کے باوجود تم ہر چھوٹے بڑے سنی اور متقین عظمت صحابہ کی اساس اسی جھوٹی روایت پر قائم کیے ہوئے مگر جوں کے توں قائم ہو۔

اسے بطور اسناد نہ صرف پیش کرتے ہیں بلکہ اسے اپنے عقائد و اعمال کی اس کو اساس بھی قرار دیتے ہیں۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

اصحابی کالنجوم. بایہم اقتدیتم اھتدیتم

میرے صحابہ ستارہ ہائے شب کی مانند ہیں تم ان میں سے جس کسی کا اقتدا کروگے ہدایت یافتہ ہو جاؤگے۔

جعلی، وضعی اور من گھڑت حدیثوں پر جس مذہب کا دار و مدار ہو اور جن کے بڑوں نے پہلے پہل ایک جھوٹی حدیث وضع کر کے پیغمبرؐ کی آل کو اس کے آبائی ورثہ سے محروم کر دینے کی جسارت کی ہو وہ شرف و فضیلت صحابہ پر ایک نہیں بیسیوں حدیثیں گھڑ سکتے ہیں اور انھوں نے اس میں کوئی کمی نہیں کی۔

قرآن مقدس نے حضور ختمی مرتبت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "سراج منیر" یعنی آفتاب ہدایت، قرار دیا ہے اس آفتاب رشد و ہدایت کی موجودگی میں شب اور ستارہ ہائے شب کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبین ہیں کہ اب ان کے بعد نہ کسی نبی کی ضرورت ہے نہ رسول کی اور وہ ایسی شریعت مقدسہ لے کر تشریف لائے جس کے بارے میں خود زبان نبوت و وحی نے یہ ارشاد فرمایا کہ...

بعثت بسمحتہ ابیضا لیلھا کنھارھا

میں ایک ایسی بے لاگ کشادہ اور روشن شریعت لے کر آیا ہوں جس کی رات بھی دن کی طرح اجلی ہے جب اس شریعت مطہرہ کے روز و شب اپنی تابانیوں کی رو سے یکساں ہیں تو ستاروں کی کیا تک ہے اور پھر تمام ستارگان شب رہ نمائی کے کام کہاں آتے ہیں، گنتی کے چند ستارے ہیں جن سے مسافران شب اکتساب ضیاء کرتے اور جن سے رہ نمائی حاصل کرتے ہیں ستاروں سے

سے کسب ہدایت کی ضرورت رات کی تاریکی میں ہوتی ہے دن کی روشنی اور سورج کی موجودگی میں ستاروں کا کیا کام مگر گھڑنے والوں نے اس قسم کی حدیثیں گھڑیں اور احمقوں نے انھیں آنکھیں بند کر کے تسلیم کیا۔

تمہید

میں نے جب اپنی پہلی کتاب "مولائے کائناتؑ اور ان کے سیاسی حریف" لکھی تو اس وقت تک شیعہ مکتب فکر کی کوئی کتاب میری نظر سے نہیں گزری تھی۔ میں صرف وہ کتابیں پڑھ کر بدمزہ ہوا تھا جو رسوائے زمانہ خارجی محمود احمد عباسی اور اس کی ذریت نے لکھیں اور جن میں خارجیت اور ناصبیت کا کھلم کھلا پرچار کیا گیا تھا۔ بہت سے   ہیں اور کم ظرف مولویوں پر ان کتابوں کا ردِ عمل یہ ہوا کہ ان کی گز گز بھر کی زبانیں شیعوں کے خلاف زہر اگلنے لگیں اور بھرے جلسوں میں سیدنا علیؑ کی شخصیت و کردار پر کھلم کھلا تنقید ہونے لگی جیسے وہ خلفاءِ راشدین کے زمرہ میں شامل ہی نہیں ہیں اور جیسے گروہِ صحابہ میں سے انھیں خارج کر دیا گیا ہو۔

میری پہلی کتاب خارجیت کے ابھرتے ہوئے فتنے کے خلاف میرے ردِ عمل کا بالکل سطحی اور ابتدائی مظاہرہ تھا کیوں کہ تاریخ اسلامی کے نشیب و فراز سے میں پوری طرح واقف نہیں تھا۔ اس وقت تک شیعیت کے بارے میں بھی میرے دِل میں کسی قسم کا نرم گوشہ نہیں تھا تاہم یہ عجیب معجزہ رونما ہوا کہ عباسی وغیرہ کی کتابیں پڑھ کر خاندان بنی امیّہ کے خلاف میرے جذبات میں یک لخت تنفّر اور تکدّر کی لہر پیدا ہوئی اور مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ نورِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اہلبیتِ نبوّت کے خلاف جو سازشیں بروئے کار لائی گئیں ان میں اس ملعون خاندان کا ہاتھ ضرور رہا خواہ فدک کے بارے میں ابوبکر کا غلط فیصلہ ہو، خواہ عمر ابن خطاب کا معاندانہ رویّہ ہو۔ خواہ عثمان

بن عفان کا متعصبانہ طرزِ عمل ہو۔ خواہ معاویہ کا اسلام دشمن کردار ہو۔

اسی دوران بالکل اتفاقی طور پر ایک اور واقعہ نے مجھے ہلا کر رکھ دیا اور میرے دل کی دنیا میں ایک عجیب انقلاب رونما ہوا۔ حرم گیٹ ملتان میں اخباروں کے ایک اسٹال سے میں کراچی کے اخبار جنگ اور حریت خریدنے کے لئے جب وہاں پہنچا تو اس مقام پر رستہ رکا ہوا تھا۔ یہ محرم کی دسویں تاریخ تھی یعنی یومِ عاشورا، اور استاد اور شاگرد کے تعزیوں کا جلوس اس جگہ ماتم کناں تھا۔

میرے لیے تعزیہ کے جلوس دیکھنے کا زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ اس لیے حیرت و استعجاب کے یک طرفہ احساس کے ساتھ ساتھ اس میں دلچسپی کا عنصر بھی شامل تھا۔

سینہ کوبی اور ماتم گساری کے اس ہنگامہ خیز ماحول میں اچانک میرے ذہن کے سراپردوں پر عربی ادب کی مشہور کتاب حماسہ کے یہ چار اشعار ابھرے۔ عربی ادب کی یہ نادرۂ روزگار کتاب برسوں سے میرے زیرِ مطالعہ و تدریس تھی اور اس کے سینکڑوں اشعار مجھے ازبر تھے۔ یہ چار شعر بھی مدتوں سے مجھے زبانی یاد تھے شاعر سلیمان بن قتتہ العدوی ہے جو امام حسین علیہ السلام کا معاصر ہے اور اس لیے اس کے اشعار میں دل گدازی اور غم گساری کی ایسی کیفیت پائی جاتی ہے کہ اس دن میرے لیے اپنے جذبات پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ میں ان شعروں کو بار بار دہرانے کی کوشش کرتا تھا مگر ہر بار پہلے مصرعہ پر ہی گلا آنسوؤں سے رُندھ جاتا تھا اور گریہ و بکا کا یہ عالم ہوا کہ ایک سُنی عالم اور ایک علمی خانوادے کا فرد ہونے کی حیثیت سے مجھے یہ اندیشہ محسوس ہوا کہ اگر کسی سُنی نے مجھے اس حالت میں دیکھ لیا تو میں لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔

اخبار خریدے بغیر جب میں واپس لوٹا اور بھیڑ بھاڑ سے بچتا بچاتا اپنے آنسوؤں بھرے چہرے کو رومال سے چھپاتا ملتان کی تنگ و تاریک گلیوں میں سے ہوتا ہوا اپنے مکان کی جانب جا رہا تھا تو یہ اشعار مسلسل میرا تعاقب کر رہے تھے اور آنسو تھے کہ

تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

خدائے قدوس جزاء خیر عطا فرمائے ان اشعار کے شاعر کو جس نے میرے برسوں کے خوابیدہ ضمیر کو جگانے میں اہم کردار ادا کیا۔ میری سعادت و خوش بختی کا یہ گویا روز آغاز تھا اور توفیق الٰہی کی یہ عجیب کرشمہ کاری تھی کہ ان اشعار کی بدولت ہی میں زندگی میں پہلی بار غم حسینؑ کی لذت سے آشنا ہوا۔

مررت علی ابیات آل محمد

فلم ارھا امثا لھا یوم حلت

فلا یبعد اللہ الدیار اھلھا

وان اصبحت عنھم برغمی تخلت

الاان قتلی الطف من آل ھاشم

اذلت رقاب المسلمین فذلت

وکانو اغیاثا ثم اضحوارزیہ

الا عظمت تلک الرزایا وجلت

۱۔ میرا گزر آلِ محمد (علیہم السلام) کے باوقار گھروں پر ہوا تو میں نے دیکھا کہ ان میں وہ پہلی سی چہل پہل باقی نہیں رہی۔

۲۔ اللہ نہ کرے کسی کا گھر ویران ہو اگرچہ خانوادۂ نبوت کے گھر تو میری آرزو کے برخلاف اجڑ گئے۔

۳۔ سن رکھو کہ میدان طف (کربلا) میں بنو ہاشم کے شہداء کے قتل سے مسلمان ہمیشہ کے لیے ذلیل ہوگئے اور ان کی گردنیں جُھک گئیں۔

۴۔ یہ لوگ کل تک دوسروں کے فریاد رس تھے آج خود ایک فریاد بن گئے ہیں۔ کیسا بڑا سانحہ اور کتنی دردناک مصیبت ہے۔

عاشور محرم کے اس حیران کن واقعہ کے فوراً ہی بعد ایک کباڑیے کی دوکان پر عربی کی ایک کتاب پڑی ہوئی ملی کتاب غیر مجلد تھی اور اوراق بوسیدہ کتاب کا نام تھا۔ "عبقریۃ الامام"، اور یہ مصر کے مشہور ادیب اور نامور مؤرخ عباس محمود العقاد کی تصنیف تھی بارہ آنے میں یہ کتاب خرید کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دولت کونین مل گئی ہوے

جمادے چند وادم جاں خریدم   بحمد اللہ بسے ارزاں خریدم

اس کتاب کے مطالعے سے میری سنیت کی ساری چولیں ڈھیلی ہوگئیں اور ذہن شیعیت کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوگیا۔ "عبقریۃ الامام" امیر المومنین سیدنا علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام کی سیرت طیبہ کا نقش جمیل ہے، اس میں مصنف نے جہاں سیدنا علی علیہ السلام کی شخصیت و کردار کا جائزہ لیا ہے۔ وہاں ان کے بعض حریفاں روسیاہ کی بدکرداریوں کا ذکر بھی ضمناً آگیا ہے۔ میں نے اس کتاب کو پڑھا تو دل کے تمام دریچے امیر المومنین علیہ السلام کے لیے وا ہوگئے۔ اور دل و دماغ ان کی عقیدت و محبت سے سرشار ہوگیا۔ مجھے اس کتاب کے مطالعہ سے پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ اسلامی تاریخ کی سب سے مظلوم شخصیت اگر کوئی ہے تو وہ صرف اور صرف امیر المومنین علی علیہ السلام کی ہے۔

یہ وہ حالات تھے جن میں میں نے پہلی کتاب لکھی۔ اس کتاب کی پذیرائی جو علمی حلقوں میں ہوئی اور جس طرح پڑھے لکھے لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اہلِ سنت میرے در پۓ آزار ہوگئے اور ڈیفنس آف پاکستان رولز کی دفعہ ۴۹ کے تحت جو ناقابلِ ضمانت تھی پولیس میرے پیچھے پڑگئی۔

بھٹو کا نمک حرام وزیر کوثر نیازی جو ان دنوں امور مذہبی کے محکمہ کا انچارج تھا اور جو اپنے عہدہ و منصب پر اپنی شاطرانہ بدفعلیوں کے سبب سنیوں سے زیادہ شیعوں

میں مقبول تھا اس نے اہلِ سنت کے بعض بدنام مولویوں کے ایماء پر اس کتاب پر پابندی عائد کرائی اور کتاب کے ناشر کو بطور خاص اپنی ترک تازیوں کا نشانہ بنایا۔ دارو گیر کے اس ہنگامے میں پولیس مجھے تو پکڑنے میں کامیاب نہ ہوسکی البتہ میرے دوستوں، عزیزوں اور قرابت داروں کی دکانوں پر، مکانوں پر، گھروں پر اور کاروباری اداروں پر "اشتہاری اور مفرور ملزم" کی تلاش کے پوسٹر چسپاں کیے گیے اور انہیں مختلف طریقوں سے ہراساں کیا جاتا رہا۔

میں نے یہ کتاب ہرگز اس نیت سے نہیں لکھی تھی کہ میں شیعہ ہونے جا رہا تھا۔ میرے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اب مجھے اہلِ سنت کے حلقوں سے دیس نکالا مل جائے گا اور مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جائے گا۔ لیکن قدرت کو یہی منظور تھا کہ سعادتِ ابدی میرا مقدر بنے سو بحمد اللہ اب میں پوری طرح مسلک شیعیت سے ذہناً اور قلباً وابستہ ہو چکا ہوں۔ تاہم میری اس کتاب کے خلاف سُنّی حلقوں میں جو طوفان اٹھا اس سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ اہلِ سنت کے ہاں دلیل اور معقولیت کا گزر نہیں اور ان میں اتنی استعداد بھی نہیں ہے کہ وہ ایک معمولی سی کتاب کا سامنا کر سکیں۔

میرا نسبی تعلق سادات کے ایسے خانوادۂ شرف و مجد سے ہے جو اَباً عن جدٍ مسند ارشاد و ہدایت پر فائز رہا اور جس میں بیعت و ارشاد کا سلسلہ صدیوں سے قائم ہے۔

میرے والد گرامی اور میرے نانا دونوں دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل عالم تھے اور چونکہ دیوبندی مسلک میں پیری مریدی کا وہ روایتی جوش و خروش موجود نہیں ہے جو اہلِ سنت کے دوسرے فرقوں میں متداول ہے اس لیے انہوں نے خاندانی روِش سے ہٹ کر زندگی بسر کی اور پیری مریدی کو اپنا پیشہ نہیں بنایا۔

شیعیت ہمارے خاندان میں شجرِ ممنوعہ رہی۔ اگر کبھی کسی رشتہ دار کے متعلق بطور افواہ بھی یہ خبر پھیلی کہ اس کا رجحان شیعیت کی جانب ہے تو خاندان بھر میں اس کا

حقہ پانی بند ہو جاتا ہے۔

میں نے جس ماحول میں شعور کی آنکھ کھولی اس میں دو گروہوں کے بارے میں جذبات کا تناؤ حد سے بڑھا ہوا تھا ایک قادیانیت اور دوسرے شیعیت اور میں ایک مدت تک ان دونوں فرقوں کو ایک ہی سطح پر رکھنے کا گنہگار رہا۔ میری تربیت کے بالکل ابتدائی دور میں مجھے جس فرقے سے سب سے زیادہ متنفر کیا گیا وہ یہی شیعہ فرقہ تھا جس کا میں آج خود ایک سرگرم اور پرجوش مبلغ ہوں۔

اسی دور کا ایک واقعہ میرے ذہن میں اب تک محفوظ ہے۔ ہوا یہ کہ میرے ننھیالی رشتہ داروں میں سے دور کے ایک بزرگ ہمارے یہاں فروکش ہوئے۔ ہمارے گھر میں آداب مہمان نوازی کی جس طرح رعایت محفوظ رکھی جاتی تھی اس کے برعکس ان صاحب کے لیے الگ برتنوں میں کھانا بھجوایا گیا۔ اور جب میں نے ازراہِ تعجب اس مختلف قسم کے سلوک کے بارے میں والدۂ محترمہ سے دریافت کیا تو انھوں نے بڑے حقارت کے لہجے میں مجھے بتایا کہ یہ شخص شیعہ ہو گیا ہے اور شیعہ چوں کہ نجس ہوتے ہیں اس لیے انہیں اپنے ساتھ بٹھا کر کھلانا یا ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا ٹھیک نہیں ہے۔ اس بدسلوکی کے جواز میں جو ایک شیعہ رشتہ دار کے ساتھ روا رکھی گئی یہ انکشاف بھی کیا گیا کہ اگر کوئی سنی کسی شیعہ کے یہاں مہمان جاتا ہے تو شیعہ میزبان اپنے سنی مہمان کے کھانے میں غلاظت یا تھوک کی آمیزش کر دیتے ہیں۔ اس لیے ان لوگوں سے پرہیز لازم ہے۔

بچپن میں تو میں نے اُسے امرِ واقعہ سمجھ کر تسلیم کر لیا مگر جب عقل و فہم سے کچھ بہرہ نصیب ہوا تو میں نے اسے محض "دشمن کا پروپیگنڈہ" سمجھ کر رد کر دیا لیکن میرے تعجب کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے مکتوبات شیخ الاسلام میں یہ عبارت پڑھی۔

"نہایت شہرت کو پہونچ چکا ہے کہ شیعہ اگر کسی سنی کو کھانا پانی دیتے ہیں تو اس میں نجاست ضرور ملا دیتے ہیں۔ اگر کوئی موقع نہیں ملتا تو تھوک

ضرور دیتے ہیں اس لیے حتی الوسع اس سے احتراز چاہیئے۔"

(ج ا ص ۳۰۱)

یہ ہے وہ انداز تحقیق اس بزرگ شخصیت کا جسے "عجم کا شیخ" کہا جاتا ہے یعنی مولانا حسین احمد مدنی سابق صدر نشین مسند تدریس دار العلوم دیوبند۔

یہ وہ ماحول تھا جس میں میری پرورش ہوئی اور اس قسم کے بہت سے گفتنی و ناگفتنی واقعات نے شیعوں کے خلاف میری شدت پسندی میں اضافہ کر دیا تھا۔ محرم کی سبیلیں، تعزیے، عزاداری کے دیگر مظاہرے، ماتم گساری کے مختلف روپ، ان سب کے بارے میں تنفر بڑھتا گیا اور شیعہ فرقے کے خلاف نفرت و تعصب کے جذبات تند و تیز ہوتے چلے گئے۔

تحریری صورت میں بھی یہ بات کہی جاتی رہی ہے لیکن اس وقت تک میری نظر سے نہیں گزری تھی۔ البتہ "سینہ گزٹ" کے طور پر یہ بات سنی حلقوں میں عام شہرت رکھتی تھی کہ:۔

"جو لوگ ماتم کی اس "رسم بد" میں شریک ہوتے ہیں اور غم حسینؑ میں اشک افشانی اور سینہ کوبی کا ڈھونگ رچاتے ہیں یہ وہی گروہ ہے جس نے سیدنا حسین علیہ السلام کو شہید کیا تھا اور اب اپنی اس حرکت پر پردہ ڈالنے اور لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے انھوں نے یہ دھندا اختیار کیا ہے۔

ایک اور بات جس نے شیعہ فرقے کے خلاف میری نفرت کو دوچند کیا وہ مردہ شخص کی بے حرمتی کا مسلسل پروپیگنڈہ تھا اور یہ بات زباں زد عام و خاص تھی کہ جب کوئی شیعہ مرجاتا ہے تو غسل میت کے موقع پر اس کے حصہ اسفل میں "گز" کیا جاتا ہے۔

لہ جب میں پہلے پہل جامع المنتظر کے شیعہ ماحول میں داخل ہوا تو یہ سوال رہ رہ کر

بہ الفاظ دیگر اس کی مقعد میں سلاخ پھیری جاتی ہے اور پھر اس غلاظت کو کھانے میں آمیزش کر کے امام حسین علیہ السلام کی نیاز دلائی جاتی ہے۔ باللہ

سوچتا تھا یا اللہ! یہ کیسے غلیظ لوگ ہیں۔ ان کے دین و مذہب کی بنیاد کیا ہے۔ ان کے عقیدہ عمل کی اساس کیا ہے اور یہ کون لوگ ہیں۔

یہ پروپیگنڈہ بھی زوروں پر تھا کہ شیعہ کے معنی ہی نجس اور ناپاک کے ہیں۔ اگرچہ

میرے حاشیۂ خیال میں آتا رہا مگر نئی جگہ نیا ماحول جامع المنتظر کے پرنسپل مولانا صفدر حسین نجفی سے اس "گز کرنے" کی روایت کی توثیق کا کئی بار ارادہ کیا مگر حجاب مانع رہا سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسے گندے اور شرمناک عمل کے بارے میں ان سے کیونکر سوال کروں اور یوں انھیں خفت اور ندامت میں مبتلا کروں۔ آخر ایک دن جی کڑا کر کے پوچھ ہی لیا کہ یہ گز کرنے کی بات کہاں تک مبنی بر حقیقت ہے۔ مولانا نے فرمایا سراسر لغو اور بالکل غلط بات ہے۔ اور شیعہ فرقہ پر بہت بڑا بہتان ہے انہوں نے کہا ہمارے فرقہ کی کتابیں موجود ہیں ائمہ مجتہدین کے لکھے ہوئے رسائل بکثرت دستیاب ہیں ایک امکان جزئی کی حد تک بھی ایسا کوئی جزئیہ ہمارے فرقہ اور مسائل و رسائل میں مذکور نہیں ہے۔

عام مسلمانوں کے جنازے اور شیعیان علیؑ کے جنازے میں صرف اتنا فرق ہے کہ ہم میت کی دونوں بغلوں میں دو سبز شاخیں جن کے پتے الگ کر دیئے گئے ہوں کفن کے اندر رکھ دیتے ہیں کیوں کہ حدیث میں آیا ہے کہ جب تک ٹہنیاں سبز رہتی ہیں ذکر و تسبیح میں مشغول رہتی ہیں اور اس کی برکت سے میت کے عذاب میں تخفیف کر دی جاتی ہے لیکن یہ عمل بھی درجۂ استحباب میں ہے وجوب کے درجے پر نہیں ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا۔

وہ بات اِن کو بہت ناگوار گزری ہے

میں عربی زبان سے واقف تھا اور لغت کی کسی کتاب میں شیعہ کے یہ معنی میری نظر سے نہیں گزرے تھے پھر بھی یہ خیال آتا تھا کہ عربی چوں کہ ایک وسیع زبان ہے اس لیے ممکن ہے یہ معنی بھی ہوں آخر ایسے معتبر لوگ کہتے ہیں تو جھوٹ تھوڑا ہی کہتے ہیں کچھ نہ کچھ حقیقت تو اس میں ضرور ہو گی۔

بچپن ہی سے عاشورہ محرم کی مجالس میں شرکت کی سخت ممانعت تھی اس لیے کچھ پتہ نہیں تھا کہ ان مجالس کے رنگ ڈھنگ کیا ہوتے ہیں اور ان مجالس میں کیا کہا اور کیا کیا جاتا ہے۔

یہ پروپیگنڈہ بھی زوروں پر تھا کہ آشور محرم کے ایام میں شیعہ لوگ کسی سُنی لڑکے کو اغوا کر کے اسے یزید کا بہروپ دے کر دسویں محرم کو قتل کر دیتے ہیں۔ اور یہ قتل اس اہتمام کے ساتھ عمل میں لایا جاتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام کے جسم اطہر پر جتنے زخم لگے تھے یزید کے بہروپ کو بھی اتنے ہی زخموں سے ڈھیر کیا جاتا ہے۔

اس لیے دل میں یہ خوف بھی جاگزیں تھا کہ کہیں قرعۂ فال ہمارے ہی نام نہ نکل آئے یوں بھی ایک مذہبی گھرانے سے نسبت قرابت کی بناء پر ہمیں اپنے ذبح ہونے کے امکانات زیادہ نظر آتے تھے اس لیے ان مجالس سے دور ہی رہے ایک اور بات جس کا بڑا چرچا تھا عاشور محرّم کی رات یعنی شامِ غریباں کے سوگوار موقعہ پر مرد و زن کے بے محابا اختلاط کی روایت تھی کہ اس رات کے اندھیرے میں جو عورت جس مرد کے ہتھے چڑھ جائے وہ اسے بلا تکلف مصرف میں لے آتا ہے اور اس مباشرت کے نتیجے میں جو حمل قرار پاتا ہے اگر مولود لڑکا ہو تو مجتہد کی دستار فضیلت اس کے سر پر بندھتی ہے۔

جگر نگاری ماتم گساری، غم و اندوہ، کی چاک و امانی اور رنج و الم کی سینہ چاکی پر اس سے زیادہ ظالمانہ خندۂ استہزا اور کیا ہو سکتا ہے۔

سُنّی مدارس کے نو دس سالہ نصاب تعلیم میں مسلک تشیعیت یا فقہ جعفریہ کا کہیں ضمناً بھی تذکرہ نہیں آنے پاتا۔ گویا ذہناً اور عملاً اس مسلک کو اسلام کے مسلّمہ مکاتیب فکر میں سرے سے شمار ہی نہیں کیا جاتا۔ اسی لیے کہیں اس موضوع پر سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ نہ یہ پتہ چل سکا کہ شیعہ عقائد و اعمال کی اصل حقیقت کیا ہے اور سُنّی شیعہ نزاع میں حق کیا ہے اور باطل کیا ہے اور ان دونوں فرقوں کے درمیان کہاں کہاں اختلاف وافتراق کی خلیج حائل ہے۔ صدیوں سے یہ خلیج موجود ہے لیکن اہل سنّت جو سوادِ اعظم ہونے کے دعوی دار ہیں شیعیت کے بارے میں چند سطحی باتوں کے سوا کچھ نہیں جانتے اور یہ سطحی باتیں غلط سلط پروپیگنڈے کی رہین منت ہیں جن میں حقیقت کا شائبہ تک موجود نہیں ہے۔

فقہ کی بعض کتابوں میں یا کتب حدیث میں یا عقائد و علم کلام کی بعض دستاویزی کتب میں سُنّی شیعہ نزاع سے متعلق کہیں کوئی ذکر آتا بھی ہے تو رواداری ہیں۔ فقہ حنفی کی مشہور اور سب سے معتبر کتاب ہدایہ میں ایک عبارت ہے۔

یجوز تقلید القضاء من السلطان الجائر کما یجوز من العادل لان الصحابہ تقلدوا من معاویہ

"ظالم حکمران کی جانب سے جج کا عہدہ قبول کرنا اسی طرح جائز ہے جیسے ایک انصاف پسند حکمراں کی جانب سے کیوں کہ صحابہ نے معاویہ کی جانب سے یہ منصب قبول کیا۔"

میں نے اس عبارت کے بارے میں دارالعلوم دیوبند کے شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی مرحوم سے سوال کیا کہ :-

"اس عبارت سے تو مترشح ہوتا ہے کہ معاویہ "سلطان جائر" (ظالم حکمراں) تھا۔ اگر وہ ظالم تھا جیسا کہ صاحب ہدایہ علامہ مرغینانی تصریح کر رہے ہیں تو معاویہ کے نام کے ساتھ "رضی اللہ عنہ" کا لاحقہ کیوں

استعمال کیا جاتا ہے۔ کیا ایک ظالم حکمراں کے لیے رضی اللہ عنہ کی دعا مانگنا جائز ہے ؟"

مولانا اعزاز علی مرحوم بڑے تنک مزاج واقع ہوئے تھے فرمانے لگے :-

"مولانا! (یہ ان کا تکیۂ کلام یا مستقل طرزِ تخاطب تھا جس سے وہ اپنے شاگردوں کو مخاطب کرتے تھے) آپ ہمیشہ بے تکے سوالات کرتے رہتے ہیں۔ رضی اللہ عنہ تو معاویہ کی صحابیت کی بناء پر ان کے نام کے ساتھ آتا ہے۔ باقی رہا ان کا سلطان جائز ہونا تو یہ ایک الگ موضوع ہے"

معاویہ کے بارے میں فقہا کے اس ریمارک کے بعد کہ وہ ایک ظالم پیشہ حکمراں تھا۔ یہ پہلا صحابیٔ رسولؐ تھا جس کے خلاف میرے دل میں نفرت کا جذبہ ابھرا۔ تاہم معاویہ کے ظالم حکمراں ہونے کے علم کے باوجود ابھی شیعیت کے لیے میرے دل میں نرم گوشہ پید نہیں ہوا تھا اور میری جہالت کا یہ عالم تھا کہ دورۂ حدیث کا منتہی طالب علم ہونے کے باوجود مجھے یہ خبر نہ تھی کہ شیعہ فرقہ اور معاویہ کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔ میں بیک وقت شیعیت سے بھی متنفر تھا اور معاویہ سے بھی۔

تاہم میں جب کسی شخص کو معاویہ کی تعریف میں رطب اللسان پاتا اور بڑے بڑے علماء و فضلاء کو اس گھناؤنے جرم کا مرتکب پاتا تو میں فکر و نظر کے اس تضاد پر حیرت محسوس کیئے بغیر نہ رہتا۔ ایک طرف قرآن مقدس کی بیشمار آیتیں میرے سامنے آتیں جن میں ظلم اور اہلِ ظلم کے سایے سے بھی بچنے کی تلقین کی گئی ہے اور ظالموں کو لعنتِ خداوندی کا مستوجب قرار دیا گیا ہے۔

"وَلَا ترکنوا الی الّذین ظلموا فتمسکم النار" (القرآن سورۂ ہود پ۱۲)

"ظالموں کی طرف ذرا سا بھی جھکاؤ اختیار نہ کرو کہ اس کی پاداش میں جہنم کی آگ تمہیں بھسم کر دے گی۔"

"الا لعنۃ اللہ علی القوم الظالمین"

"سنو! خدا کی پھٹکار ہے ظلم کرنے والوں پر"

"وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون"

"ظالم لوگ بہت جلد جان لیں گے کہ وہ کس کروٹ پلٹیں گے۔"

اور ایسی ہی بیشمار آیتیں ہیں جن میں ظالموں کی مذمت کی گئی ہے۔

دوسری طرف حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادِ عالیہ یاد آتے جن پر حضورؐ نے ظالم حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق بلند کرنے کی ہدایت فرمائی اور اسے جہاد کی سب سے اعلیٰ منزل قرار دیا:-

"افضل الجہاد کلمہ حق عند سطان جائر۔"

"سب سے اعلیٰ وافضل جہاد کسی ظالم حکمران کے منہ پر سچی بات کہنا ہے"

من مشیٰ مع ظالم لیقویہ وھو یعلم انہ ظالم فقد خرج عن دائرۃ الاسلام۔"

"جو شخص کسی ظالم کے ساتھ دو قدم چلا اور اس کی تقویت کا باعث بنا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ واقعتاً ظالم ہے تو ایسا شخص دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا۔" (بیہقی)

لیکن یہ کیسی ستم ظریفی، اعجوبہ زائی اور طرفہ تماشگی ہے کہ نہ ظالم حکمراں ہونا ایک صحابی کے لیے عیب کی بات ہے نہ ظالم حکمراں سے تعاون کرنا شانِ صحابیت کے منافی۔ گویا صحابیت کا اعزاز ظلم کے ساتھ بھی قائم رہتا ہے اور ظالم کی علانیہ حمایت کے باوجود اس اعزاز میں کوئی قباحت رونما نہیں ہوتی۔ ایسا تقدس تو شاید پیغمبروں کو بھی حاصل نہیں ہوا اور ایسی عصمت کا تصوّر تو انبیاء و ملائکہ کیلئے بھی ثابت نہیں ہے مگر صحابی ہر حکم سے مستثنیٰ اور ہر قانون سے بالاتر ہے ع

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

میں جب دارالعلوم دیوبند میں قیام کے بعد واپس لوٹا تو اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد ہمارے یہاں بعض نامور علماء کی تشریف آوری ہوئی۔ علمار کی اس مجلس میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی بعض عبارتیں زیر بحث آگئیں۔ مودودی صاحب نے اپنی کسی کتاب میں خلافتِ راشدہ کا ذکر کرتے ہوئے کہیں یہ لکھ دیا، صحیح الفاظ تو یاد نہیں رہے لیکن اصل عبارت کا مفہوم یہ تھا کہ:۔

"شیخین کے بعد حضرت عثمان سریر آرائے خلافت ہوئے وہ ان خصوصیات کے حامل نہ تھے جو ان کے پیشرو حضرات میں پائی جاتی تھیں"

مولانا حسین احمد مدنی کا نام نہاد خلیفہ پیر خورشید احمد بھی اس مجلس میں موجود تھا۔ وہ اگرچہ جاہل مطلق تھا لیکن مودودی صاحب کی محولہ بالا عبارت پر تنقید میں سب سے پیش پیش تھا اور بار بار ایک ہی بات دہرائے چلا جا رہا تھا کہ اس فقرے میں مودودی صاحب نے حضرت عثمان کی خلافت کی خصوصیات کا انکار کیا ہے۔ بحث میں پہلی بار حصہ لیتے ہوئے میں نے ان جاہل و اجہل پیر صاحب سے عرض کیا کہ:۔

"جب آپ ان حضرات میں فرق مراتب کے قائل ہیں کہ حضورؐ کے بعد سب سے افضل ابوبکر پھر عمر ہیں پھر عثمان ہیں تو یہ ترتیب خود بتا رہی ہے کہ خصوصیات میں کمی بیشی تھی۔ اور یہ تو ساری امت کا متفقہ فیصلہ ہے اس میں تن تنہا مودودی صاحب ہی تو مجرم نہیں ہیں۔"

بحث جب تلخی کا شکار ہونے لگی تو میرے نانا سید شریف حسن مرحوم نے مجھے ڈانٹا اور فرمایا۔

"بزرگوں سے بحث نہیں کیا کرتے تم خاموش رہو جی!"

بحث اس ڈانٹ ڈپٹ پر ختم ہو گئی لیکن میرے دل میں تاریخ کے مطالعہ کی

حس پیدا کر گئی۔ میں نے سوچا کیوں نہ میں از خود تاریخی واقعات کا جائزہ لوں۔ اور یہ معلوم کروں کہ وہ کون سی خصوصیات تھیں جن سے دامنِ عثمان تہی تھا اور جن کے باعث حالات ان کے قتل پر منتج ہوئے۔

انسان جب تک تاریخ کا مطالعہ نہیں کرتا کنوئیں کا مینڈک بنا رہتا ہے اور بسم اللہ کے گنبد میں محصور ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن تاریخ کے غیر جانبدارانہ مطالعہ سے ذہن و دل و دماغ کے بہت سے قفل خود بہ خود ٹوٹ کر گر جاتے ہیں اور یہی کچھ میرے معاملے میں ہوا۔

حضرت عثمان کے عہد خلافت پر تاریخ کی روشنی میں نظر ڈالی تو ایسی ایسی بدعنوانیوں کا حال پڑھا کہ یقین نہیں آتا تھا کہ ایک خلیفہء راشد جسے بقول محدثین حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے جنّت کا سرٹیفکیٹ بھی دے رکھا ہو ایسے کرتوت بھی کر سکتا ہے اور اس حد تک بھی جا سکتا ہے لیکن واقعاتی شہادتوں کا ایک انبار تھا جو حضرت عثمان کے اس غلط طرزِ عمل کی تائید و تصدیق کر رہا تھا۔

اور یوں عقیدت کا ایک بہت بڑا بت ٹوٹ گیا اور مجھے اس نام نہاد خلیفہ راشد سے نفرت ہو گئی۔ لیکن میری بے خبری اپنی جگہ بدستور قائم تھی۔ شیعیت کے خلاف میری نفرت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ دراصل مجھے علم ہی نہیں تھا کہ وہ ردِ عمل جس کا میں خود شکار ہو چکا تھا اسی کا نام تو شیعیت ہے یا یہ کہ شیعیت کے فروغ میں اس قِسم کے واقعات کا گہرا دخل ہے۔

شیعیت کے بارے میں میرا سطحی علم بس سنی سنائی باتوں تک محدود تھا اور میں اسے الحاد و زندقہ کی ایک تحریک سمجھتا تھا جو اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی تعلیمات کو مسخ کرنے کے لیے وجود میں آئی تھی اور یہ کہ اس تحریک کا سرغنہ ایک یہودی عبداللہ بن سبا تھا۔

ظاہر ہے کہ جہاں کسی تحریک کی نسبت کسی یہودی کی جانب کی گئی ہو وہاں اسلام

دشمنی کے علاوہ کونسا تصوّر ذہن میں اُبھر سکتا تھا۔

میں نے اپنے ماضی کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے صرف کتب تاریخ پر انحصار نہیں کیا بلکہ کتب حدیث بالخصوص "صحاح ستہ" کو بھی اپنے مطالعہ میں شامل کیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ محض تاریخ کے مندرجات کی بناء پر اپنے خاندانی عقائد و نظریات سے دستکش ہو جاؤں۔

لیکن مطالعہ تاریخ کے اس پورے عرصہ میں شیعی مکتب فکر کی کوئی کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ چنانچہ میں نے تاریخ کا مطالعہ سُنّی مسلمان کی حیثیت سے کیا۔ شیعی مکتبِ فکر کی کتابیں اوّل تو سُنّی حلقوں میں دستیاب ہی نہیں تھیں اور جو دستیاب تھیں۔ ان کے بارے میں گمان یہی تھا کہ وہ کچھ زیادہ قابلِ اعتبار نہیں ہوتیں۔ اور یہ اس مسلسل پروپیگنڈے کا اثر تھا جو صدیوں سے شیعیت کے خلاف کیا جاتا رہا ہے۔

البتہ شیعوں کی مخالفت اور شیعی مکتبِ فکر کے رد میں لکھی جانے والی بعض کتابیں ضرور میرے زیرِ مطالعہ رہیں اور ان سے میں خاصا متاثر بھی ہوا۔

بہت عرصہ پہلے جب میری عمر سولہ سترہ برس سے زیادہ نہیں تھی اور میں ایک دینی مدرسہ میں مشکوٰۃ، جلالین اور ہدایہ کا طالب علم تھا۔ مشہور سُنّی مناظر مولانا عبدالشکور لکھنوی ہمارے یہاں تشریف لائے اور جاتے ہوئے اپنی بہت سی تصنیفات ہمارے والد گرامی کو بہ طور تحفہ دیتے گئے۔

ہمارے گھر میں ایک معزز اور بزرگ مہمان اور نامور عالم دین کی حیثیت سے ان کی بڑی پزیرائی ہوئی اور پہلی بار ایک ایسی شخصیت کو دیکھنے کا موقع ملا جسے "امام اہلِ سنّت" کے بھاری بھر کم لقب سے یاد کیا جاتا تھا اور شیعیت کے لیے ان کے وجود کو ایک دھماکہ سے کم نہیں سمجھا جاتا تھا۔

مولانا موصوف نے جو کتابیں ہدیۃً پیش کی تھیں ان میں ایک کتاب کا نام حافظ

بطور خاص محفوظ رہا۔ اس کتاب کا نام تھا "تبنیۃ الحائرین"۔

یہ پہلی کتاب تھی جو ردِ شیعیت کے موضوع پر میری نظر سے گزری۔ اس کتاب میں مناظرانہ نوک جھونک اور حریفانہ بحث وجدل کا انداز اس نوعمری کے دور میں جبکہ ذہن ابھی خام تھا مجھے خاصا دلچسپ محسوس ہوا۔ اب اس کتاب کے تمام مندرجات تو ذہن میں نہیں رہے لیکن اس میں درج ایک لطیفہ جسے کثیفہ ناپاک جسارت کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ان دنوں میں نے اپنی نوٹ بک میں لکھ لیا۔ اور بہت دنوں تک اسے دہراتا اور اس سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

یہ دراصل سُنّی اور شیعہ مناظروں کی نوک جھونک کا ایک فرضی قصّہ تھا جسے "امام اہلسنّت" نے شیعوں کو چڑانے کے لیے اپنے خبثِ باطن کے اظہار کے لیے گھڑا تھا۔

سُنّی مناظر شیعہ عالم سے کہتا ہے۔

"مگر آپ لوگوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ قرآنِ پاک میں یزید کی بڑی تعریف ہے آپ نے وہ آیت دیکھی ہے؟"

"شیعہ عالم:۔ اجی توبہ کیجیئے یزید نزولِ قرآن کے وقت تھا بھی نہیں"۔

"سُنّی مناظر:۔ ہم یہ کچھ نہیں جانتے اس سے ہم کو کچھ بحث نہیں ہم تو اس آیت میں صاف صاف یزید کا نام دیکھتے ہیں"۔

"شیعہ عالم:۔ اچھا جناب! وہ آیت کون سی ہے؟

سُنّی مناظر:۔ لیجیے" ونزیدھم من فضلہ اور یزید ان کا خدا کے فضل سے ہے۔ یعنی بنو امیہ کا یزید خدا کے فضل سے پیدا ہوا ہے یا حاکم ہوا ہے۔

شیعہ صاحب سمجھ گئے کہ یہ میری دھاندلی کا جواب ترکی بہ ترکی ہے بس پھر تو ایسے خاموش ہوئے کہ

فبهت الذی کفر کانه التقم الحجر کا فرہکا بکا ہو گیا اس
نے پتھر نگل لیا ہو۔

میں نے یہ عبارت جب اپنے استاد محترم مولانا عبد الغنی رحمۃ اللہ علیہ کو سنائی تو وہ بہت بدمزہ ہوئے فرمانے لگے۔

"اہلِ بیت و نبوت کے بدترین دشمن کی تعریف و توصیف کے لیے
قرآنِ پاک میں لفظی اور معنوی تحریف کی یہ جسارت کس خبیث نے کی ہے؟"

مولانا مرحوم دار العلوم دیوبند میں میرے والد ماجد نور اللہ مرقدہ کے رفقائے درس میں سے تھے اور عربی ادب میں خصوصی دستگاہ کے حامل تھے۔ میں نے جب انہیں بتایا کہ یہ عبارت کسی اور کی نہیں "امام اہلِ سنت" کی ذہنی اختراع ہے تو وہ بیساختہ بولے۔

"ان صاحب کی نظر سے قرآنِ پاک کی یہ آیت نہیں گزری کہ
ویزید هم طغیانا و کفرا

جس میں امام اہلِ سنت کے استدلال کی رو سے یزید کی نسبت طغیان و کفر و سرکشی کی جانب کی گئی ہے۔ پھر استاد محترم نے تادیب و تنبیہ کے انداز میں فرمایا:

"اس قسم کی لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی اور نکتہ آفرینی بہ طور مزاح بھی
جائز نہیں ہے کہ اس سے احترام قرآن کی روح بھی مجروح ہوتی ہے اور
اس سے توہین اہلبیت کا پہلو بھی نکلتا ہے۔"

تو روشیعیت میں ایسی کئی کتابیں میری نظر سے گزر چکی تھیں جن میں اسی عرصہ تک اس کی بھنک کانوں میں نہیں پڑی نہ یہ پتہ چل سکا کہ حضورؐ کے وصال کے بعد اس مسئلہ نے کیسی سنگین نوعیت اختیار کر لی تھی اور بعض نامور صحابہ نے اس باغ فدک کے معاملہ میں کیا کردار ادا کیا اور اس باغ کی ملکیت کی دعوے دار حضرت سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا پر کیا گزری۔

یہاں ایک بات ضمناً عرض کر دوں کہ ہمارے دینی مدارس میں کتب حدیث کو سبقاً سبقاً ایک ایک حدیث کی تشریح وتوضیح کے ساتھ پڑھانے کا معمول کبھی نہیں رہا۔ حدیث کی وہ چھ ضخیم کتابیں جنہیں "صحاح ستہ" کہا جاتا ہے اور وہ حسب ذیل ہیں :

بخاری۔مسلم۔ترمذی۔نسائی۔ابو داؤد۔ابن ماجہ۔

انہیں ایک ہی سال کے اندر اندر شروع سے لے کر آخر تک پڑھانا ہوتا ہے۔ اس لیے علاوہ دور حدیث میں موطا امام مالک اور موطا امام محمد بھی دورۂ حدیث میں شامل ہیں اس لیے تدریس کا انداز یہ اختیار کیا گیا ہے۔ استاذ مسند تدریس پر براجمان ہے۔ متعلقہ کتاب اس کے سامنے کھلی رکھی ہے۔ طلبہ کے سامنے بھی کتابیں دھری ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک طالب علم بڑی روانی کے ساتھ متن مع حدیث پڑھتا چلا جاتا ہے اس مقصد کے لیے عموماً کسی ایسے طالب علم کا انتخاب کیا جاتا ہے جو تیزی سے اور اعراب کی کسی قدر صحت کے ساتھ عبارت پڑھ سکتا ہو دوسرے طلبہ گم صم بیٹھے رہتے ہیں یا اپنے خیالوں میں مگن استاذ کبھی پان چبانے میں مصروف اور گھر کی سوچوں میں گم، استاذ شاگرد سب بظاہر درس میں شریک مگر بہ باطن حلقۂ درس سے کوسوں دور۔ نہ استاذ کو کچھ خبر کہ کیا پڑھا جا رہا ہے، نہ طلبہ کو کچھ معلوم کہ کیا پڑھا جا رہا ہے اور جو کچھ پڑھا جا رہا ہے اس کا مطلب و مفہوم کیا ہے۔

ع کس نہ دانست کہ منزل گہ مقصود کجاست

این قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

کبھی کبھار کسی ایسے موقع پر جب ائمہ اربعہ (مالک۔ابو حنیفہ۔شافعی۔ احمد بن حنبل) میں سے کسی کے موقف کی تردید یا تائید مقصود ہو تو شیخ الحدیث صاحب لب کشائی فرماتے اس کے سوا ان کا اور کوئی مصرف نہیں۔۔یہی وجہ ہے کہ احادیث کے مضامین یا ان کی صحت وسقم کے بارے میں طالب علم روز اوّل ہی کی طرح بے خبر

رہتے۔ جب کوئی اس قسم کی اختلافی حدیث کتاب میں آجائے کہ اذا کان الماء قلتین لم ینجسہ شئی ، جب پانی کی مقدار دو "قلہ" ہو تو اسے کوئی شے ناپاک نہیں کرسکتی ؛ تو محدث صاحب اس موقع پر کچھ دیر داد تدریس دیتے "قلہ" کی لغوی اور فقہی تشریح کرتے ہوئے مخالف فقہاء کے لتّے لیتے اور پھر استغراق میں تشریف لے جاتے۔

درس نظامی کی ترتیب کچھ اس طرح رکھی گئی ہے کہ جو مضمون سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے اسے سب سے کم وقت دیا جاتا ہے۔

قرآن مقدس تمام دینی علوم و معارف کا سرچشمہ ہے لیکن اسے تفسیر کی صرف ایک یا دو ادھوری کتابوں پر ٹرخا دیا جاتا ہے۔ اور وہ تفسیر بھی "جلالین شریف" ہے۔

ذرا اس کتاب کے مؤلف کے مبلغ علم اور اس فاضل مفسّر کی علمی بے مائے گی کا اندازہ کیجیے کہ قرآنِ پاک کے پہلے پارے کی اس آیت کریمہ کی تفسیر میں مفسر صاحب کیا دور کی کوڑی لائے ہیں آیت ہے :-

واذ ابتلیٰ ابراھیم ربہ بکلمات فاتمھن قال انی جاعلک للناس اماما۔

"جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا تو وہ ہر آزمائش میں پورے اترے تب پروردگار نے ارشاد فرمایا، "میں تمھیں نسلِ انسانی کا امام مقرر کر رہا ہوں۔"

مفسرِ صاحب اس آیت کی شرح میں ان باتوں کی فہرست گنواتے ہیں جن میں ابراہیمؑ کو اس کے پروردگار نے آزمایا تھا وہ ہیں ناخن تراشنا، ختنہ کرانا، موئے زہار یعنی موئے زیرِ ناف کی پاکی، مونچھیں کتروانا، بغل کے بال صاف کرانا۔

اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی
اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی

حضرت ابراہیمؑ کی عزیمت و استقامت، ان کے ایثار و قربانی، ان کی ذات و حمیت، ان کی حق گوئی اور حق پژوہی، ان کا صبر و ثبات، ان کی تسلیم و رضا کی چند اور چند ملکوتی صفات کے ذکرِ جمیل کے بجائے ان کو ایک نائی حجام کے روپ میں پیش کرنا ہمارے ان فاضل مفسر صاحب کا کمالِ فن ہے۔

اور یہ مفسر کوئی معمولی شخصیت نہیں بلکہ اپنے دَور کے "امام اہلِ سنّت" اور نویں صدی ہجری کے مجدد علامہ جلال الدین سیوطی ہیں۔

جب قرآن مقدس کی تفسیر کا یہ عالم ہے تو حدیث کی جو درگت بن جائے کم ہے۔

میں نے جب کھلی آنکھوں اور کھلے دل و دماغ کے ساتھ قرآن و حدیث کا مطالعہ شروع کیا تو احساس ہوا کہ زندگی کا بیشتر حصہ جہالت و بے خبری میں گزر گیا۔ کتنے حقائق نظروں سے اوجھل رہے اور کتنے ہی غلط نظریات و عقائد دل و دماغ کا احاطہ کئے رہے۔

ع وائے گر در پسِ امروز بود فردائے

آیئے! اب کچھ باتیں اس غلط سلط پروپیگنڈے کے بارے میں بھی ہو جائیں۔ جو مدتِ مدید سے شیعہ مسلک کے خلاف زباں زد ہے اور جس میں روز بہ روز شدت پیدا ہو رہی ہے۔

اس مسلک سے قریب آکر اور اس کا تحقیقی اور علمی جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ چوں کہ صدیوں سے "قلم در کف دشمن است" کی صورتِ حال سے ہماری تاریخ دوچار ہے۔ اس لیے جب تک اصل صورتِ حال آشکار نہ ہو شیعہ فرقہ سے انصاف مشکل ہے۔ سو انصاف کا تقاضا ہے کہ ان اعتراضات کی چھان پھٹک

کریں جو اہلِ سنّت کی جانب سے اہلِ تشیع پر وارد کیے جاتے ہیں۔

شیعوں کے خلاف اہلِ سنّت کے حلقوں میں جو پروپیگنڈہ مہم جاری ہے اس میں بطورِ خاص یہ بات پھیلائی جا رہی ہے کہ شیعہ توحید خداوندی کے قائل نہیں ہیں اور ان کے عقیدہ وعمل میں شرک کی جڑیں بہت گہری اتری ہوئی ہیں بالخصوص دیوبندی اور اہلِ حدیث تو اس الزام تراشی میں تمام حدود شرافت سے تجاوز کر گئے ہیں۔

بریلویوں پر ان دونوں مقدم الذکر گروہ کی جانب سے بڑا الزام ہی یہ ہے کہ وہ مشرکانہ عقائد و اعمال میں مبتلا ہیں لیکن شیعوں کے معاملے میں دیوبندیوں، بریلوی، اہلِ حدیث دونوں ہی "سگ زرد برادر شغال" کے مصداق یہ بہتان باندھتے ہیں کہ شیعہ صرف اپنے بارہ اماموں ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور خدا اور رسولؐ کی توان کی نظر میں کوئی وقعت ہی نہیں ہے۔

میں بھی مدتوں اس پرفریب اور سراسر جھوٹے پروپیگنڈے کا شکار رہا لیکن جب شیعہ مسلک کے قریب آیا تو پتہ چلا کہ شیعہ عقائد و اعمال میں توحید کی اساس اتنی مضبوط و محکم ہے کہ کسی اور کے ہاں یہ استواری نہیں ہے اور سب سے زیادہ اگر کوئی گروہ شرک و بدعت و بت پرستی میں مبتلا ہے تو وہ بھی گروہ اہلِ سنّت ہے۔

آیئے ایک نظر اہلسنّت کے تصور خدا پر بھی ڈال لیں۔ شیعوں کی بات تو بعد میں ہوگی۔

دیوبندیوں کے عقیدہ کے مطابق "امکان کذب باری" ایک امر واقعہ ہے جس سے ان کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جھوٹ بول سکتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمام عیوب و نقائص بشری جو انسانی کمزوریوں اور خامیوں کے ذیل میں آتے ہیں۔ حق تعالیٰ بھی ان سے متصف ہوسکتا ہے اور بوقت ضرورت یہ برائیاں اس کے اندر بھی پائی جاسکتی ہیں۔

ذات حق کی اس سے زیادہ توہین کیا ممکن ہے۔

یہ اسی بدعقیدگی کے برگ و بار ہیں کہ ان کے ہاں پڑھے جانے والے ایمان مفصل میں "شر" یعنی برائی کی نسبت بھی حق تعالیٰ کی جانب کی گئی ہے۔

والقدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ ان کے عقیدے کا جزو ہے گویا خدا سے شر کا صدور نہ صرف ممکن ہے بلکہ محقق ہے اور اس بدعقیدگی میں اہلسنت کے تمام گروہ ملوّث ہیں۔

حق تعالیٰ جو مصدر و منبع خیر و سراسر خیر ہے اس کی جانب شر کی نسبت ایک ایسی گستاخی اور سوء ادبی ہے کہ اس کے بعد توحید کا تصور ہی باطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کا آسان اور سادہ و سلیس زبان میں مطلب یہ بنتا ہے کہ خدا شرارت بھی کرتا ہے اور عیاذاً باللہ اس اعتبار سے اس کا ایک نام شریر بھی ہوا۔ نقل کفر کفر نہ باشد۔

تجسیم باری تعالےٰ کا عقیدہ بھی اہل سُنّت ہی کے ایک گروہ میں مقبول ہے اور ان کے ہاں اس قسم کی بکثرت روایتیں ملتی ہیں کہ خدا کے عرش پر متمکن ہونے کی صدائے بازگشت ملاء اعلیٰ میں صاف سنائی دیتی ہے جب وہ اپنے تخت جلال و کبریائی پر فروکش ہوتا ہے اور عرش پر نزول اجلال فرماتا ہے تو اس قسم کی آوازوں کا شور بلند ہوتا ہے جیسے چوبیں تختہ یا لکڑی کی کرسی یا بانس کی چارپائی پر ایک بھاری بھرکم وجود کے بیٹھنے سے ہوا کرتا ہے۔

دیوبندیوں میں ایک بہت بڑا عالم گزرا ہے مولوی حسین علی نام کا میانوالی ضلع کا ایک پسماندہ اور دور افتادہ مقام واں بھچڑی اس کا مسکن تھا۔ یہ شخص دیوبندی مکتب فکر کے نامور بزرگ مولانا رشید احمد گنگوہی کا تلمیذ خاص تھا خود اس کے پیروکاروں کی ایک کثیر تعداد پاکستان میں موجود ہے اس کے شاگردوں میں دو نام تو بہت معروف ہوئے۔

ایک مولوی غلام اللہ خاں راولپنڈی جو اَب مر چکا ہے۔ دوسرا

سید عنایت اللہ شاہ بخاری جو ابھی تک بقید حیات ہے۔ اس شخص کو جو توحید کا ہیضہ ہوا تو اس نے نہ صرف حیاۃ النبیؐ کے مسلمہ عقیدہ کا انکار کیا بلکہ توسل کو حرام قرار دیا اور اپنی تفسیر قرآن میں "طاغوت" کی تشریح کرتے ہوئے اس لفظ کے مفہوم میں انبیاء و ملائکہ تک کو شامل کر گیا۔ (حوالہ کے لیے دیکھیے "بلغۃ الحیران" طبع اوّل) یہ شخص ہندوستان میں محمد بن عبدالوہاب نجدی کا بروز تھا اور اس نے عشق و محبت رسولؐ اور ادب و احترام کی تمام قدروں کو شرک قرار دے دیا۔

توحید خداوندی میں شرک کی ادنیٰ آمیزش ناقابل معافی جرم ہے لیکن ادب و احترام ہرگز توحید کے منافی نہیں ہے اور تعظیم کو شرک کے مترادف قرار دینا دین میں تحریف بھی ہے اور غلو بھی جس سے قرآنِ مقدس نے بڑی سختی سے روکا ہے۔

شعائر الٰہیہ کی تعظیم کو قرآنِ مقدس نے دلوں کی کیفیت کو تقویٰ سے تعبیر کیا ہے۔

ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من تقوی القلوب خدائے بزرگ و برتر نے صفا اور مروہ کی دو برائے نام پہاڑیوں کو شعائر اللہ میں شمار کیا ہے۔ اگر ناقہ صالح شعائر خداوندی بن سکتی ہے اور اگر صفا و مروہ کی پہاڑیاں شعائر اللہ میں شمار ہو سکتی ہیں تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی آل اطہار کو اگر شعائر خداوندی میں شمار کیا جائے اور ان کے عتبات عالیہ کی تعظیم و تکریم کا اہتمام کیا جائے تو یہ شرک کیوں کر ہوا؟

وہ پتھر جس پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے نقش پا ثبت ہیں اور جسے قرآن مقدس نے مقامِ ابراہیمؑ کا نام دیا ہے اس کے لیے حکم ہوا کہ اسے مصلّی بنایا جائے۔

اور بڑے سے بڑا موحد بھی خانہ کعبہ کے اس مقامِ مقدس کے سامنے دو نفل کی ادائیگی کو اجر و ثواب سمجھتا ہے۔ کیونکہ خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہاں نماز ادا فرمائی۔

اگر ابراہیم علیہ السلام کے نقش کف پا کو اپنی جبین نیاز کے روبرو رکھنے سے اور

اس کے سامنے کھڑے ہونے سے رکوع وقیام سے شرک کا اشتباہ نہیں ہوتا تو اہلِ بیتِ نبوت کے مزارات پر کھڑے ہو کر ان پر درود و سلام بھیجنے یا ان کے توسل سے بارگاہِ ایزدی میں دعا والتجا سے شرک کا امکان کیسے پیدا ہوا؟

قرآنِ مقدس نے جہاں کعبہ کی حرمت وعظمت کا بیان کیا وہاں یہ بھی کہا کہ فیہ اٰیات بینات مقام ابراھیم اس حرمِ کعبہ میں خدا کی دی ہوئی اور روشن آیات ہیں اور وہ ہیں مقام ابراہیمؑ۔ یہاں مقامِ ابراہیمؑ کے لیے جمع کا صیغہ استعمال ہوا حالانکہ ایک ہی چیز ہے جس کا آیت میں تذکرہ ہے لیکن نہیں ابراہیمؑ کے دونوں قدموں کے نشانات اور وہ پتھر جس پر یہ نقوش پا ثبت ہیں مل کر تین ہوئے اور اس لیے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا۔

توسل کے باب میں قرآنِ مقدس کی دو آیتیں اس کے جواز میں اس کے وجوب و استحسان کی تائید کرتی ہیں۔ پہلی آیت چھٹے پارے کی ہے۔

یاایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلہ (مائدہ پ۶)

اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور اس تک رسائی کا وسیلہ تلاش کرو۔

وہابیت کے دل دادہ اس آیت میں لفظ "الوسیلہ" کے سلسلے میں تاویل کو تحریف کا رنگ دے کر اس سے "عمل صالح" مراد لیتے ہیں۔

لیکن قرآن مقدس اپنے مفہوم و معنی بھی خود ہی متعین کرتا ہے چنانچہ ایک دوسری آیت میں ارشادِ ربانی ہے:

اولئک الذین یدعون یبتغون الیٰ ربھم الوسیلۃ انھم اقرب ویرجون رحمتہ ویخافون عذابہ (بنی اسرائیل پ۱۵)

وہ لوگ (اہل ایمان) دعا کرتے ہیں اور وسیلہ تلاش کرتے ہیں کہ لوگوں میں کون ایسا ہے جو خدا سے قریب تر ہو (تو اس کا دامن پکڑیں) اور خدا کی رحمت

کی امید لگائے ہوئے ہیں اور اس کے عذاب سے خوفزدہ رہتے ہیں۔

یہاں حق تعالیٰ نے الفاظ کا انتخاب ایسا کیا ہے کہ وہابیت کی جڑ کٹ کر رہ گئی ہے۔ "ایھم" میں ضمیر "ہم" کا مرجع ذوی العقول یعنی انسان ہو سکتے ہیں عمل صالح نہیں۔ اگر عمل صالح مراد ہوتا تو "الوسیلہ" کی مناسبت سے "ایھا" کا لفظ آتا۔

یہ عربی گرائمر کا بالکل ابتدائی سا سبق ہے اور کسی نو آموز عربی خواں سے بھی دریافت کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کریمہ میں وضاحت کے ساتھ اپنی دعاؤں میں مقربانِ بارگاہِ حق کا وسیلہ پکڑنے کا تذکرہ موجود ہے اور کوئی نہایت کور ذوق اور کودن ہوگا جو اس آیت کی موجودگی میں توسل کو شرک سے تعبیر کرنے کی حماقت کرے مگر جنھیں توحید کا ہیضہ لاحق ہو ان کی بیماری کا کیا علاج۔

چنانچہ اُمّت محمدیہ کے جمہور علماء و مفسرین کا اس امر پر اتفاق رہا ہے کہ دعاؤں میں توسل مستحب و مسنون ہے اور گویا عربی کے اس شعر کی عملی تشریح ہے ؎

احب الصالحین ولست منهم
لعل الله یرزقنی صلاحا

میں نیکو کار لوگوں سے محبت رکھتا ہوں گو خود ان میں سے نہیں ہوں۔
شاید نیک لوگوں سے محبت میرے نیک ہونے کا سبب بن جائے۔

بندگانِ حق سے محبت بجائے خود ایک عمل صالح ہے اور اگر عملِ صالح ہی وسیلہ نجات ہے تب بھی توسّل کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔

مگر ابن تیمیہ اور اس کی ذرّیت نے اور محمد بن عبدالوہاب نجدی اور اس کے پیروکاروں نے ایک سیدھے سادے مسئلہ کو شرک و بت پرستی سے تعبیر کر کے اختلاف و افتراق کی ایک نئی راہ پیدا کر لی اور مفسدین و اشرار کو فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانے کا ایک اور سنہری موقع مل گیا۔

اُمت کا دامن انہی شرپسندوں کی چیرہ دستیوں سے تار تار ہے جو اپنے ذہن کی ہر کجی کو شریعت کا روپ دے کر شریعت کو بازیچۂ اطفال بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

ہر لیئے دار دیں شدہ

راقم الحروف کو حسنِ اتفاق سے آئمہ معصومین علیہم السلام کے عتبات عالیہ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ جن آئمہ علیہم السلام کے مزارات مقدسہ وہابی دست برد سے محفوظ ہیں ان کے قبوں سے باہر ایک بڑے سے فریم میں اذنِ باریابی کی جو دعا لکھی ہوئی موجود ہے۔ اس دعا کے الفاظ خود بتا رہے ہیں کہ مسلک شیعیت میں توحید کو کس درجہ اہمیت حاصل ہے۔ ہر مقام پر لکھی ہوئی دعا کی عبارت میں یہ فقرہ موجود ہے۔

(خداوندا! میں تیری بارگاہ میں حاضر ہو رہا ہوں تیرے اس نیک بندے کے وسیلہ سے)

توسل کو شرک قرار دینا انہی بدمذاق لوگوں کا اندازِ فکر ہے جو نہ توحید کی حقیقت سے واقف ہیں نہ توسل کے آداب سے۔

خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ادعیۂ ماثورہ میں بعض ایسی دعائیں ہیں جن میں انبیاءؑ سابقین کا توسل مذکور رہے۔ ایک دعا کے الفاظ یہ ہیں۔

اے اللہ! اے عیسیٰؑ کے رب، اے موسیٰ کے رب، اے ابراہیم کے رب اور اے محمدؐ کے رب!!

اگرچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات اس سے بلند و ارفع ہے کہ انہیں توسّل کی حاجت ہو مگر امت کو تعلیم دینے کے لیے حضورؐ نے دعائیہ اسلوب اختیار فرمایا۔

یہ عجب بات ہے کہ اگر شیعیانِ علی علیہ السلام ائمہ اہلِ بیت طاہرین سے توسل

کریں تو اس پر فوراً شرک کا فتوے عائد کر دیا جائے لیکن اگر اہلسنت ہندوؤں کے ۳۲ کروڑ دیوی دیوتاؤں کی تعداد کے اپنے پیروں، مرشدوں اور ایروں غیروں کا وسیلہ پکڑیں تو ان کا کچھ نہیں بگڑتا۔

اہلِ سنّت کے اماموں، پیروں، مرشدوں اور مشائخ طریقت کی تعداد لاکھوں سے تجاوز ہے یعنی ع

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا

کا مضمون ہے اور ان میں سے ہر ایک ان کا امام، ان کا مقتدا، ان کا پیشوا اور اس طرح ان کا وسیلہ بننے کا اہل ہے

بہ ذرہ ذرہ سجودے نصیب ماشدہ است
بگو ندیم کہ اکنوں بہ برہمن چہ رسد

ذرا ان بزرگانِ دین کے القاب و خطابات ہی کی فہرست پر ایک نظر ڈالیں تو ابکائی ہونے لگتی ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ آستانۂ ہدایت سے جو صحیح معنوں میں امتِ محمدیہ کے لیے "عروۃ وثقیٰ" تھا منحرف ہو کر کس درجہ آشفتہ خاطری کے شکار ہوئے کہ اب ہر سنگِ دران کے لیے عبادت گاہ بن گیا ہے۔ اہلِ سنّت کے دینی پیشواؤں اور روحانی مقتداؤں میں کوئی قطب الاقطاب ہے تو کوئی قطب وقت کوئی قطب زمین و زمان ہے تو کوئی قطب زمانہ کوئی غوث ہے تو کوئی غوث پاک، کوئی غوث الاعظم ہے تو کوئی غوث العالمین۔ مزید برآں کسی کے نام کے ساتھ شیخ اکمل، کوئی شیخ طریقت اور کسی کا سابقہ شیخ المشائخ، کوئی شیخ الشیوخ، کوئی ابدال۔

راس الاولیا، زبدۃ الاصفیاء، پیرانِ پیر، پیر دستگیر، پیر طریقت، سلطان العارفین، شیخ العرب والعجم، فخر السالکین، عمدۃ العارفین، رازیٔ زماں، غزالیٔ دوراں، امام الائمہ، شمس الائمہ، مجدّد، مجدّدِ دوراں، مجدد ماۂ، حاضرہ، مجدّد الف ثانی، جامع المجددیں، حکیم الامّت،

امیر شریعت، ائمہ علم اولیاء اور نہ جانے کیا کیا اس پر مستزاد ہے۔

اور اگر شیعہ چودہ معصومین کا دامن پکڑ کر بحق محمدؐ و آلِ محمدؐ دربارِ خداوندی میں طلب رحمت و مغفرت کریں تو مشرک ٹھہریں۔

شیعہ لٹریچر دنیا کی ہر زبان میں تقریباً بہ کثرت دستیاب ہے۔ ان کی کسی تحریر، کسی دستاویز، کسی علمی مقالہ، کسی مضمون یا ان کے کسی فقہی اجتہاد یا ان کے کسی رسالہ عملیہ میں آئمہ معصومین علیہم السلام کے لیے نہ قطب کا لفظ کا ملتا ہے، نہ غوث کا، نہ دستگیر کا، نہ پیر کا۔ وہ انہیں امامت اور پیشوائی اور حضورؐ کے علوم و معارف کے وارثین کا مقام دیتے ہیں اور اس کے آگے بڑھنے کے روادار نہیں ہیں۔ اس کے برعکس خواہ دیوبندی ہوں یا بریلوی، حنفی ہوں یا شافعی، القاب و خطابات کے نت نئے اختراعی الفاظ ان کے ہاں اس کثرت کے ساتھ ملتے ہیں کہ الفاظ کا بھرم جاتا رہا ہے۔

اے طبل بلند بانگ و در باطن ہیچ

حتیٰ کہ انھوں نے دو دو کوڑیوں کے مولویوں کو خاتم الفقہا و المحدثین، خاتم المفسرین، شیخ القرآن، شیخ التفسیر، امیر شریعت، خاتم الاولیاء و العارفین اور اسی قبیل کے بھاری بھرکم الفاظ سے یوں نوازا کہ "خاتم النبیین" کی معنویت ضائع ہو کر رہ گئی۔ اور امیر شریعت ایسا خطاب ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بھی کسی نے استعمال نہیں کیا تھا "تا بہ دیگراں چہ رسد"

بریلوی مسلک کے ایک بہت نیک دل عالم جو جوانی ہی میں داغ مفارقت دے گئے میرے بہت اچھے دوستوں میں سے تھے۔ نام اس مرد شریف کا قاضی عبدالنبی کوکب تھا۔ وہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں شعبہ مخطوطات کے نگراں تھے۔ جب میری پہلی کتاب "مولائے کائنات اور ان کے سیاسی حریف" شائع ہوئی تو وہ ایک دن سر راہے ملے اور میری تبدیلی مسلک پر انہوں نے افسوس کا اظہار کیا ضمناً انہوں نے

یہ بھی فرمایا کہ ہماری لائبریری کے انچارج شیعہ ہیں اور ان کے متعلق میرا تاثر یہ تھا کہ نہایت غیر متعصب اور مرنجان مرنج شخص ہیں مگر ایک واقعہ نے ان کے بارے میں میری رائے بدل دی ہے۔"

قاضی عبد النبی کوکب جن کی خاطر مجھے بہت عزیز تھی۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ واقعہ کی نوعیت کیا ہے؟ فرمانے لگے:

"آج ایک صاحب جو غالباً شیعہ تھے ان لائبریرین سے ملنے آئے دونوں نے ایک دوسرے کو بجائے سلام کہنے کے "یا علی مدد" کہا۔

میں نے عرض کیا اس میں عصبیت کا کون سا پہلو ہے۔ یا علی مدد کہنا شیعوں کا شعار ہے اور شعار عصبیت کے مظاہرے کے لیے نہیں بلکہ ملّی تشخص کو نمایاں کرنے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ وہ لوگ جو مولائے کائنات امیر المومنین سیدنا علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے ذہنی اور قلبی وابستگی رکھتے ہیں وہ اظہارِ عقیدت و محبت کیلئے علی علیہ السلام کے نام کو سلامتی اور زندگی کی مشکلات میں سکون و راحت کی علامت سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے سے ملتے وقت اس نام کو دہراتے ہیں۔ قرآنِ مقدس نے سلام کیلئے کسی مخصوص لفظ کا مسلمانوں کو پابند نہیں کیا ہے۔ البتہ یہ ضرور کہا ہے کہ تحیہ کا جواب بہتر تحیہ سے دو: واذا حییتم بتحیۃ فحیوا باحسن منہا او ردوھا "جب تمہیں کوئی شخص زندگی کی دعا دے تو تم بہتر لفظوں میں اسے زندگی کی دعا دو یا انہی لفظوں میں۔

تحیہ کے لفظی معنی عربی لغت میں "زندگی کی دعا دینا" ہیں۔

سیدنا علی علیہ السلام کے اسم گرامی سے بڑھ کر زندگی کی دعا اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک علیؑ کا نام لینے سے اس پوری جد و جہد کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے جو اللہ کے اس مخلص و فرماں بردار بندے اور پیغمبرؐ کے اس جاں نثار ساتھی نے ہر

آڑے وقت میں، ہر معرکۂ حق و باطل میں، ایک محاذ جنگ پر اپنے حرب وضرب ید اللّٰہی کی تمام تر توانائیوں کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا۔

اس ایک نام کے ساتھ تائید خداوندی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے پناہ محبت، حضورؐ کی لختِ جگر سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کی زندگی بھر کی رفاقت جوانانِ جنّت کے سردار سیدنا امام حسن اور امام حسین علیہما السلام سے ان کی شفقتِ پدری، خود ان کی مظلومیت و بیچارگی اور میدانِ کربلا میں ان کی اولاد اطہارؑ کی شہادت و بے بسی کے تمام مناظر آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ پھر سیدنا علی کی عزیمت، ان کا صبر، ان کی استقامت، ان کی جرائت و ہمّت، ان کی شجاعت وجوانمردی، ان کی قوت و توانائی، ان کا حوصلہ وولولہ، ان کی تب وتاب جاودانہ، ان کا علم وفضل، ان کی جلالتِ شان، ان کا فقر واستغنا غرضیکہ وہ تمام محاسن وکمالات، جو ان سے پہلے اور ان کے بعد کسی انسان میں آج تک یکجا نہیں ہوئے۔ وہ تمام اوصاف وکمالات اس ایک نام کے اندر سمٹ آئے ہیں۔

اس ایک شکل میں کیا کیا نہ صورتیں دیکھیں　　نگار تھا، نظر آیا نگار خانہ وہ

میں نے کہا قاضی صاحب! آپ تو مسلکاً بریلوی ہیں اور بریلویوں کے ہاں ختم غوثیہ یا ختم خواجگان میں "یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً اللہ" کا وظیفہ روز کا معمول ہے نیز گیارھویں کے موقع پر تو یہ شعر بڑے التزام سے پڑھا جاتا ہے ؎

امداد کُن، امداد کُن، از بندِ غم آزاد کُن　　در دین و دنیا شاد کُن یا شیخ عبدالقادرا

تو کیا سیدنا علی علیہ السلام کا مقام شیخ عبدالقادرؒ جیلانی سے بھی گیا گزرا ہے کہ شیخ کو مدد

ؔ شیخ عبدالقادر جیلانی کے مریدان خاص میں ایک صاحب شیخ بن عدی بن مسافر اموی بھی تھے۔ ان صاحب نے یزید اور معاویہ کے فضائل کو بڑھا چڑھا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا گویا یوم یزید

کے لیے پکارنا تو جائز اور مستحسن ہوا اور امیر المومنین علیہ السلام کا نام لینا عصبیت کا شرک قرار پایا، علیؑ کو مشکل کشا کہنا اور عبدالقادر جیلانی کو پیر دستگیر کہنے میں کیا فرق ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں کا مفہوم ایک ہے۔ شیعہ اگر علیؑ کو مشکل کشا کہہ کر پکاریں تو قابل اعتراض اور عبدالقادر جیلانی کو پیر دستگیر کہہ کر آپ بلائیں تو بجا اور درست! حالانکہ عبدالقادر جیلانی کو علیؑ سے وہ نسبت بھی نہیں جو ایک گدا کو ایک بادشاہ سے ہوتی ہے ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ محض شیعہ دشمنی کی بناء پر شیعوں کی ہر بات کو محل اعتراض قرار دینا کہاں کا انصاف ہے اور یہ کہاں کی شرافت ہے کہ اسی نوعیت کا جرم آپ کریں تو خوبی اور دوسرا کرے تو گردن زدنی۔

باقی رہا دیوبندیوں اور وہابیوں کا یہ کہنا کہ علیؑ کو مشکل کشا کہنے سے اور یا علیؑ مدد کا نعرہ لگانے سے شرک لازم آتا ہے تو اس لٹوے کو ساون کے اندھے کی طرح جسے ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے ہر بات پر شرک کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"جب تمہارا گزر کسی ایسی وادی میں ہو جہاں شیر کی موجودگی کا امکان ہو تو یہ دعا پڑھو شیر کے حملے سے محفوظ رہو گے۔"

اعوذ بدانیال وبالجب من شر الاسد

شیر کی برائی اور اس کے حملے سے میں پناہ چاہتا ہوں حضرت دانیالؑ کی

اور یوم معاویہ کی جس رسم بد کو عطاء اللہ شاہ بخاری کے فرزندانِ خلف نے اختیار کیا اس کے بانی مبانی شیخ عبدالقادر جیلانی کے فیض یافتہ بزرگ تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ عباسی دور کے وزیر اعظم ابن ہبیرہ دلیمی نے شیخ عبدالقادر جیلانی کی لاش ان کی قبر سے نکلوا کر جلائی اور اس کی راکھ دجلہ میں بہادی۔ (اعلام الزرکلی ج ۵۔ ص۱۱)

اور اس گڑھے کی جس میں وہ گرائے گئے تھے۔ (حیٰوۃ الحیوان دمیری)

اس حدیث پر علامہ انور شاہ کاشمیری نے جو دارالعلوم دیوبند کے صدرالمدرسین شیخ الحدیث تھے۔ اور جن کے بارے میں دیوبندی متفق الرائے ہیں کہ علم و فضل و کمال میں ان جیسی شخصیت کہیں صدیوں میں پیدا ہوئی ہے کہ اپنی کتاب "خزینۃ الاسرار" میں لکھا ہے کہ:۔ اقول منه جواز الاستغاثه بالصالحین (میری رائے میں اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے نیک اور صالح بندوں کی پناہ طلب کرنا جائز ہے۔)

"یا علیؑ مدد" کی نوعیت توسل کی ہے یا پھر استغاثہ بالصالحین کی اور علیؑ سے بڑھ کر صالح مومن کون ہو سکتا ہے بلکہ قرآنِ مقدس نے تو "صالح المومنین" کے الفاظ انہی کیلئے استعمال کیے۔

راقم الحروف ابتدائی عمر میں جب "یوسف زلیخا" جو ملا عبدالرحمٰن جامی کی شعری تصنیف ہے سبقاً سبقاً پڑھ رہا تھا تو ہمارے استاذ محترم مولانا خیر محمد جالندھری نے جو دیوبندیوں کے سرخیل تھے جامی کے اس نعتیہ شعر پر کہ ؎

زمہجوری برآمد جان عالم　　ترحم یا نبی اللہ ترحم

جامی کو مشرک قرار دینے کی بجائے اس کی توجیہہ یہ کی تھی کہ یہ ایک از خود رفتہ عاشقِ رسول کی والہانہ محبت کا اظہار ہے اس لیے جائز ہے۔

سیدنا علی علیہ السلام کے نام لیوا بھی ان کی گوناگوں صفات اور بے شمار محاسن کی بنا پر نیز پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس سے ان کی قرابتِ قریبہ کے اور حضورؐ کے لیے ان کی اور ان کے پورے خانوادے کی بے پناہ قربانیوں کے سبب والہانہ عقیدت و محبت رکھتے ہیں۔

اگر جامی "یارسول اللہ" کہہ سکتے ہیں قاسم نانوتوی اپنے نعتیہ اشعار میں حضورؐ کو پکار سکتے ہیں تو محبانِ علیؑ اور مدعیانِ ولائے علیؑ کے لیے یا علیؑ مدد کہنا کیسے ناجائز ہوا۔

محبت پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے اور نیتوں کا حال خدا ہی بہتر جانتا ہے محبتوں کو ناپنے کا کوئی پیمانہ اب تک ایجاد نہیں ہوا۔ ؎

قیس ہو، کوہ کن ہو، یا حالیؔ عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

۱۹۷۸ء میں جب راقم الحروف کو مدینۂ منوّرہ میں باریابی کا شرف حاصل ہوا اور میں نے اپنی آنکھوں سے جنت البقیع میں سعودی حکمرانوں کے ہاتھوں قبروں کی بے حرمتی کا مشاہدہ کیا تو میں نے بڑے دکھ کے ساتھ اس کا تذکرہ مشہور شیخ الحدیث مولانا ذکریا سہارنپوری سے کیا اس پر انہوں نے بھی اپنے دکھ کا اظہار کیا اور بتایا کہ مسجد قبا کے پہلو میں اس مکان کو بھی ڈھانے اور مسمار کر دینے کا پروگرام ہے جس میں حضورؐ نے ہجرت کے موقع پر قیام فرمایا تھا اور جسے سلاطین ترکی نے ایک قومی یادگار کے طور پر بڑے اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا تھا۔

شیخ الحدیث صاحب کی اس پریشانی کو دیکھ کر میں نے عرض کیا کہ:

"مولانا! اصل مجرم سعودی حکمران نہیں ہیں بلکہ وہ بدباطن شخص تھا جس نے شجرہ بیعت رضوان کو جڑ سے اکھڑوا دیا تھا کہ لوگ آثارِ نبوت کے اس مقدس درخت کی زیارت کے لیے آتے تھے۔"

میرا اشارہ جن بدباطن شخص کی جانب تھا اس کا تصور کر کے شیخ الحدیث صاحب بگڑے اور نہایت غضب ناک ہو کر انہوں نے مجھے فی الفور مجلس سے اٹھ جانے کا حکم دیا۔ مجلس سے چلتے چلتے میں نے کہا:۔

"مولانا! مہاتما بدھ کو برگد کے جس مقدس درخت کے نیچے نروان حاصل ہوا تھا۔ وہ درخت تو ہندوستان میں "بدھ گیا" کے مقام پر محفوظ ہے اور حضورؐ نے جس درخت سے ٹیک لگا کر صحابہ سے بیعت لی تھی اور جس کا ذکر قرآنِ مقدس میں موجود ہے۔ اسے بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکا گیا۔"

آثارِ قدیمہ مہذّب قوموں کا قیمتی اثاثہ ہوتے ہیں لیکن بادشاہ کے "بادشاہ سے

زیادہ وفادار قسم کے لوگوں نے اسلام کی تہذیبی اور ثقافتی حکمت عملی کو ملیامیٹ کر دیا۔

خلیفہ دوم جس تصوّر توحید کو فروغ دینے کی "سعیٔ بے خیر" میں مصروف رہے اس پر کسی مؤرخ کو یہ پوچھنے کی توفیق نہ ہوئی کہ توحید کا وہ تصور زیادہ معتبر ہے جو پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کے سامنے پیش کیا اور اس میں آثارِ قدیمہ کے تقدّس کو نہ صرف برقرار رکھا گیا بلکہ ان کی عزت و حرمت میں دوچند اضافہ کر دیا گیا۔

مقامِ ابراہیمؑ کا تقدس، صفا و مروہ کی تعظیم و تکریم، حجر اسود کو بوسہ دینے اور یوں اس کی قدر و منزلت میں اضافہ حتیٰ کہ اس قربانی کے دنبے کے سینگ بھی محفوظ رکھے گئے جو اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کے عوض ذبح کیا گیا اور جو بعد میں خانہ کعبہ پر حجاج بن یوسف ثقفی کی آتش بازیوں سے جل کر ضائع ہو گیا۔

یہ سب کیا شرک تھا جبکہ قرآنِ مقدس نے انہیں شعائر اللہ میں شمار کیا اور شعائر اللہ کی تعظیم کو تقوے کی علامت قرار دیا۔ توحید کا وہ تجریدی تصور جو ان نام نہاد مدعیانِ مشیخت کی دماغی یبوست و عبوست کی پیداوار ہے کیونکر معتبر تسلیم کیا جائے کہ توحید کی نزاکتوں کا جتنا احساس حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو ہو سکتا تھا اور کس کو ہو سکتا تھا۔ تم کیا اور تمھاری اوقات کیا کہ تم ہر مرحلے میں حضورؐ سے بھی دو چار ہاتھ آگے رہنے کی کوشش کر رہے ہو تاکہ دنیا کو اپنی اسلام سے وفاداری کا تاثر دے سکو۔

"ماں سے زیادہ چاہے پھاپھاکٹنی کہلائے" کی کہاوت اسی بیمار ذہنیت کے افراد کی عکاسی کرتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اسلام کا دامن حضرت عمرؓ اور ان کے پیروکاروں کے ہاتھوں تار تار ہے کہ ان حضرت نے "عمر عیار ہے سو بھیس بدل لیتا ہے" کے مقولے کو اپنی اسلام دشمنی کے مختلف حربوں اور حیلوں سے سچ کر دکھایا۔

اور وہ لوگ جو "کاتا اور لے دوڑی" طرز کے مسلمان ہیں اور جن کا کل اثاثہ سُنی سنائی باتیں ہیں اور اس بنا پر سُنی کہلاتے ہیں وہ اسلام دشمنی نے اس رنگ ڈھنگ کو دیکھ کر

واہ واہ سبحان اللہ اور "ہاتھ لا استاد کیوں کیسی رہی" کی تحسین آفریں میں لگ جاتے ہیں۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم — کہ بامن ہر چہ کرد آں آشنا کرد

شیعوں کے خلاف چھوٹے الزامات میں سرفہرست ایک الزام یہ بھی ہے کہ شیعہ قرآنِ مقدس کی صحت پر یقین نہیں رکھتے اور وہ قرآن کے تیس کی بجائے چالیس پارے مانتے ہیں اور قرآن میں تحریف کے قائل ہیں۔

اہلِ سنّت کی فریب کاری اور جھوٹ کی سیاست جس کی بنیاد ان کے پیشوا معاویہ بن ابی سفیان نے رکھی تھی۔ اس کے عین مطابق ان حضرات کا یہ معمول رہا ہے کہ جس جرم کے وہ خود مرتکب ہوں اس کا الزام دوسروں پر عائد کر کے اپنے جرم کی سنگینی کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ بالکل اس چور کا سا طرزِ عمل ہے جو چور چور کے شور میں خود بھی چور چور کی ہانک لگا کر خود کو صاف بچا کر نکل گیا تھا۔

اہلِ سنّت کے تمام محدثین نے اپنی کتب صحاح میں ایسی حدیثیں نقل کی ہیں جن سے قرآن کی صحت و صداقت مشتبہ قرار پائے۔ مثلاً بخاری کی یہ روایت کہ "معوذتین" (قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس) عبداللہ بن مسعود کے نزدیک قرآن کا حصّہ نہیں ہیں یا آیت رجم کی آیت قرآن میں موجود نہیں ہے مگر اس کا حکم باقی ہے اور صحاح ستّہ ہی کی روایت کے مطابق یہ آیت نازل ضرور ہوئی تھی مگر حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ان کی بکری اس پتے کو کھا گئی جس پر یہ آیت درج تھی اس لیے تمام اہلسنّت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ یہ آیت منسوخ التلادۃ ہے مگر منسوخ الحکم نہیں ہے۔

کیا آپ نے دنیا کے کسی آئین و دستور میں یہ بوالعجبی ملاحظہ کی ہے کہ اس کے دفعات کی ایک شق حذف کر دی گئی ہو۔ اس کی کتاب قانون میں اس کے بارے میں ایک لفظ بھی موجود نہ ہو مگر اس پر عمل درآمد کو لازم قرار دیا گیا ہو مگر علمائے اہلِ سنّت کے ہاں یہ بوالعجبی اسلام کی کتاب ہدایت میں موجود ہے کہ آیت کی تلاوت بھی منسوخ ہے اس

کی کتابت بھی ممنوع ہے اور اس کا اجراء (IMPLEMENTATION) قائم ودائم ہے۔
اس کھلی دھاندلی اور صریحاً بد دیانتی کا مقصد قرآن کی صحت کو مشکوک کرانے کے سوا کیا ہے۔
یہ روایت بھی اہلِ سنّت کی صحاح ستّہ میں بڑی آب وتاب کے ساتھ موجود ہے اور صرف اہلِ سنّت ہی کے محدثین درواۃ کو اس روایت کا شرف حاصل ہے۔ ؏

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند کہ

نماز میں دورانِ تلاوت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورہ والنجم (پ۲۷) میں اپنی طرف سے حسبِ ذیل الفاظ بڑھا دیئے جن سے کفار مکہ کی بت پرستی کا جواز ثابت ہوتا تھا اور یہ الفاظ اہلِ سنّت کی تمام کتب حدیث میں مندرج ہیں:

تلك الغرانيق العلى ملهن الشفاعة ترتجى

(یہ بت بڑی عظیم ہستیاں جن سے امید شفاعت کی جاتی ہے) العیاذ باللہ

قرآن مقدس میں اعراب کی تبدیلی کا اندازہ سورۂ یوسفؑ کی اس آیت سے ہو سکتا ہے۔

ثمّ یاتی من بعد ذٰلك عام فیه یغاث الناس وفیه یعصرون۔ (سورہ یوسف پ۱۳)

پھر اس کے بعد ایسا برس آئے گا جس میں لوگ سیراب کئے جائیں گے اور جس میں وہ شراب کشید کریں گے۔

اب ایک شخص نے یہ آیت امیرالمومنین سیدنا علی علیہ السلام کے سامنے اسی اعراب کے ساتھ تلاوت کی تو جناب امیر علیہ السلام نے اسے ٹوکا اور فرمایا "افسوس ہے تجھ پر! کیا وہ شراب کشید کریں گے؟

اس شخص نے عرض کیا "امیرالمومنینؑ! پھر میں اسے کس طرح پڑھوں؟ ارشاد فرمایا اس لفظ "یعصرون" کو معروف کی بجائے بصیغہ مجہول پڑھو جس کے معنی "بادلوں سے بکثرت پانی کے گرنے کے ہیں اور اس کی دلیل خود قرآن مقدس ہے جس نے برسنے

والے بادلوں کے لیے "معصرات" کا لفظ استعمال کیا ہے:

وانزلنا من المعصرات ماء ثجاجاً (سورہ نباء پ۳۰)

ہم نے بادلوں سے موسلا دھار بارش برسائی (پ ۳۰)

اعراب قرآن میں یہ تبدیلی اور تحریف کیوں روبہ عمل آئی محض خلفاء کیلئے سند جواز پیدا کرنے کی خاطر۔ ان شراب خور خلفاء میں سرفہرست نام حضرت عمر ابن خطاب کا ہے جس کی تفصیل آپ کتاب میں پڑھیں گے۔ سو شیعہ حضرات کو قرآن میں تحریف کی کیا ضرورت تھی کہ ان کا اور ان کے تمام ائمہ معصومین علیہم السلام کا متفقہ اور مسلمہ فیصلہ ہے کہ:

حلال محمد حلال الیٰ یوم القیامہ و حرام محمد حرام الیٰ یوم القیامۃ

محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حلال کی ہوئی چیزیں قیامت تک کے لیے حلال ہیں اور حضورؐ کی حرام کی ہوئی چیزیں تا ابد حرام ہیں۔

قرآن پاک میں تحریف کی جرأت وہی شخص کر سکتا ہے جو شریعت میں تحریف کر سکتا ہو اور یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے خلافتِ راشدہ کے دور میں ہوتا رہا ہے۔ میں جب اس قسم کے واقعات حدیث و سیرت کی کتابوں میں پڑھتا ہوں کہ رسول اللہؐ کے کسی فیصلہ کو ان کے کسی نام نہاد جانشین نے منسوخ کر دیا یا حضورؐ کے کسی حکم کو بدل دیا تو مجھے حیرت ہوتی تھی کہ شارع حضورؐ کی ذات ہے یا فلاں خلیفہ کی؟ حدیث و تفسیر کی تمام معتبر کتابوں میں عمر ابن خطاب کے فضائل کے باب میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ اسلام نے زکوٰۃ کے سلسلہ میں جن آٹھ طبقوں کو مستحقین کے زمرہ میں شامل کیا ہے حضرت عمر نے ان میں سے ایک طبقہ کو مستحقین کی فہرست سے خارج کر دیا۔ یہ "مولفۃ القلوب" کا وہ گروہ تھا جو نیا نیا اسلام کا حلقہ بگوش ہوا ہو۔ حضرت عمر نے اپنے اجتہاد و قیاس سے کام لیکر نومسلموں کے اس حق کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ اب جبکہ اسلام ایک طاقت ور تحریک بن چکا ہے ہمیں کیا ضرورت ہے کہ لوگ اسلام کے دائرہ میں داخل ہوتے رہیں۔

اگر قرآن پاک کلام خداوندی ہے اور عمر ابن خطاب بھی اسے ایسا ہی سمجھتے تھے تو کیا وہ اپنی حدود کار سے واقف نہیں تھے اور کیا انہیں اتنا شعور بھی نہیں تھا کہ کلام الٰہی کے حکم یا قانون کو تبدیل کرنے کا پیغمبر بھی مجاز نہیں ہے۔ کیا وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ قرآن کے تمام قوانین دائمی اور ابدی ہیں۔ اور قوموں کے عروج و زوال یا ضعف و کمال سے انہیں بدلا جا سکتا ہے۔ کیا وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر سے بھی زیادہ فطرت انسانی کے محرم تھے اور آخر ان کی حیثیت کیا ہے۔ کیا وہ شارع تھے۔ کیا انہیں دستور سازی کا اختیار تھا۔

آج کل جماعت اسلامی والے اور ان کی دیکھا دیکھی دوسرے علمائے اہلسنت صبح و شام یہ کہتے نہیں تھکتے کہ قرآن کے کسی حکم میں رد و بدل نہیں کیا جا سکتا، وہ اٹل اور محکم وحی ہے۔ ان کے عقائد کی کتابوں میں بھی یہ بات بڑی وضاحت کے ساتھ مذکور ہے۔ لیکن عمر ابن خطاب کا حوصلہ دیکھیئے کہ وہ جس چیز کو چاہیں حلال قرار دیں اور جسے چاہیں حرام ٹھہرا دیں۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اور اس پر الزام ہے تو شیعوں پر کہ وہ قرآن میں تحریف کے قائل ہیں۔

تحریف صرف الفاظ میں تبدیلی کا نام نہیں ہے۔ معانی میں گڑبڑ کرنا اور کسی حکم کو معطل کر دینا بھی تحریف کی بدترین صورت ہے۔ احکامِ قرآنی میں حضرت عمر کی جانب سے تحریف کی یہ کوئی ایک مثال نہیں ہے۔ انہوں نے ایسی بہت سی حرکتیں بھی کیں جن سے فرامینِ خدا اور رسول کی نفی ہوتی تھی ان میں سے ایک مسئلہ "متعہ" کا بھی ہے جسے اہلِ سنت نے بغیر سوچے سمجھے اور بلاوجہ اپنی خباثتِ نفس کا ایک نشانہ بنا لیا ہے۔ حالانکہ ایک پاکیزہ اور با اخلاق معاشرہ میں مطلقہ یا بیوہ عورتوں اور شادی کی ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برآنہ ہونے والے افراد کے جنسی تقاضوں کی تکمیل کی یہ ایک بہت عمدہ متبادل صورت

تھی۔ قرآنِ مقدس نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد ہمایوں میں اس کی عام اجازت تھی لیکن حضرت عمر نے اس کی مخالفت کا نادر شاہی فرمان جاری کر دیا۔

فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں وضاحت کی ہے کہ آغاز اسلام میں اس کے جواز پر سب متفق ہیں۔ البتہ بعض روایت میں ہے کہ غزوہ خیبر کے موقع پر جواز متعہ کا حکم منسوخ ٹھہرا لیکن وہ کون سی آیت میں ہے اس کا ذکر یار لوگ گول کر گئے۔ بیشتر روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر اور حجۃ الوداع کے زمانے میں حضورؐ نے متعہ کی اباحت کا ذکر فرمایا اور اس کی اباحت برقرار رکھی اب یہ کیونکر ممکن ہے کہ منسوخ کرنے والا حکم پہلے آئے اور اس کی مشروعیت کا اعلان بعد میں بھی ہوتا رہا ہے۔ اس خالصتہً دینی مسئلہ پر بھی خلیفۂ دوم نے بلا جواز ٹانگ اڑائی اور منبر پر چڑھ کر اعلان کیا کہ متعہ کی اجازت واپس لی جاتی ہے۔

ذرا اس ساختہ جانشین پیغمبر کے تیور ملاحظہ ہوں معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی اس پر وحی آسمانی کا نزول ہوتا رہا ہے۔ ذرا دستی ایں کوتہ آستیناں ہیں۔

متعتان کانتا مشروعتین فی عهد رسول الله (صلی الله علیه وآله وسلم) وانا انهی عنهما متعة الحج ومتعة النكاح۔"

"حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں دو متعہ جائز تھے۔ متعۂ حج اور متعۂ نکاح اور اب میں ان دونوں کی ممانعت کا حکم صادر کر رہا ہوں۔"

کوئی ان حضرت سے پوچھے کہ آپ کون ہوتے ہیں۔ قرآن کے ایک حکم کو منسوخ کرنے والے اور آپ کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ آپ پیغمبر علیہ وآلہ السلام کے فیصلہ پر خطِ تنسیخ کھینچ دیں ——— ایاز قدر خود بشناس ———

دوسروں کا حق غصب کر کے اور زور زبردستی سے مسند خلافت پر قبضہ جمالینے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ آپ کو پیغمبری کے اختیارات مل گئے ہیں کہ آپ احکامِ شریعت میں

دخل در معقولات کرنے لگے۔ بندہ پرور مگر خدا شدہ ای۔ ! مشہور صحابی حضرت عمران بن حصین نے خوب حضرت عمر کی اس "دخل در معقولات" کی حکمت عملی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:۔

ان اللہ انزل فی المتعہ ایۃ ومانسخھا بایۃ اخری و امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بالمتعۃ ومانھانا عنھا ثم قال رجل برایہ ماشاء

اللہ تعالیٰ نے متعہ کے جواز کے بارے میں ایک آیت نازل کی اور کسی دوسری آیت کے ذریعے اسے منسوخ نہیں فرمایا حضورؐ نے بھی ہمیں اس کی اجازت دی اور کبھی اس سے منع نہیں فرمایا۔ پھر ایک شخص اٹھا اور اپنی رائے سے اس میں تبدیلی کر دی۔

شرح معانی الآثار میں حضرت عبداللہ ابن عباس سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا:

ماکانت المتعۃ الارحمۃ رحم اللہ بھاھٰذہ الامۃ ولولا نھی عمر بن الخطاب لمازنی الاشقی۔

متعہ کے جواز کا حکم ایک خصوصی نوازش تھی جس سے اللہ تعالیٰ نے اس امت کو نوازا تھا اور اگر عمر ابن الخطاب نے اس کی ممانعت نہ کر دی ہوتی تو سوائے کسی انتہائی بدبخت شخص کے کوئی بھی زنا کے جرم کا مرتکب نہ ہوتا۔

قرآنِ مقدس کے پانچویں پارے کی پہلی آیت سے متعہ کا اثبات ہوتا ہے۔ علمائے امت کا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ قرآن کی آیت کو صرف قرآن ہی کی کوئی آیت منسوخ کر سکتی ہے۔ حدیث سے قرآن کے کسی حکم پر خط نسخ نہیں کھینچا جا سکتا۔ خود قرآن نے بھی جہاں نسخ آیات کا ذکر کیا ہے وہاں تصریح کی ہے۔

ماننسخ من ایۃ اوننسھا نات بخیر منھا او مثلھا

ہم جب کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا اسے حافظہ سے محو کرتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی کوئی دوسری آیت اس کے بدلے میں لے آتے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ آیت قرآنی کو آیتِ قرآنی ہی منسوخ کر سکتی ہے لیکن یہاں "خلیفۂ راشد" قرآن کے احکام پر ہاتھ صاف کر رہا ہے اور الٹا تحریف کا الزام شیعوں پر لگایا جاتا ہے جو اپنے آئمہ معصومین کو بھی جن کا مرتبہ و مقام حضرت عمر سے کہیں افضل و اعلیٰ ہے یہ حق نہیں دیتے کہ وہ کسی حکم خداوندی کو اپنی رائے اور مرضی سے منسوخ کر دیں۔

ایک سُنّی عالمِ دین نے مجھ سے فرمایا: "متعہ کے جواز سے مسلمانوں کے معاشرہ میں جنسی انارکی پھیلتی ہے" اس نقطۂ نگاہ سے بھی اس پر پابندی عائد ہونی چاہیئے۔ اسی سلسلے میں انہوں نے قرآنِ مقدس کی اس آیت سے استناد کیا: والذین ہم لفروجہم حافظون الا علی ازواجہم او ما ملکت ایمانہم (اہلِ ایمان وہ ہیں جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں بجز اپنی بیویوں اور ان عورتوں کے جنھیں انھوں نے مال کے عوض حاصل کیا ہو۔)

ان کے استدلال کا مدعا یہ تھا کہ اس آیت میں صرف بیویوں اور لونڈیوں سے جنسی روابط رکھنے کی اجازت ہے، اس کے علاوہ اگر کسی جگہ جنسی تعلق قائم کرنے کی اجازت ہوتی تو اس کا ذکر ضرور ہوتا۔

میں نے ان سے کہا: کیا لونڈیوں کی خرید و فروخت اور ان سے جنسی روابط قائم کرنے سے جنسی انارکی نہیں پھیلے گی اور پھر "ما ملکت ایمانہم" سے آپ صرف لونڈیاں ہی کیوں مراد لیں، ممتوعہ عورت بھی تو اس زمرہ میں شامل ہے اور بالفرض اس سے مراد صرف لونڈیاں اور باندیاں ہیں تو جو قباحت آپ کو متعہ میں نظر آتی ہے لونڈیوں کے کاروبار میں تو بدرجہ اولیٰ یہ قباحت موجود ہے۔ اس پر وہ لاجواب ہو گئے پھر کچھ سوچ کر فرمانے لگے۔ "میں لونڈیوں کے مسئلے سے بھی مطمئن نہیں ہوں۔

میں نے کہا تو صاف صاف کہیئے کہ آپ کو شریعت اسلام اور احکامِ خداوندی کے بارے میں بے اطمینانی ہے اور اس بے اطمینانی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ آپ ان حکمتوں اور

مصلحتوں سے بیخبر ہیں جو اسلام نے جنسی جذبات کو قابو میں رکھنے کے لیے اختیار کی ہیں۔

شبلی نعمانی نے الفاروق میں اوّلیات عمر کی پوری ایک فہرست گنوائی ہے اور اس فہرست میں ان کے وہ کارنامے درج کئے ہیں جن کا عہد رسالت میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ جہاں تک ملکی نظم ونسق اور سیاسی تدابیر کا تعلق ہے حکمران کو از خود فیصلے کرنے کا اختیار حاصل ہے لیکن شریعت کے احکام میں ردّوبدل کرنا یا خدا رسول کے واضح ارشادات کے مقابلہ میں اپنے قیاس و اجتہاد کو فوقیت دینا ایک ایسی ناروا جسارت ہے جس کی گنجائش اسلامی تعلیمات کی رو سے ہرگز نہیں ہے۔ نہ ابوبکر وعمر کے لیے نہ عثمان کے لیے۔ نہ امام الائمہ سیدنا علی علیہ السلام کیلئے۔

لیکن اہلِ سنت کے ہاں دین کی تمام تر بنیاد ہی قیاس آرائی پر مبنی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے بیسیوں امام ہیں اور ان کی بھانت بھانت کی بولیاں ہیں۔ ایک کے نزدیک ایک شے حلال ہے، دوسرے کے نزدیک وہی شے حرام ہے۔ ایک امام ایک چیز کو جائز قرار دیتا ہے، دوسرا اسے ناجائز، تیسرا مکروہ۔

ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ جب خلیج فارس کے مشہور جزیرے مسقط پہنچا تو وہاں اس نے جگہ جگہ کتّوں کا گوشت ٹنگا دیکھا۔ اسے سخت تعجب ہوا اور جب اسے بتایا گیا کہ اس بستی کی بیش تر آبادی امام مالک کے مقلّدین کی ہے اور مالک کے نزدیک کُتّے کا گوشت حلال ہے۔ اب بات سمجھ میں آئی۔

گویا سنیوں کے ایک امام اور اس کے پیروکاروں کے نزیک کُتّے کا گوشت بھی ماکولات میں شامل ہے ــــــ بریں مژدہ گر جاں فشاں نم رواست ــــــ

جلال الدین سیوطی نے جو مشہور محدّث، مفسر اور نویں صدی ہجری کا امام و مجدّد مانا جاتا ہے اس نے امام مالک کے ایک رسالہ کی تلخیص کی ہے اور لواطت و اغلام بازی کو امام مالک کے نزیک مجرّد شخص کے لیے جائز قرار دیا ہے اور بہ ایں وضاحت کہ کسی امرو یعنی

بے ریش اور نوخیز لڑکے کے ساتھ یہ فعلِ بد مباح ہے۔ گویا اس شرمناک فعل کو جس کی بنا پر قرآنِ مقدس کی رو سے ایک پوری قوم کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دیا گیا۔ ایک امام اہلسنّت نے صرف روا رکھا بلکہ وہ بھی نوخیز و نوعمر لڑکے کے ساتھ۔ سیوطی نے اس کے استشہاد میں یہ شعر بھی نقل کیا ہے ؎

وجوز وا وطی غلام امرد

لاسیما للرجل المجرد

بے ریش اور نوخیز لڑکے سے مباشرت کو جائز قرار دیا ہے اس شخص کے لیے جو مرد مجرد ہو یعنی بیوی پاس نہ ہو۔

اب اس قسم کے قیاسات و اجتہادات کی بات چل نکلی ہے تو مشتے نمونہ از خروارے چند دیگر اجتہادات ملاحظہ فرمائیں۔ اقبالؔ نے کہا تھا ؎

زاجتہاد عالماں کم نظر اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

امام ابو حنیفہ (امام اعظم) کے نزدیک چھبیس ۲۶ قسم کی شراب جائز ہے۔

امام اعظم کے نزدیک شراب سے بھی وضو جائز ہے اور دودھ کی لسّی سے بھی جب کہ اہلسنّت کے دوسرے تین امام اس کے خلاف ہیں۔ امام شافعی کے نزدیک اجنبی اور نامحرم عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے حنفیوں کے نزدیک نہیں ٹوٹتا۔ مالکیہ کے نزدیک اگر اجنبی عورت کے لمس میں شہوت کی آمیزش ہو تو وضو ٹوٹ جائے گا ورنہ نہیں۔

شافعی کے نزدیک زنا کے نتیجہ میں اگر حمل قرار پائے اور لڑکی پیدا ہو تو باپ اس لڑکی سے نکاح کر سکتا ہے۔ باقی تین امام اس کے مخالف ہیں۔

حنفیوں کے نزدیک بدن سے تھوڑی مقدار میں خون نکلنے پر بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے دوسروں کے نزدیک نہیں ٹوٹتا۔ انگلی پر نجاست لگی ہو اور اسے چاٹ لیا جائے تو امام ابو حنیفہ کے نزیک انگلی پاک ہو گئی۔

شافعی کے نزدیک لومڑی اور بجو وغیرہ کا گوشت حلال ہے۔ باقی امام اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ گویا شریعت نہ ہوئی بازیچۂ اطفال ہوا کہ اگر عمر ابن خطاب چاہیں تو وہ اس میں اپنی مرضی سے رد و بدل کر دیں اور اگر ابوحنیفہ اور ان کے چھٹ بھیے اٹھیں تو وہ اپنے قیاس کے گھوڑے دوڑا کر حلال و حرام کے فیصلے صادر کرتے پھریں۔

قرآنِ مقدس نے بہت پہلے سے تنبیہ کر دی تھی کہ حلّت و حرمت اشیاء پر رائے زنی کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہے بجز خدا اور رسول کے :-

ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھذا حلال وھذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب ان الذین یفترون علی اللہ الکذب لا یفلحون۔

"اور تم جھوٹ بول کر یہ مت کہو کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں چیز حرام ہے یوں اللہ پر بہتان باندھتے پھرو، جو لوگ خدا پر بہتان باندھ کر اپنا الو سیدھا کرتے ہیں وہ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتے۔

شیعی عقائد و اعمال پر تنقید اہلِ سنّت کے کم سواد علماء کا معمول ہے اور یہ تنقید محض جہالت و تعصب پر مبنی ہوتی ہے۔ اس میں نہ کسی علمی استدلال سے کام لیا جاتا ہے، نہ معقولیت سے، محض جھوٹا پروپیگنڈا ان کا مقصد ہوتا ہے اور اس کے ذریعے وہ اپنے جاہل عوام کو شیعیت سے متنفر کرنے اور مسلک تشیع کو زک پہونچانے میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ ان مسائل میں جو سُنّی مولویوں کی مناظرانہ افتادِ طبع انصباطی نشانہ بنتے ہیں ایک مسئلہ "بدا" کا ہے جس کے بارے میں سُنّی علماء کہتے ہیں کہ "بدا" کا مفہوم یہ ہے کہ جہل و بے خبری کی نسبت خدا کی جانب کی جائے۔ لیکن سُنّی علماء جس طرح قرآن پاک میں تحریف کا مشغلہ اپنائے ہوئے ہیں جس طرح انہوں نے فقہ اور احکام شریعت کو اپنے خود ساختہ خلیفوں اور اماموں کے ذریعے بدلنے سے گریز نہیں کی وہاں اسی فطرتِ بد کی بدی کی بدولت وہ شیعی عقائد و اعمال پر زباں طعن دراز کرنے سے بھی باز نہیں رہتے۔ یہ گویا ان کے فرائض منصبی کا حصہ ہے۔

"بدا" کا مفہوم بہت سیدھا سادہ اور غیر مبہم ہے اور شیعہ عقائد کی مستند کتابوں میں اس کی جو تشریح ملتی ہے اس کے بموجب"

احکام الٰہی میں بدا کی وہی حیثیت ہے جو آیاتِ قرآنی میں نسخ کی ہے۔ اگر آیات منسوخ ہونے سے خدا پر جہل کا الزام عائد نہیں ہوتا تو کسی حکمِ شریعت کو واپس لینے سے اس پر جہل کا الزام کیسے لگ سکتا ہے۔ مگر ایک جھوٹا پروپیگنڈا ہے جو مسلسل کیا جا رہا ہے اور خدا و رسول کے نام پر لگاتار جھوٹ بولا جا رہا ہے۔ کبرت کلمة تخرج من افواههم ان يقولون الا كذبا۔

(اسی قسم کا معاملہ "تقیہ" کا ہے کہ علمائے سوء کی زہر آلود زبانیں تقیہ کو ہدف تنقید و ملامت بنائے ہوئے ہیں اور اسے نفاق کے ہم معنی قرار دیکر شیعہ حضرات پر منافق کی پھبتی کسی جاتی ہے حالانکہ تقیہ کا مفہوم وہی ہے جو اہلسنت کے نزدیک "توریہ" کا ہے یعنی مصلحت وقت کی بناء پر یا کسی اندیشہ نقصان کے سبب یا خوف و خطر کے باعث یا دفع ضرر کے لیے بات اس ڈھنگ سے کی جائے کہ مخالف کی ایذا رسانی سے بچا جا سکے۔ بخاری میں یہ روایت موجود ہے کہ "لم یکذب ابراهیم الا ثلاث کذبات ابراہیم علیہ السلام نے زندگی میں صرف تین جھوٹ بولے۔ تعجب ہے کہ بخاری اگر حضرت ابراہیمؑ جیسے اولوالعزم پیغمبر کی جانب جھوٹ بولنے کی نسبت کرے تو اسے تو یہ کہہ کر سندِ قبول بخشی جائے کہ یہ "توریہ" تھا۔ اور شیعیان علیؑ میں سے کوئی شخص اگر معاویہ اور اس کی معنوی اولاد کے ظلم و تشدد سے بچنے کے لیے تقیہ کرے تو گردن زدنی۔

قرآن اور حدیث دونوں سے تقیہ کے لفظ و معنی کا سراغ ملتا ہے۔ "الا ان تتقوا منهم تقاة (مگر یہ کہ تم ان سے بچاؤ کی کوئی صورت کر رہے ہو) کی قرآنی آیت اور "شر الناس من يكرم اتقاء شره" (بدترین شخص وہ ہے کہ اس کے شر سے بچنے کے لیے لوگ اس کی عزت کریں) کی حدیث نبوی دونوں سے تقیہ کے جواز کا ثبوت ملتا ہے۔

قرآن مقدس نے تو جبر و تشدد کی صورت میں کلمۂ کفر کہنے کی بھی اجازت دی ہے۔ "الا من اكره وقلبه مطمئن بالايمان" جن کا دل جذبۂ ایمانی سے سرشار ہوا نہیں

کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے تو ان کا یہ مارے باندھے کا جرم قابلِ معافی ہے۔ جو لوگ تقیہ کو منافقت سے تعبیر کرتے ہیں ان کے نزدیک "توریہ" کا مفہوم کیا ہے۔ جن لوگوں کا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہو کہ" دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز" (فتنہ پیدا کرنے والی سچائی سے مصلحت آمیز جھوٹ بہتر ہے) وہ تقیہ کے معاملے میں شیعوں کو برا بھلا کہیں تو ان عقل کے اندھوں سے یہی کہا جاسکتا ہے کہ

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت　　　دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

اور پھر جو لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہوں کہ خدا بھی جھوٹ بول سکتا ہے انہیں کسی انسان کے تقیہ کرنے پر اعتراض کیوں ہو۔

تقیہ ایک ایسا عمل ہے جس کا صدور ہر شخص سے ہوا ہے اور ہوتا ہے اور یہ ہے کہ ہر شخص دوسروں کے گریبانوں میں جھانکنے کی بجائے خود اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھے۔ قرآنِ مقدس نے" مومن آل فرعون" کا ذکر کیا ہے اور اس صفت کے ساتھ

وہ اپنے ایمان کو فرعون سے چھپائے ہوئے تھا)

کیا ان کی کیفیت کو دفع ضرر کے لیے اہلِ باطل سے پوشیدہ رکھنا تقیہ نہیں ہے؟ پھر جس بات کی توثیق قرآن کر رہا ہو آپ کو اس پر ناک بھوں چڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔

جب تک شیعیت کا قریب سے مطالعہ نہیں کیا تھا شیعہ مسلک کی ہر بات انوکھی اور نرالی لگتی تھی حتیٰ کہ شیعوں کی نماز بھی عجیب محسوس ہوتی تھی مگر اب جبکہ حقائق زیادہ واضح شکل میں نظر آرہے ہیں تو محسوس ہوا کہ شیعوں کے ہاں جو نماز رائج ہے اس سے بہتر اور جامع نماز کا تصور ممکن ہی نہیں۔ یہی اصل نماز ہے اور سنتِ نبوی کے عین مطابق بھی۔

اہلِ سنت کے تین اماموں مالک، شافعی، احمد بن حنبل کے ہاں رفع یدین حدیث سے ثابت ہے اور وہ اس پر عمل پیرا ہیں۔ فقہ جعفریہ کی رو سے بھی ہر تکبیر کے وقت رفع یدین یعنی دونوں ہاتھوں کو بلند کرنا مسنون ہے۔ امام اہلسنت مالک بن انس کے

نزدیک ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھی جاتی ہے۔ امام مالک کی فقہ کو "فقہ مدینہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی جس پر اہلِ مدینہ عامل تھے۔ فقہ جعفریہ میں بھی "ارسال یدین" یعنی ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھنے کا حکم ہے۔

البتہ فقہ جعفریہ کی نماز کو جو چیز اہلِ سنّت کی نمازوں سے ممتاز و ممیز کرتی ہے وہ محمدؐ و آلؑ محمدؐ پر نماز میں صلوٰہ وسلام کی کثرت ہے کہ ان کے ہاں رکوع وسجود میں تسبیح و تحمید کے بعد ہر تشہد میں اور ہر دعا کے بعد

کہنا ضروریات نماز میں سے ہے اور اس طرح نمازی جہاں خدا کے ساتھ اپنا رابطہ استوار کرتا ہے وہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی آل اطہار کی ذوات مقدسہ بھی اس کے پیشِ نظر رہتی ہیں۔ اور یہی وہ شرف و امتیاز ہے جو ایک شیعہ نمازی کو دوسرے فرقوں کے نمازیوں پر حاصل ہے۔ وہ اپنی سب سے افضل عبارت کو بھی محمدؐ و آلؑ محمد کے توسل سے خدا کے حضور میں پیش کرتا ہے ؂

گو حرم کے راستے سے بھی پہونچ گئے خدا تک — تری گزر سے جاتے تو کچھ اور بات ہوتی

کی جو کیفیت اس نماز میں پائی جاتی ہے وہ کسی اور کو کہاں نصیب، یہ کیفیت اس امر کی غماز ہے کہ نماز پڑھنے والے کو جہاں اپنے پروردگار سے عجز و نیاز کا تعلق ہے وہاں نماز کا حکم دینے والے پیغمبرؐ اور اس کی آل اطہار کو بھی اس نے اپنی نیاز مندیوں میں فراموش نہیں کیا۔

یہ سپاس گزاری و تشکر اور احسان شناسی کا قابل قدر مظاہرہ ہے جس کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ مجھے یہاں دیوبندی مکتب فکر کے اس بدنہاد ملّا کی وہ عبارت اس مرحلے پر یاد آرہی ہے جس نے اپنے خبثِ باطنی کا بدترین مظاہرہ کرتے ہوئے ایک کتاب میں لکھا ہے کہ، "اگر نماز کے دوران گدھے کا خیال آجائے تو نماز نہیں ٹوٹتی لیکن اگر نماز میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خیال آجائے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے۔"

بلکہ مولوی الیاس کی بستر بند پارٹی (تبلیغی جماعت) کے لوگ تو یہاں تک کہنے لگ گئے

ہیں کہ صرف نماز ہی فاسد نہیں ہوتی وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے۔"

اس قسم کے بدنہاد ملاؤں سے اور ان کے دُونِ فطرت معتقدوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اہلِ بیت سے دل بستگی کا اظہار کریں گے ایک سودائے خام ہے۔ ان کو تو صحابہ بھی اسی لیے عزیز ہیں کہ انھوں نے پیغمبرؐ اور ان کی آلؑ سے بغض و عناد رکھا۔

اہلِ سنّت کے نزدیک سب سے افضل درود نماز میں پڑھا جانے والا درود ابراہیمی" ہے اور اس میں محمدؐ و آلؑ محمدؐ علیہم السلام دونوں پر صلوٰۃ و سلام بھیجا گیا ہے لیکن حضورؐ کے نام نامی و اسم گرامی کے ساتھ یہ لوگ تحریری طور پر یا زبانی صرف صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں۔ ان کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے "وآلہ کے لفظ کو چودہ سو برس سے متروک قرار دے رکھا ہے۔ حالانکہ" صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم" کہنا موزوں بھی ہے اور درودِ ابراہیمی کے مطابق بھی بجز شیعیان علیؑ کے اس دھرتی پر اور کوئی گروہ نہیں جو محمدؐ و آل محمدؐ علیہم السلام دونوں پر صلوٰۃ و سلام کا التزام کرتا ہو انہی کے مقدّر کا طرۂ امتیاز ہے۔

عبداللہ بن زبیر کے متعلق تاریخ وسیر کی کتابوں میں یہ شرمناک واقعہ مذکور ہے کہ اس نے اپنے چند روزہ دورِ اقتدار میں حضور نبی اکرمؐ پر صلوٰۃ و سلام کا سلسلہ روک دیا تھا اور اس کی صفائی میں یہ دور کی کوڑی لایا تھا کہ :— لایمنعنی من ذکرہ الا ان تشمخ رجال بانافہا۔ (ابن ا کلبی واقدی) (مجھے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام سے صرف یہ چیز روکتی ہے کہ اس سے کچھ لوگوں کی ناک اونچی ہو جاتی ہے۔") اس کا اشارہ بنو ہاشم کی جانب تھا۔

اس قسم کے احسان فراموش اور ناسپاس لوگ اہلسنّت کے حضرات ہیں اور بڑے حضرت ہوں یا چھوٹے سب ایک ہی تھیلی کے چٹّے بٹّے ہیں۔ بڑے میاں سو بڑے میاں

چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ مجھے یقین ہے کہ پیشہ ور مولویوں کو چھوڑ کر اہلِ سنّت کے عوام کو اگر یہ بات ذہن نشین کرائی جائے کہ ان کے ان حضرتوں نے حضورؐ کے بارے میں کس قدر سرد مہری، بے مروتی اور احسان ناشناسی کا ثبوت دیا ہے تو وہ عقیدت کے ان خود تراشیدہ بتوں کو خود اپنے ہاتھوں توڑ ڈالنے میں ذرا بھی تامل نہیں کریں گے۔ کیا یہ ایک حیران کن بات نہیں ہے کہ اہلِ سنّت صدیوں سے اپنی نمازوں میں درود ابراہیمی پڑھ رہے ہیں اور اہلسنّت کے ایک امام شافعی کے نزدیک نماز پر تشہد کے بعد درود پڑھنا واجبات میں سے ہے لیکن اس کے باوجود کبھی ان کا ذہن اس جانب منتقل نہیں ہوتا کہ درودِ ابراہیمی میں جب ہم خدا سے یہ استدعا کرتے ہیں کہ: "اے خدا محمدؐ آلِ محمدؐ پر اسی طرح رحمت و برکت نازل فرما جیسی رحمت و برکت سے تو نے ابراہیمؑ و آلِ ابراہیمؑ کو نوازا" و آلِ ابراہیمؑ کے بارے میں قرآن شہادت دیتا ہے کہ

قد اتینا اٰل ابرھیم الکتاب والحکمۃ واٰتینٰھم ملکا عظیماً۔

(ہم نے آلِ ابراہیمؑ کو کتاب و حکمت عطا کی اور ہم نے انہیں بہت بڑی سلطنت سے نوازا اور سرفراز کیا۔)

نمازوں میں درودِ ابراہیمی پڑھنے کے باوجود آلِ محمدؐ کے ساتھ ہمارا برتاؤ کیا رہا کہ ہم نے آلِ محمدؐ کی امامت و پیشوائی کو تسلیم کیا نہ انہیں حکمرانی کے قریب پھٹکنے دیا نہ انھیں وہ عزت و تکریم دی جس کے وہ مستحق تھے۔

گلہ جفائے وفا نما جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بت کدے میں بیاں کروں تو صنم پکاریں ہری ہری

ہم نے جولاہوں، موچیوں، تیلیوں، حلوائیوں اور مجہول النسب لوگوں کو تو اپنا امام قرار دیا لیکن آلِ محمدؐ کے ائمہؑ کے نام تک نہیں معلوم ہیں۔ ہم نے دشمنانِ آلِ محمدؐ کی حکمرانی کو تو خلافتِ راشدہ سے تعبیر کیا، آلِ محمدؐ کے خون سے ہاتھ رنگنے والوں کو سر آنکھوں پر بٹھایا حتیٰ کہ ہم نے حضورؐ کے بارہ جانشینوں میں معاویہ، یزید، مروان اور اس

کے بیٹوں تک کو شامل کیا (حوالہ کے لیے دیکھیے ملا علی قاری کی شرح فقہ اکبر) لیکن آلِ محمدؐ علیہم السلام کو دینے کے لیے ہمارے پاس کوئی منصب و مقام نہیں ہے لیکن درودِ ابراہیمی پڑھنے کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ قول و فعل میں یہ دو رنگی اور گفتار و کردار میں کھلا تضاد نہ جانے کب دور ہوگا اور کب ان لوگوں کی آنکھیں کھلیں گی۔ شیعہ فقہ جعفریہ کے مطابق "تسمیہ" یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی بلند آواز سے پڑھتے ہیں اور اسے نماز میں سنن واجبہ میں سے شمار کرتے ہیں۔ تفسیر کبیر میں فخرالدین رازی نے اس پر بحث کرتے ہوئے صاف صاف لکھا ہے کہ اس سنّت ثابتہ کو معاویہ نے اپنے دورِ اقتدار میں محض اس بناء پر منسوخ کر دیا کہ یہ عمل امیرالمومنین سیدنا علیؑ کے معمولات میں سے تھا اور جناب امیرؑ کا یہ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے عین مطابق تھا مگر معاویہ نہیں چاہتا تھا کہ امیرالمومنینؑ کے آثارِ خیر میں سے کوئی عملِ خیر بھی باقی رہے جس سے دلوں میں ان کی یاد تازہ ہو اس لیے اس نے جہر بالتسمیہ پر پابندی عائد کر کے دل کی بھڑاس نکالی۔ یہ شخص امیرالمومنین کی دشمنی میں اس قدر اندھا ہو گیا تھا کہ اس کا بس چلتا تو وہ ہر عملِ خیر کی راہ مسدود کر دیتا۔

شیعیانِ علیؑ کے بارے میں ماتم گساری کی رسم پر بہت لے دے کی جاتی ہے۔ عزا کی مجالس، ماتمی جلوس، سینہ کوبی، اشک افشانی اور اسی قبیل کے دیگر ماتمی مظاہروں کو ہدفِ تنقید و ملامت بنایا جاتا ہے اگرچہ صرف ایک شعر سے اس کا جواب دیا جا سکتا ہے ؎

نمی دانم ز منع گریہ مطلب چیست واعظ را
دل از من دیدہ از من اشک از من آستیں از من

جن لوگوں نے ایوب خاں اور پھر بھٹو کے خلاف احتجاجی مظاہروں کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، یا دوسرے ملکوں میں جہاں کہیں بھی ظالم

حکمرانوں کے خلاف مظلوموں نے اپنی نفرت و حقارت کا اظہار کیا ہے بلا استثنائے مذہب و ملت احتجاج کے لیے ہر جگہ سینہ کوبی کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ پھر ظلم کی نوعیت جتنی زیادہ سنگین ہوگی سینہ کوبی اور ماتم گساری کا رنگ اتنا ہی گہرا ہوگا اور اشک ریزی و چاک دامنی کا سلسلہ اتنا ہی دراز ہوگا۔ آل محمد علیہم السلام پر دشتِ کربلا میں جو شرم ناک مظالم روا رکھے گئے اس کے خلاف احتجاج کا یہ سلسلہ صدیوں سے جاری و ساری ہے اور ظلم کی سنگین نوعیت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ پیغمبرِ اسلام کے جگر گوشہ اور لختِ جگر کو ان کے فرزندوں، بھائیوں اور بھتیجوں سمیت ذبح کر دیا گیا اور خانوادۂ نبوت کی مخدرات عصمت کو سرِ عام رسوا کیا گیا۔

یہ وہ بھیانک ظلم ہے کہ اس کے خلاف احتجاج کی یہ رسم رہتی دنیا تک جاری رہنی چاہئے اور ظالموں پر لعنت کا یہ سلسلہ قائم رکھنا ضروری ہے۔ اسلام ظالموں کے استیصال اور مظلوموں کی حمایت کا سب سے بڑا علم بردار ہے۔[1]

---

[1] کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ اس دورِ تہذیب و تمدن میں جبکہ جمہوری حقوق اور حقوقِ شہریت کا چرچا عام ہے اور حکومتی یا عوامی سطح پر کئے جانے والے معمولی ظلم کے خلاف پوری دنیا میں ہاہاکار مچ جاتی ہے۔ تاریخ اسلامی کے پہلے تین خلفاء اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے اموی اور عباسی خلفاء کے مظالم پر ہم یوں پنبہ دہن اور مہر بلب ہو جاتے ہیں گویا ان حضرات کو ظلم و ستم کی کھلی چھوٹ ملی ہوئی تھی۔ اس کا ایک بہت برا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اب پوری دنیا میں یہ تاثر عام ہے کہ اسلام اور جمہوریت اسلام اور شہری حقوق، اسلام اور آئینی اقدار کبھی یکجا نہیں ہو سکتے اس کا سہرا ہمارے ان نام نہاد خلفاء کے سر ہے۔ جن کا دور جبر و استبداد کا بدترین دور رہا ہے۔ آج کل "ایمنیسٹی انٹرنیشنل" اور اسی نوع کے دیگر ادارے قائم ہیں جو دنیا بھر کے (باقی حاشیہ ص پر)

غم زندگی کا سب سے بڑا پائیدار قدر ہے۔ جگر نے کہا تھا ؎

خوشی میں بھول نہ جانا جگر یہ رازِ حیات
کہ جو خوشی ہے یہاں اک امانت غم ہے۔

اور غم خواہ غم جاناں ہو، یا غمِ دوراں ہر صورت میں زندگی کو دل گداز اور رقت انگیز بنا دیتا ہے۔

دنیا میں بحیثیت ایک جماعت یا گروہ کے اگر کسی فرقے نے غم کو اپنا لازمۂ حیات بنایا ہے تو وہ صرف شیعیانِ علی علیہ السلام کا گروہ ہے جس نے غم حسینؑ سے اپنا رشتہ کچھ اس طرح جوڑا کہ ان کے ہاں خوشی کی تقریب ہو یا ماتم کا موقعہ وہ صرف حسینؑ کے ماتم سے اپنے دلوں کی دنیا آباد رکھتے ہیں۔

؏ "بنا لیا ہے ترے غم کو جاوداں میں نے"، کی جو کیفیت ہر شیعہ اپنے دل میں محسوس کرتا ہے اس کی لذتوں سے وہ لوگ کیونکر باخبر ہو سکتے ہیں جو معاویہ مروان و

(بقیہ حاشیہ صـــ) ملکوں پر کڑی نظر رکھتے ہیں کہ جہاں انسانی حقوق کی پامالی کا کوئی سنگین واقعہ پیش آئے اس کے خلاف آواز بلند کریں۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ خلافت راشدہ کے تین خلفاء اور ان کے بعد دورِ بنی امیہ و بنی عباس کے حکمرانوں کے مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے تاریخ اسلام کے آغاز ہی سے ایک ایسا زبردست ادارہ قائم ہوا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ شیعیان علی کا ثابت قدم گروہ تھا جس نے اسلامی تاریخ کے ظالم حکمرانوں کی بدعنوانیوں کے خلاف ہمیشہ صدائے احتجاج بلند کی۔ اس اعتبار سے مسلک شیعیت دنیا کا پہلا ادارہ ہے جس نے ظلم کے خلاف، جبر کے خلاف، استبداد کے خلاف اور غصبِ حقوق کے خلاف اور غصب حقوق کی ہر کوشش کے خلاف بڑے منظم طریقے پر آواز بلند کی اور لب و قلم کو جنبش اضطراب بخشی۔

یزید جیسے بدنہاد ظالموں کا جشن ولادت مناتے اور یوں ظالموں کی فہرست میں اپنا شمار کراتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لختِ جگر کی مظلومیت کا غم و ماتم شیعیانِ علیؑ کا سب سے بیش قیمت سرمایہ ہے اور وہ اس سرمایہ کو حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں کہ اس سے ان کی دنیا بھی سنورتی ہے اور اسی سے ان کی عاقبت بھی سنوار دی گئی ہے۔ فانی بدایونی نے خوب کہا تھا ۔

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول ۔۔۔ تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

باقی رہا شیعیان کرام کے ہاں علم لہرانے، تابوتِ سکینہؑ کا جلوس نکالنے ذوالجناح کے اہتمام اور تعزیے کی رسوم کی ادائیگی کا معاملہ تو یاد رکھیے کہ اسلام "تمثال" کا مخالف ہے۔ تمثیل کا نہیں۔ ہمارے سُنّی علماء کو اب تک تمثال اور تمثیل کا فرق ہی نہیں معلوم ہوا۔ اسلام بت پرستی کے ہر مظاہرے سے ناخوش ہوتا ہے اور بُت سازی و بُت گری یہ ہے تمثال، اور کسی واقعہ کو ڈرامائی شکل دے کر اس کی یاد برقرار رکھنا یہ ہے تمثیل اور تمثیل بہت سے اسلامی احکام کی جان ہے۔ صفا اور مروہ کی دو پہاڑیوں کے درمیان دوڑنے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ بذاتِ خود کوئی مقصود بالذّات عبادت نہیں ہے بلکہ سیدہ ہاجرہ سلام اللہ علیہا کی اس تگ و دو اور اس اضطراری کیفیت کی ایک ڈرامائی تمثیل ہے جس کا بے ساختہ اظہار ان کی جانب سے اپنے تشنہ لب بچّے کی جان بچانے کی خاطر پانی کی تلاش کے سلسلے میں ہوا۔

صفا مروہ کے درمیان "وسعی" کی یہ رسم اس امر کی واضح علامت ہے کہ اسلام تمثیل کو جائز بلکہ مستحسن قرار دیتا ہے۔ اسی طرح "رمی جمار" (شیطان پر پتھراؤ کرنا) بھی اسی ڈرامائی تمثیل کا ایک حصّہ ہے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے اسماعیلؑ کو قربان گاہ کی جانب لے جا رہے تھے تو شیطان نے انہیں اس ارادے

سے باز رکھنے اور بہکانے کی کوشش کی اور انہوں نے اس کو پتھر مارے اور قربانی کی رسم بھی قربانی اسمٰعیلؑ کی ڈرامائی تمثیل ہے جسے دنیا بھر کے مسلمان ہر سال بڑے اہتمام سے ادا کرتے ہیں۔ حج کے تمام مناسک بھی ایثار و قربانی ابراہیمؑ و اسمٰعیل ہی کی تمثیل ہے بنابریں واقعۂ کربلا کی یاد کو زندہ و پائندہ رکھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ قصۂ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی یاد تازہ رکھنا ضروری ہے کیونکہ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے واقعہ سے معرکۂ کربلا کا واقعہ زیادہ فکر انگیز اور عبرت خیز ہے۔ اقبالؒ نے ٹھیک کہا ہے ؎

غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؑ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

کیا یہ محض اتفاق تھا کہ وادی فرات سے ایک بوڑھا شخص اپنی بیوی اور اکلوتے بچے کو لے کر چلا اور حجاز کی بے آب و گیاہ وادی میں اس نے قربانی و ایثار کی ایسی درخشاں روایت قائم کی کہ نسلِ انسانی کی امامت کا اعزاز اس کے سر بندھا۔

اور پھر تین ہزار برس کی طویل مسافت طے کرنے کے بعد تاریخ نے خود کو دہرایا اب وادی حجاز سے ادھیڑ عمر کا ایک شخص اپنے کنبے کے چھوٹے بڑے سبھی افراد کو لے کر وادئ فرات کے ایک بے آب و گیاہ صحرا میں اترا اور اس نے قربانی و ایثار کی وہ جوت جگائی کہ پوری کائنات ارضی و سماوی اس کی ضیا باریوں سے جگمگا اٹھی اور تب اس کے سر اقدس پر امامت کبریٰ کا وہ لازوال تاج رکھ دیا گیا کہ نیزے کی انی بھی اس مقدس و مطہر سر سے اس تاج کو جدا نہ کر سکی۔ یہ تاج امامت آج اسی کے سر کی زینت ہے اور رہتی دنیا تک اسی کی اولاد امجاد اس کی وارث و امین بنی رہے گی۔ صلوٰت اللہ تعالیٰ وسلامہٗ علیہم وعلیٰ من نبیھم باحسان الیٰ یوم الدین سو ان دونوں واقعات میں جو گہری مماثلت موجود ہے اس کے پیش نظر اگر ذی الحجہ کی دسؔ تاریخ ابراہیمؑ کی عزیمت و ایثار و قربانی کا یادگار تہوار ہے اور ہر سال بڑے اہتمام سے اس کو منایا جاتا ہے تو عاشور محرم کی تابندہ روایت کا باقی رکھنا بھی عین تقاضائے اسلام ہے کہ اوّل بہ آخر نسبتے دارد۔

ایک سوال جو سنی حلقوں میں بڑی شد و مد سے اٹھایا جاتا ہے یہ ہے کہ امیرالمومنین سیدنا علیؑ ابن ابی طالبؑ اگر خود کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے تو انھوں نے اپنے اس حق کے لیے آواز کیوں نہیں اٹھائی اور اس کے لیے کوشاں کیوں نہ ہوئے؟

اس کا ایک جواب تو خود خلیفۂ دوم کے اس مکالمے میں موجود ہے جو اسی کتاب میں کسی دوسری جگہ مذکور ہے۔ یہ دراصل ایک پروپیگنڈہ تھا جو خلیفۂ دوم اور ان کے ساتھیوں نے کر رکھا تھا کہ نبوت کا اعزاز تو بنو ہاشم کو مل چکا اب حکمرانی کا اعزاز اس خاندان کو نہیں ملنا چاہیئے۔ چونکہ یہ پروپیگنڈا کامیاب رہا تھا اور قبائلی طرزِ زندگی میں اس قسم کے بیہودہ پروپیگنڈے کو بڑی آسانی اور تیزی سے فروغ حاصل ہوا۔ اس لیے قبائلِ عرب اس پروپیگنڈے کے زیرِ اثر اس امر پر تقریباً متفق ہو چکے تھے کہ حضرت علیؑ کو حضورؐ کی خواہش کے برخلاف منصبِ خلافت سے دور رکھا جائے۔ لیکن اصل سوال جوں کا توں باقی رہتا ہے کہ جب خلافت پر امیرالمومنینؑ کا حق مسلّم تھا تو قبائلِ عرب کی پروا کیے بغیر امیرالمومنینؑ نے اس حق کی بازیابی کے لیے جدّوجہد کیوں نہ فرمائی۔ اخلاق و محاسن و کمالاتِ انسانی پر جن لوگوں کی گہری نظر ہے اور جو لوگ عظمتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں سے بہ خوبی واقف ہیں وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہوں گے کہ وہ لوگ جنہیں شرفا کی اصطلاح میں مکمل شریف انسان (PERFECT GENTLE MAN) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کا اندازِ زندگی یہ رہا ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کے معاملے میں جتنے فرض شناس، حساس اور پابند اخلاق ہوتے ہیں اپنے حقوق کے بارے میں اُتنے ہی سیر چشم بے غرض اور کریم النفس ثابت ہوتے ہیں۔ امیرالمومنین سیدنا علیؑ کی ذات اقدس و اطہر تو بلندیٔ اخلاق کی اس اعلیٰ و ارفع سطح پر تھی کہ اس سے بلند تر سطح کا تصور بھی ممکن نہیں۔ ہم نے اپنے رو بہ زوال معاشرے میں ایسے بلند و بالا صفات کے حامل لوگ دیکھے ہیں کہ ان کے حقوق غصب کئے گئے اور انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تک نہیں۔ نہ کسی مجلس میں حرف

شکایت زبان پر لائے بلکہ اگر کسی نے اس موضوع پر بات چھیڑی بھی تو انھوں نے موضوعِ سخن بدل دیا۔ فدک کے معاملے میں جو ظاہر ہے امیرالمومنین کا نہیں بلکہ ان کی رفیقۂ حیات کا معاملہ تھا۔ پوری زندگی میں وہ صرف ایک بار لب کشا ہوئے اور وہ بھی ضمناً ایک بات آئی اور نکل گئی۔ بصرہ کے گورنر عثمان بن حنیف کے نام ایک مکتوبِ گرامی میں ہمیں یہ فقرہ ملتا ہے جس سے امیرالمومنین کی شانِ بے نیازی جھلکتی ہے۔ الفاظ یہ ہیں: بلا کانت فی ایدینا فدك من كل ما اظلمت السماء فشحت علیها نفوس قوم وسخت عنها نفوس قوم آخرین (ہاں ایک فدک تھا جسے ہم اپنا کہہ سکتے تھے اس بھری پری دنیا میں، مگر اس کے دینے پر بھی کچھ لوگوں نے بخل سے کام لیا اور کچھ لوگوں نے بے نیازی کی راہ اپنا کر اس سے دست کش ہونے کو ترجیح دی۔)

سو تہذیب و انسانیت کی اعلیٰ اقدار جنھیں جان و مال سے زیادہ عزیز ہوں وہ اپنے حق سے محرومی پر ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ خاموش رہنا اپنی فطری پاکیزگی اور جبلی شرافت کا ناگزیر تقاضا سمجھتے ہیں۔ حضورؐ کے فوراً بعد حالات نے جو رخ اختیار کیا اور صورتِ حال جس طرح بگڑی اس کے پیشِ نظر امیرالمومنینؑ کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اپنے حق کی بازیابی نہیں تھا بلکہ اسلام کا تحفظ اور اس کی بقا کا مسئلہ درپیش تھا جیسا کہ استیعاب اور اصابہ میں امیرالمومنینؑ کے ایک خطبے کے اقتباس سے مترشح ہوتا ہے اور اس لیے امیرالمومنین نے اسلام کے وسیع تر مفاد پر اپنے مفاد کو قربان کر دیا۔ یہ ایک صادق الایمان انسان کا اختیاری عمل تھا جو شعور و آگہی کے فیصلے پر مبنی تھا۔ یہ کوئی اضطراری کیفیت نہیں تھی کہ امیرالمومنین پر بزدلی یا مصلحت کوشی کا الزام عائد کیا جائے۔

نہج البلاغہ میں امیرالمومنین کے خطبات و ارشادات و مکاتیب کا مستند مجموعہ ہے اس میں آپ کا یہ ارشاد موجود ہے کہ:۔

"اگر میں کچھ بولتا تو لوگ کہتے اسے خلافت کی حرص ستا رہی ہے اور اگر

چپ بیٹھا رہتا تو کہتے کہ علی ابن ابی طالبؑ موت سے ڈر گیا حالانکہ علیؑ ابنِ ابی طالبؑ موت سے اتنا ہی مانوس ہے جتنا شیر خوار بچہ اپنی ماں کے پستان سے اور اگر امت میں تفرقہ کا ڈر نہ ہوتا اور یہ اندیشہ لاحق نہ ہوتا کہ دین کا نام و نشان مٹ جائے گا تو میں ضرور اپنے حق کے لیے آواز اٹھاتا اور اس کے حصول کی تگ و دو کرتا۔"

بدنہاد اور دون فطرت حریفوں اور معاندوں اور مخالفوں کا یہ ہمیشہ سے انداز رہا ہے کہ اگر کوئی شریف النفس انسان اپنے غصب شدہ حق کے لیے آواز نہ اٹھائے تو یا تو اس کی خاموشی کو بزدلی پر محمول کیا جاتا ہے یا پھر سرے سے اس کے حق دار ہونے ہی سے انکار کر دیا جاتا ہے اور اہلِ سنّت انہیں دونوں باتوں پر عمل پیرا ہیں۔

خدایا ان لوگوں کو ہدایت کی توفیق ارزانی فرما کہ یہ علی ابن ابی طالبؑ کی عظمت و شرافت سے آگاہ ہو سکیں۔

درِ دِل پہ دستک

سخن سازی اور عبارت آرائی مقصود نہیں ہے۔ صرف احقاقِ حق اور ابطال باطل کا پیشِ نظر ہے —— شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات —— یہ حریفانہ کشمکش کی کوئی داستان نہیں ہے۔ یہ مناظرے کا کوئی اسلوب بھی نہیں ہے، نہ یہ مجادلہ و مکابرہ کی کوئی شکل ہے۔ یہ تو محض سادہ اور صریح لفظوں میں اظہارِ مطالب و معانی کی ایک مخلصانہ اور دردمندانہ کوشش ہے۔ ممکن ہے یہ ایک سعی ناتمام ہو لیکن یہ بہر حال ایک مثبت کوشش ہے اور صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ تاریخ کے سراپردوں میں چھپے ہوئے بہت سے واقعاتی پہلو ایسے ہیں جن تک شاید سطح بین نگاہیں نہ پہونچ سکی ہوں۔ سوانح واقعات کے مخفی گوشوں کو بے نقاب کرنے سے شائد حقائق کا بہتر طور پر ادراک ہو سکے اور انصاف پسند لوگ جو تعصب، تنگ نظری اور جانب داری کی روش سے ہٹ کر واقعات کے پس منظر سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں اور کسی صحیح نتیجہ تک پہونچنے کی جد و جہد میں ہیں۔ ان کے سامنے تصویر کا اصل رُخ اور صورتِ حال کا صحیح نقشہ آسکے۔

اور یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ تہذیبی ارتقاء کے اس دور میں اگر مسلمان قوم حقائق کے لیے اپنے دل و دماغ کے دریچے وا نہیں کرتی تو پھر اس تلخ حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ وہ علم و عقل اور فکر و نظر سے محروم ایک مبغوض قوم ہی خدا کی نظروں سے گری ہوئی ایک بے وقار قوم، جس کا دانش و خرد کی بستیوں میں گزر نہیں اور جو محض اپنے بر خود غلط اسلاف کی اندھا دھند تقلید کی بھول بھلیوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ دوسروں

کی بیساکھیوں کے سہارے چلنے والی قوم علم و دانش کے اس تیز رفتار سفر میں دیگر اقوام عالم کا مقابلہ کیوں کر کر سکتی ہے۔ ایسی افسانہ وافسوں کی ماری ہوئی قومیں خود بھی ایک افسانہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ میں سوچتا ہوں یہ قوم آخر کب تک مبروص چہروں کو رنگین اور دلفریب نقابوں سے چھپاتی رہے گی، کب تک چند من گھڑت اصطلاحات کا سہارا لے کر جھوٹی عظمتوں کے محل ریت کی دیوار پر اٹھاتی رہے گی۔ کب تک حقائق پر پردہ ڈالنے کی سعی رائیگاں میں مصروف رہے گی۔ کب تک صداقتوں کا منہ چڑایا جاتا رہے گا۔

اگر کسی کے ذہن و دماغ میں خود ساختہ نظریات اور بے سروپا روایات کا جھاڑ جھنکاڑ اس حد تک جڑ پکڑ چکا ہے کہ اب کسی معقول بات کے لیے اس میں جگہ باقی نہیں رہی تو ایسا شخص ہمارا مخاطب نہیں کہ "میں نہ مانوں" کی دلیل کا کوئی توڑ آج تک پیش نہیں کیا جا سکا۔ لیکن اگر دل میں خدا اور رسول ص کی محبت مرتسم ہو، اگر تمام چھوٹی بڑی شخصیتوں سے صرفِ نظر کر کے صرف ایک ذاتِ اقدس یعنی حضور ختمی مرتبت ص مرکزِ نگاہِ عقیدت و محبت ہو تو مجھے یقین ہے کہ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں اہلِ دل، اہلِ نظر کے لیے اس کو قبول کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔

ہدایت کا نامہ بر اگر کسی جویائے حق اور باضمیر انسان کے در دل پہ دستک دے تو مجال انکار ممکن نہیں، تب سرتابی اور روگردانی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ جو کچھ لکھ رہا ہوں، یہ خیرو فلاح کی ایک پُرامن دستک ہے۔ ہر اس دروازۂ دل پر جسے شخصیتوں سے زیادہ نظریات عزیز ہیں، جسے افراد کی بجائے اصول سے محبت ہے، جسے اپنے گروہی اور شخصی رجحانات سے کہیں زیادہ تاریخ کے حقائق سے دلچسپی ہے، جو دین کو پیغمبر ص کے حوالے سے سمجھنا چاہتا ہے۔ کسی ایرے غیرے کی ذہنی اختراع کے ذریعے نہیں، جو سرچشمۂ ہدایت صرف حضور نبی اکرم ص کو سمجھتا ہے اور اپنے دل و دماغ کی تمام تر توانائیوں کے ساتھ اپنا مرکزِ عقیدت و محبت اسی ذاتِ گرامی کو بنائے ہوئے ہے۔

میں یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ مسلمان قوم بحیثیت مجموعی اس حد تک ذہنی

پستی کا شکار ہو چکی ہے کہ ہدایت و اصلاح کی کوئی آواز بھی اس پر اثر انداز نہیں ہو سکے گی۔

حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات والاصفات سے والہانہ محبت تکمیل ایمان و دین کی شرطِ اوّل ہے اور اس جذبۂ بے اختیار کا اولین تقاضا یہ ہے کہ حضورؐ کے اہلِ بیتؑ اور آپ کی آل اطہارؑ سے غیر مشروط وفاداری کا عہد استوار ہو اگر یہ نہیں تو محبت پیغمبرؐ کا ہر دعویٰ جھوٹا اور عشقِ رسولؐ کی ہر تعلّی مشکوک۔

دوستوں کی دوستی چاہنے والوں کی چاہت اور محبت کرنے والوں کی محبت کی پرکھ دوست داروں کی اولاد سے محبت اور حسنِ سلوک بھی ہے۔ یہ وہ پیمانہ ہے جس سے دوستی کا کیف و کم ناپا جاتا ہے یہ وہ معیارِ محبت ہے جس سے احباء و اقرباء کے تعلقِ خاطر کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہوتا ہے۔ اولاد کی قیمت پر دوستی نبھانا غیر فطری بات ہے جبکہ اسلام دینِ فطرت ہے اور اس کا پیغمبرؐ فطرت کے مقاصد کا سب سے بڑا نگہبان دار فطرتِ انسانی عقل سلیم ہو تو کبھی گوارا نہیں کرے گی کہ اولاد سے دشمنی کرنے والوں کو منہ لگائے۔

جو شخص آپ کی اولاد کا دشمن ہو، جس نے ان کے راستے میں کانٹے بچھائے ہوں، انہیں بدسلوکی اور بے مروتی کا نشانہ بنایا ہو، ان پر معاش کے دروازے بند کیے ہوں۔ خواہ آپ کا کیسا ہی جانی دوست اور یارِ غار کیوں نہ ہو، آپ کی نظر میں ایسے شخص کی دوستی دشمنی ہی کا ایک بھیانک روپ ہے۔

یہ ایک سراسر منطقی اور بدیہی فارمولا ہے۔ اس اصول کو اگر آپ اپنے دعوائے محبت رسولؐ پر منطبق کر کے دیکھیں تو آپ کو ہر اس نام نہاد دوست اور جانشین پیغمبرؐ سے نفرت ہو جائے گی جس نے پیغمبر کی وصیت کو ٹھکرایا ہو۔ پیغمبر کی اکلوتی بیٹی اور چہیتی صاحبزادی کو ان کے باپ کی طرف سے عطا کی ہوئی جائداد سے محروم کیا ہو۔ آپ کے بیٹوں اور نواسوں کو ستایا ہو اور آپ کے اہلِ بیتؑ کے ساتھ بدمعاملگی کا وطیرہ اختیار کیا ہو۔ یہ تاریخی واقعات ہیں جنھیں ہر مکتب فکر کے مورخ نے اپنی کتابوں میں درج کیا

ہے اور شیعوں سے زیادہ سنیوں کی کتابوں میں ان کی تفصیلات بکثرت موجود ہیں۔ اس لیے تاریخ کا کوئی ادنیٰ طالب علم بھی ان واقعات کی صحت کے بارے میں شک وشبہہ کا اظہار نہیں کر سکتا۔ بنابریں میں ہر اس شخص سے جس کے دل میں حضور نبی اکرم صلے اللہ وآلہ وسلم کی محبت کی ادنیٰ سی رمق بھی موجود ہے یہ التماس کرتا ہوں کہ وہ اپنے دل کا جائزہ لے اور سوچے کہ اس نے حضور نبی اقدس واکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اپنی محبت کے تقاضوں کو کہیں اپنی جماعت کے افکار و نظریات کی قربان گاہ کی بھینٹ تو نہیں چڑھا دیا؟

دو متضاد سمتوں کا مسافر

میں خود ایک عرصہ تک اہل سنّت والجماعت کا ایک فرد رہا ہوں اور اس مسلک کا پرجوش حامی و مبلغ بھی اور میرے حاشیۂ خیال میں کبھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ میں کبھی شیعہ بن سکتا ہوں۔ لیکن تاریخ کے بے لاگ مطالعہ نے مجھے جادۂ سنّیت سے ہٹا کر شیعیت کی آغوش میں لا ڈالا۔ تاریخ کا غائر نظر سے مطالعہ میرے لیے ایک چونکا دینے والا تجربہ تھا۔ یہ ایک ایسا دروازہ تھا جس نے بہت سے دروازے مجھ پر بند کیے اور بہت سے دروازے کھولے۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ سُنّی ہونا یا اہلِ سنّت والجماعت کے گروہ سے وابستگی دراصل ایک ایسے انسان کے روپ میں خود کو پیش کرنا ہے جو بیک وقت دو متضاد سمتوں کا مسافر ہے۔ وہ حق کا متلاشی بھی ہے اور باطل کا پرستار بھی، وہ اندھیروں اجالوں کا بیک وقت خریدار ہے، وہ دو کشتیوں کا ایک ایسا سوار ہے جس کے مقدر میں ڈوب مرنا لکھا جا چکا ہے، وہ خوب و ناخوب دونوں کی جستجو میں ہے، وہ کھوٹے اور کھرے سکّوں کو جمع کر کے روزِ بازارِ آخرت میں اپنے لیے جنّت کی دائمی مسرت خریدنا چاہتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ خسارے کا سودا ہے۔ آگ اور پانی، پھول اور انگارے ایک ساتھ دامن میں سمیٹنے کا فن ابھی تک ایجاد نہیں ہوا۔

جو لوگ عقل و خرد کی ہر بات سے آنکھیں اور کان بند رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا مداوا میں تو کیا خدا بھی نہیں کر سکتا۔ اس لیے میرا روئے سخن صرف ان سعید روحوں کی جانب ہے

جو سچائی کے متلاشی، حق کے خریدار، باطل سے بیزار اور راہ راست کے طلبگار ہیں۔ وہ لوگ میرے مخاطب نہیں جو کھرے کھوٹے اور جھوٹ سچ میں امتیاز کرنے کے روادار نہیں ہیں۔ فمن لم یجعل اللہ لہ نورا فمالہ من نور (جنھیں خدا کی طرف سے سچائی کا نور نصیب نہ ہوا انہیں کہیں سے روشنی نہیں مل سکتی۔)

یہاں ایک بات اسلامی تاریخ کی مستند کتابوں کے بارے میں بھی کہتا چلوں کہ ان میں سے بیشتر کتابوں میں تاریخی واقعات کی ترتیب کا انداز کچھ اس نوعیت کا ہے کہ واقعات کے پسِ منظر کے بارے میں مطلقاً آگاہی حاصل نہیں ہوتی۔ کیونکہ نہ تو ان واقعات کے تجزیہ وتحلیل کا کوئی اہتمام ان کتابوں میں موجود ہے، نہ اس امر کا کوئی التزام ہے کہ جس شخصیت کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جارہے ہیں، اور جس شخص کو بانس پر چڑھایا جارہا ہے وہ بذاتِ خود کس حیثیت کا مالک ہے اور اس کی قرار واقعی منزلت ومقام کیا ہے۔

حالانکہ تاریخ محض واقعات کے اظہار یا ان کے اعادہ وتکرار ہی کا نام نہیں ہے بلکہ مؤرخ کی بنیادی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ ان تاریخی واقعات کے پسِ پردہ عوامل کا تفصیلی جائزہ بھی پیش کرے۔

تاریخ اظہارِ حقیقت کا نام ہے، اظہارِ عقیدت یا مدحت آرائی اور منقبت سرائی کا نام تاریخ نہیں ہے۔ لیکن ہمارے بیشتر مورخین کا انداز تاریخ کے باب میں عموماً قصیدۂ مدحیہ کا سا رہا ہے۔ اس سلسلے میں واقعات کے پسِ منظر کو جو تاریخ کا ناگزیر حصّہ ہے اکثر و بیشتر نظر انداز کر دیا گیا ہے اور باقاعدہ کوشش کی گئی کہ واقعاتی منظر وپسِ منظر کو تاریخ کے طالبان علم سے مخفی رکھا جائے۔ اور یہ سب کچھ محض اس لیے کیا جاتا رہا کہ ممدوح شخصیتوں کا تقدس مجروح نہ ہونے پائے اور ان کی مفروضۂ عظمت کا بھرم نہ کھل جائے۔ تاریخ کے مطالعہ کے لیے خاص ذوق کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور نگاہ نکتہ رس کی بھی۔ واقعات کی

کی ترتیب میں جو الٹ پھیر ہوا ہے اور حالات کی افتاد میں غلط تعبیر کے ذریعے جو رنگ آمیزی کی گئی ہے ان پر نظر رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

تاریخ کی وضع و ترتیب میں مسلمانوں نے فن اسمار الرّجال کی آڑ میں جو دھاندلی کی ہے اس کا کبھی پوری طرح ادراک نہیں ہو سکا۔ جب لوگوں کو اس کا علم ہو گا تب پتہ چلے گا کہ پانی کہاں مرتا ہے۔

بیسیوں تو صرف صحابہ کی شخصیتیں سراسر فرضی ہیں مگر ان کے نام اور ان کی روایتیں کتب احادیث کی زینت بنی ہوئی ہیں اور فنِ اسمار الرجال والے اپنی اس بے بضاعتی اور کم مائے گی کا نوٹس لینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

خدا بھلا کرے عراق کے اس عظیم عالم علامہ مرتضیٰ عسکری کا جنھوں نے اپنی ایک کتاب ہر اس موضوع کے لیے وقف فرمادی اور اس کا نام رکھا "مائۃ وخمسون صحابی مختلق" ڈیڑھ سو فرضی صحابہ اس کتاب کے مطالعہ سے اس بد دیانتی کا پول کھلتا ہے جو دانستہ طور پر فن اسماء الرجال کے علماء نے روا رکھی ورنہ یہ کیوں کر ممکن تھا کہ چودہ سو سال بعد کا ایک محقق تو ان فرضی شخصیتوں کا سراغ لگالے اور ہزار بارہ سو برس پہلے کے لوگ خود اپنے فن سے اس قدر کورے ہوں کہ انہیں پتہ ہی نہ چل پائے کہ کون سی شخصیت اصلی ہے اور کون نقلی۔

عہد صحابہ کی تاریخ۔ ایک افسوسناک ورق

عہد صحابہ کی تاریخ کا غائر نظر سے مطالعہ کیجئے۔ ایک اندھے مقلد یا کور دیدہ مقلد کی طرح نہیں ایک غیر جانب دار مبصر کے زاویۂ نگاہ سے۔ تب آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس دور میں اسلام کے مزاج کو بگاڑنے، اسلام کی واضح ہدایات کو نظر انداز کرنے اور اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنے کی کیسی کیسی ناپاک کوششیں بروئے کار لائی گئیں۔

یہی وہ دور تھا جب ایک منظم منصوبہ کے تحت قرآن مقدس میں معنوی تحریف کی گئی، واقعات وحقائق کو مسخ کیا گیا، عالم گیر صداقتوں پر خطِ تنسیخ کھینچا گیا اور تاریخ کی زبان گنگ کر دی گئی۔ جی ہاں! اسی دور میں جسے خیر القرون (بہترین دور) کا نام دیا گیا وہ سب دھاندلیاں روا رکھی گئی ہیں جن سے شرافت وشائستگی کی اقدار پامال ہوئیں، اخلاقی حدود ضوابط کی رعایت و پاس داری ختم ہو کر رہ گئی اور اسلام کا نظام عدل ومروت دسیسہ کاریوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ زیرِ نظر کتاب دراصل عہدِ صحابہ ہی کی تاریخ کا بڑا افسوسناک ورق ہے۔ یہ اس دور کی کہانی ہے جب ابھی اسلام کی تاریخ کا روز تاریخ تھا اور محمد کریم علیہ وآلہ والتسلیم کی حیاتِ جسمانی کا رابطہ دنیا سے تازہ تازہ منقطع ہوا تھا اور زمام اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ آئی تھی جو اس پیغمبرؐ کے ساتھی شمار ہوتے تھے۔

دنیا میں شاید ہی کسی قوم نے اپنی تاریخ کے بالکل ابتدائی دور میں ناسپاسی، احسان فراموشی اور ناشکری کا وہ انداز اختیار کیا جو اس دور کے سربرآوردہ صحابہ نے خود اپنے پیغمبرؐ کے ساتھ روا رکھا۔

ستم بالائے ستم یہ کہ جو کچھ کیا گیا اسے بعض خود ساختہ اصطلاحات کے ذریعہ سندِ جواز بخشی گئی اور اس دَور کے ہر قول و فعل کو تنقید سے بالاتر قرار دے کر آزادیٔ رائے، آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ تقریر و تحریر کو بیدردی سے کچل دیا گیا ؎

مذہب غلام، روح غلام آبرو غلام آزادیٔ ضمیر، نہ آزادیٔ نظر

عقائد ہوں یا اعمال، افکار ہوں یا اقوال، نظریات ہوں یا احوال غرضیکہ فکر و نظر، قول و فعل اور خیر و شر کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں مداخلت بے جا کا ارتکاب نہیں کیا گیا اور اسلامی تعلیمات کا کوئی گوشا ایسا نہیں جس میں رد و بدل نہ کیا گیا ہو۔

سب سے بڑا ظلم تاریخ اور فن تاریخ پر ڈھایا گیا کہ اسے اسناد کے ساتھ بے بس کر دیا گیا۔ اس کے ہونٹ سی دیئے گئے۔ اس کی زبان بند کر دی گئی اور اسے پابند کر دیا گیا کہ وہ وہی کچھ کہے جو اس دَور کا برسرکار اور بااختیار طبقہ اس سے کہوانا چاہتا تھا۔ فن تاریخ اس سے پہلے کبھی ان جکڑ بندیوں کا شکار نہیں ہوا تھا وہ ہمیشہ لگی لپٹی رکھے بغیر واقعات کی صحیح عکاسی کرتا رہا ہے۔ اسے اپنی باتوں کی تصدیق و توثیق کے لیے کبھی کسی سند کا محتاج نہیں ہونا پڑا۔ وہ روایت درایت کا ایک خود کار نظام اپنے اندر رکھتا ہے جو تنقید کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور بذاتِ خود رطب و یابس اور غلط و صحیح میں خطِ امتیاز کھینچ سکتا ہے۔ لیکن عہدِ صحابہ میں اسے ایک نئے اور تلخ تجربہ سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ تھا فنِ تاریخ کے لیے سند کا اہتمام، جیسے "حدثنا فلاں" اور "اخبرنا فلاں"، کے لایعنی سلسلے اور "عن و من" کی مہمل تکرار اور "قال قال" کے بے سروپا التزام اور "رُوِیَ" اور "قیل" کی مجہولانہ روایات کے ذریعے تاریخ پر مسلط کر دیا گیا اور اس کی قوتِ گویائی سلب کر لی گئی۔ چنانچہ فنِ تاریخ کا بھی وہی حشر ہوا جو "آئینے کے پیچھے طوطی" کا ہوتا رہا ہے اور اس نے بھی ــــ "آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم" ــــ کا انداز اختیار کر لیا۔

اور تاریخ تو رہی بجائے خود اس پابند اسناد روایت سازی کے ذریعے خدا کی آخری

اور سچی کتاب قرآن مقدس کے لبوں پر بھی مہر لگا دی گئی اور وہ صحیفۂ آسمانی جو "عالمین" کے لیے ہدایت کا منشور بن کر آیا تھا خاموش تماشائی بن کر رہ گیا۔

چنانچہ آیاتِ قرآنیہ کے معانی و مضامین پر جب کبھی غور کرنے کا موقع میسر آیا تو یہ دیکھا کہ اس آیت کے ظاہر عبارت سے جو مفہوم مترشح ہوتا ہے اس کے سراسر خلاف راویان حدیث ایک اور ہی موضوع پر طبع آزمائی کر رہے ہیں یعنی وہی بات۔ ہوئی کہ "من چہ می گویم وطنبورہ من چی می سراید" قرآن کا متن کچھ کہہ رہا ہے اور اس کے شارح و مفسر دوسرا راگ الاپ رہے ہیں۔

کسی جرم کے ارتکاب میں خواہ کتنی ہی رازداری سے کام کیوں نہ لیا گیا ہو وہ ایک دن ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ یہ گویا قانون مکافات کا قدرتی ردِّ عمل ہے۔ مزید برآں علم و خرد اور تہذیب و تمدّن میں ارتقاء کا جو ایک قدرتی عمل کارفرما ہے اس سے بجا طور پر یہ امید پیدا ہو گئی ہے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔

انسانی جبلّت اپنی افتادِ طبع کے اعتبار سے ہمیشہ ایک ہی نہج پر اور یکساں انداز میں کام کرتی آئی ہے، حسد، بغض، رقابت، دوستی، دشمنی، محبت، عداوت، صلح جنگ، امن پسندی اور ہنگامہ آرائی، سطحی جذبات اور پسند و ناپسند، تعلّی و خودنمائی، عجز و انکسار، کبر و نخوت، رعونت و انانیت، سادگی و سہل پسندگی، فقر و استغناء، دنیا طلبی اور جاہ پسندی اور اسی قبیل کی بے شمار خوبیاں اور خرابیاں، برائیاں اور اچھائیاں ہر دور کے انسان کا ورثہ رہی ہیں۔ مشہور انقلابی لیڈر مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنی تفسیری تشریحات میں "سورۃ العصر" کے حق میں بڑی پتے کی بات کہی ہے کہ "العصر" یعنی زمانہ جس کی قسم کھائی گئی ہے اس سے مراد وہ گزرا ہوا زمانہ ہے جس کی جھلکیاں ہمیں حال میں بھی نظر آئیں اور مستقبل میں بھی۔ گویا اس سے مراد تاریخ کے مختلف ادوار ہیں۔ مطلب یہ کہ تاریخ کی قسم کھائی گئی ہے اور اسے گواہ ٹھہرایا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ جن مراحل سے گزر رہی ہے وہ انہی مراحل سے آئندہ بھی گزرتی رہے گی۔

میری سمجھ میں کبھی یہ بات نہیں آئی اور میرا خیال ہے کہ کوئی معقول انسان اسے درست تسلیم نہیں کرے گا کہ ایک انسانی معاشرے میں تمام افرادِ امت یکساں جذبات و احساسات اور مساویانہ صلاحیت و استعداد کے حامل رہے ہوں۔ بہ ایں طور کہ ان کی دیانت و امانت، ان کا زہد و تقویٰ، ان کی پرہیزگاری اور نیکوکاری کا معیار ایک رہا ہو، ان کے ایمان کی کیفیت برابر سرابر رہی ہو، ان کی ذہنی و علمی سطح میں کوئی فرق نہ ہو، ان کے فکر و عمل کا، ان کے سوچنے اور سمجھنے کا ڈھنگ یکساں ہو اور ان کی اخلاقی اور تہذیبی حالات میں کوئی تفاوت نہ ہو۔

خیرِ محض کا وجود انسانی معاشرے میں ممکن نہیں۔ یہ دنیا جب سے معرضِ وجود میں آئی ہے خیر و شر کا تضاد اور نیکی و بدی کا تصادم جاری ہے اور جب تک اس کرۂ ارض پر نسلِ انسانی کا وجود باقی ہے۔ یہ تضاد برقرار اور یہ تصادم جاری رہے گا:۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

صحابہ کی پوری جمعیت کے متعلق یہ گمان رکھنا کہ ان میں ہر شخص خیرِ مجسم تھا اور وہ سب سراپا تقویٰ و طہارت لوگ تھے، ایک انہونی، ناقابلِ فہم اور قطعاً ناممکن العمل بات ہے لیکن ہمارے نام نہاد دینی رہنماؤں اور مذہبی پیشواؤں نے اس باب میں جو سبق ہمیں سکھایا ہے اور جو پٹی ہمیں پڑھائی، وہ یہ ہے کہ الصحابہ کل عدول (صحابہ سب کے سب عادل ہیں) اور صحابہ سے مراد انسانوں کا وہ گروہ جس نے حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے جمالِ جہاں آرا سے اپنی آنکھیں روشن کی ہوں خواہ اس گروہ کے کچھ لوگ کتنے ہی سیاہ باطن کیوں نہ ہوں اور خواہ ان کے کرتوت کیسے ہی قابلِ نفرت اور لائق ملامت

کیوں بنہ رہے ہوں نگران کی صفتِ عدالت ہر حالت میں قائم رہے گی۔ بگڑتے میں بھی زلف اُس کی بنا کی۔

"اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک صحابہ کا عادل ہونا بہ ایں معنی ہے کہ:

"عدالت اس کیفیت راسخہ در نفس کا نام ہے جو ملازمت تقویٰ و استعمال مروت پر آدمی کو آمادہ رکھے۔" (مکالمہ سید محمود رضوی و مولوی اسمٰعیل گوجروی، مطبوعہ مکتبہ رضوان گنج بخش روڈ لاہور ۹)

لیکن تاریخ وحدیث کی بیشمار کتابوں میں صحابہ کی غیر عادلانہ روش اور ان کی بے مروتی کی جو سینکڑوں داستانیں بکھری ہوئی نظر آتی ہیں ان سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ صحابہ عادلین ایسی ایسی ناانصافیوں کے مرتکب ہوئے ایسے ایسے خلاف تقویٰ عمل ان سے سرزد ہوئے اور بے مروتی اور بدکرداری ایسی ایسی قبیح حرکتیں ان سے سرزد ہوئیں کہ تاریخ آج تک ان کے ماتم سے فارغ نہیں ہوئی۔ ان صحابہ کا کردار بعض حالات اور متعدد موقعوں پر اتنا شرمناک اور شرافت واخلاق سے اس درجہ گرا ہوا نظر آتا ہے کہ ہمیں ان کے مقابلہ میں اپنے ماحول اور معاشرہ کے اخلاق باختہ لوگ زیادہ شریف اور پاکباز نظر آتے ہیں۔

قصۂ فدک

بے مروتی کے سلسلے میں صرف ایک "فدک" ہی کا ایک قصہ کچھ کم عبرت انگیز نہیں حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصال کے فوراً بعد ان کی اکلوتی اور چہیتی بیٹی نورِ چشم اور لختِ جگر بلکہ "پارۂ جان وجگر گوشۂ پدر"، سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کے ساتھ جانشینانِ پیغمبرؐ کی بدسلوکی، بے مروتی اور بدمعاملگی کا جیسا شرمناک مظاہرہ کیا گیا اس کے لیے کوئی اخلاقی جواز مہیا کیا جاسکتا ہے؟

وہ سیدہ فاطمہ جنھیں حضور اقدس صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی خصوصی چاہتوں اور محبتوں سے نوازا، جنھیں دنیا جہاں کی تمام عورتوں کی سرتاج "سیدۃ نساء العالمین" اور خواتین اہلِ جنّت کی سردار "سیدۃ نساء اہل الجنہ" کے گرانقدر خطابات سے نوازا، جن کے بارے میں پیغمبر علیہ وآلہٖ السّلام کی نزاکتِ احساس کا یہ عالم تھا کہ ارشاد ہوا۔

فاطمہ بضعۃ جسدی یریبنی ماارابھا ویوذینی ما اذاھا

(فاطمہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے اس کی ہر پریشانی میری پریشانی اور اس کا ہر دکھ میرا دکھ ہے۔)

نیز فرمایا:۔

فاطمہ بضعۃ منی فمن ابغضھا فقد ابغضی۔

(فاطمہؑ میرے وجود کا حصّہ ہے جس نے اسے برہم کیا اس نے میری خفگی اور برہمی مول لی۔)

یہی سیّدہ فاطمہؑ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عطا کئے ہوئے قطعۂ اراضی باغ فدک کا مطالبہ کرتی ہیں تو ان کے مطالبے کو مسترد کر دیا جاتا ہے۔ کبھی ان سے گواہ پیش کرنے کو کہا جاتا ہے اور کبھی وراثت انبیاء ہی کا سرے سے انکار کر کے ان کی بات کو ٹھکرا دیا جاتا ہے۔

تمام کتبِ حدیث جن میں "صحیح بخاری" بھی شامل ہے ایسی روایتوں سے بھری پڑی ہے کہ سیدہ فاطمہؑ اپنے جائز حق سے محروم کر دی گئیں اور اس بناء پر وہ خلیفۂ اوّل ابوبکر بن ابی قحافہ سے ناراض ہو گئیں اور مرتے دم تک اس شخص سے بات کرنا بھی گوارا نہ فرمایا۔

بخاری کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

نوحدت فی ذالک فاطمہ فھجرت فلم تکلمہ حتی توفیت۔

(سیدہ فاطمہؑ اپنے مطالبہ کے مسترد ہو جانے پر ابوبکر سے ناراض ہو گئیں۔ انہوں نے ابوبکر سے قطع تعلق کر لیا اور پھر تاحین حیات اسے منہ نہیں لگایا۔)

تعجب ہے کہ پیغمبرؐ کا کلمہ پڑھنے والے، اس پر ایمان لانے والے اور اس کی جوتیوں

کے صدقے میں تختِ خلافت پر متمکن ہونے والے اتنے بے حس، بے مروت، بدلحاظ شوخ چشم، گستاخ اور سنگ دل بھی ہو سکتے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چہیتی اور اکلوتی بیٹی کی ایک معمولی سی فرمائش کو پورا کرنے کے بھی روادار نہیں ہوئے۔

صحابہ کی برسراقتدار جماعت کے سامنے ان کے پیغمبرؐ کی صاحبزادی اپنا ایک دعویٰ پیش کر رہی ہیں اور وہ لوگ نہ صرف یہ کہ اس دعوے کو مسترد کر دیتے ہیں بلکہ ان کے ساتھ ہتک آمیز برتاؤ کرنے میں بھی ان صحابہ کو کچھ تامل نہیں ہوتا۔

یہ کیسے لوگ تھے جو حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے فیض صحبت سے بہرہ ور ہوئے تھے مگر پیغمبرؐ کی اولاد کو اتنا پیار اور احترام بھی نہ دے سکے جیسا کچھ ادب و احترام ہم اپنے اساتذہ و مسلمین کی اولاد کو دیتے چلے آئے ہیں۔ شبلی نعمانی نے "الفاروق" میں گومگو کے انداز میں اس واقعہ کا تذکرہ حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

"ابن ابی شیبہ نے "مصنف" میں اور علامہ طبری نے تاریخ کبیر میں روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر نے حضرت فاطمہؑ کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا۔ "یا بنت رسولؐ اللہ خدا کی قسم آپ ہم کو سب سے زیادہ محبوب ہیں تاہم اگر آپ کے یہاں لوگ اسی طرح مجمع کرتے رہے تو میں ان لوگوں کی وجہ سے گھر میں آگ لگا دوں گا۔" اگرچہ سند کے اعتبار سے اس روایت پر ہم اپنا اعتبار ظاہر نہیں کر سکتے کیونکہ اس روایت کے رواۃ کا حال ہم کو معلوم نہیں ہو سکا[1] تاہم روایت کے اعتبار سے اس واقعہ کے انکار کی

---

[1] یہ صاحب جو تاریخ نگاری کرنے چلے ہیں انہیں اتنا شعور بھی نہیں کہ ایک روایت جو زبان زد عام ہے اور جسے وہ خود بھی پیش کر رہے ہیں اس کے رواۃ کے بارے میں تو کم از کم چھان بین کر لیتے کہ آیا اس کے راوی ثقہ ہیں یا غیر ثقہ۔ یعنی وہی مثل ہوئی کہ پاس نہیں ہیں دانے اماں چلی بھنانے۔"

کوئی وجہ نہیں۔ حضرت عمر کی تندی اور تیز مزاجی سے یہ حرکت کچھ بعید نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نازک وقت میں حضرت عمر نے نہایت تیزی اور سرگرمی کے ساتھ جو کارروائیاں کیں ان میں گو بعض بے اعتدالیاں پائی جاتی ہوں لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ انہیں بے اعتدالیوں نے اٹھتے ہوئے فتنوں کو دبا دیا۔ بنوہاشم کی سازشیں اگر قائم رہتیں تو اس وقت جماعت اسلامی کا شیرازہ بکھر جاتا اور وہی خانہ جنگیاں برپا ہو جاتیں جو آگے چل کر جناب امیر علیہ السلام اور امیر معاویہ میں واقع ہوئیں۔ (الفاروق ص۱۲۴-۱۲۵ طبع دوم مارچ ۱۹۴۹ء مطبوعہ مہتمم ثناء اللہ ریلوے روڈ۔ لاہور)

بنوہاشم سے بغض تو خیر خلفائے ثلاثہ اور ان کے قصیدہ نگاروں کی متاع مشترک ہے اور اس کا ذکر آگے کہیں آئے گا لیکن مجھے یہاں جملہ معترضہ کے طور پر عباسی خلیفہ ہارون الرشید کی بیگم زبیدہ کا وہ فقرہ یاد آگیا جب اس کے لڑکے امین الرشید کو قتل کر کے اس کا یہ سوتیلا بیٹا مامون الرشید سریر آرائے سلطنت ہوا تو زبیدہ کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ مامون اس سے امین کی ماں ہونے کے ناطے بدسلوکی کا معاملہ کرے گا۔ چنانچہ اس نے مامون کے نام ایک خط میں اس کے باپ کے حوالے سے لکھا تھا۔

وتذکر من لو کان حیا لکان شفیعی الیک۔"

"مجھ سے کسی قسم کا معاملہ کرتے ہوئے اس بات کو ضرور ذہن میں رکھنا کہ آج اگر وہ شخص (یعنی میرا شوہر اور تمہارا باپ) زندہ ہوتا تو وہ تمہاری بارگاہ

جہاں تک اس روایت کے مستند ہونے کا تعلق ہے تو اہلِ سنّت کے تمام نامور محدثین اور مؤرخین نے اس روایت کو اپنی اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے۔ ابن قیتبہ نے اپنی مشہور کتاب "الامامۃ والسیاسۃ" میں اس ناپاک جسارت کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ حدیث کے سب سے بڑے مجموعے "کنز العمال" میں علی متقی نے اسے درج کیا ہے۔

میں میری جانب سے ایک سفارشی بن کر پیش ہوتا۔)

اور تاریخ بتاتی ہے کہ مامون نے زبیدہ کے ساتھ حسن سلوک کے معاملے میں اپنے آپ کو ہمیشہ یاد رکھا لیکن وہ ذاتِ اقدس واطہر جو شفیع المذنبین ہے اس کی بیٹی کے معاملہ میں اس کے والد گرامی کے سفارشی ہونے کا ذرا سا بھی خیال نہیں رکھا گیا۔

خلیفہؓ دوم کا یہ مداح تسلیم کر رہا ہے کہ حضرت سیدہ فاطمہؑ کے مکان کو آگ لگانے کی دھمکی دی گئی اور خلیفۂ دوم نے اس موقع پر بے اعتدالیوں سے کام لیا۔ لیکن وہ ان بے اعتدالیوں کو یہ کہہ کر سند جواز عطا کر رہا ہے کہ اگر عمر ابن خطاب ایسی بے اعتدالیاں نہ کرتے تو بنوہاشم کی سازشیں کامیاب ہو جاتیں۔

اگرچہ خوب! اگر ابوبکر و عمر خلافت پر قبضہ جمانے کے لیے سازشش کریں۔ بے اعتدالیوں کے مرتکب ہوں، دھونس، دھمکی، دھاندلی کا وطیرہ اپنائیں تو یہ سب کچھ بالکل بجا و درست اور بنوہاشم ان کی دسیسہ کاریوں کے خلاف مل بیٹھ کر سوچیں تو یہ سازشیں مصنّف بنوہاشم کا تذکرہ اس انداز میں کر رہا ہے جیسے یہ کوئی اسلام دشمن ٹولہ تھا جس کی سازشوں سے اسلام کی تباہی کا خطرہ درپیش تھا۔ اور یہ کون لوگ تھے۔ سیدہ فاطمہؑ دخترِ رسولؐ، حضرت علیؑ داماد رسول و ابن عم رسول اور حضرت عباس عمّ رسولؐ کیا ان تینوں کو یہ حق نہیں پہونچتا تھا کہ وہ خلافت کے باب میں اپنی پسند و ناپسند کا اظہار کریں؟ کیا ابوبکر کی خلافت خدا کی وحی سے ثابت تھی کہ اس کے خلاف کچھ سوچنا بھی جرم تھا اور شبلی نعمانی کو بنوہاشم کی سوچ بھی سازش اور عمر ابن خطاب کی بے اعتدالیاں بھی قابلِ ستائش نظر آتی ہیں ع

چہ دلاور است دزدے کہ بہ کف چراغ دارد

رسول اللہؐ کے خانوادہ عظمت کا تذکرہ اس گستاخانہ انداز میں اور وہ بھی سیرۃ النبیؐ کے مصنف کے قلم سے لیکن اس سے آپ اندازہ کر لیجئے کہ ان مؤرخوں کے ممدوحین کی

گستاخی اور بدلحاظی اور بے مروّتی کا کیا عالم ہوگا۔ ع

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

یہ اندازِ تحریر، یہ طرزِ تاریخ نگاری خود بتا رہی ہے کہ رسول اللہ کی ذاتِ اقدس سے ان لوگوں کے دلوں میں آج بھی بغض و عناد بھرا ہوا ہے۔ رسول اللہ اور ان کے خانوادہ شرف امجد پر حرف آجائے تو آجائے مگر ان کے ممدوحین پر آنچ نہ آنے پائے۔ ع

کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو

بنوہاشم کو رسوا کرنے کی یہ کوئی پہلی سازش نہیں تھی جو شبلی نعمانی کے نوک قلم پر آگئی بلکہ اس کا سر نقطہ، آغاز بھی خلیفہ، اوّل و دوم کی بے مروتی اور شوخ چشمی کے سر بندھا ہے۔

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

اس موقع پر اگر خلیفہ، دوم جناب کا وہ مکالمہ درج کر دیا جائے جو انھوں نے حضرت عبداللہ ابن عباس کے ساتھ خلافت کے موضوع پر کیا تو پتہ چلے گا کہ بنوہاشم کے خلاف بغض و نفرت شروع ہی سے ان لوگوں کے دلوں کا ناسور بن گئی تھی۔ عمر ابن خطاب نے جناب عبداللہ ابن عباس سے کہا تھا:-

"هيهات ابت والله قلوبكم يا بنى هاشم الاحسدا ما يحول وضعثا وغشا ما يزول"

(انساب الاشراف بلاذری الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہ)

"افسوس اے بنی ہاشم! تمہارے دلوں سے حسد، کینہ، بغض و نفاق ابھی تک دور نہیں ہوا۔

اس پر حضرت عبداللہ ابن عباس نے فوراً جواب دیا تھا۔

مهلا يا امير المومنين لا تصف قلوب قوم اذهب الله

عنھم الرجس وطھرھم تطھیر ابالحسد واغش فاف قلب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من قلوب بنی ھاشیم

رک جایئے اے مسلمانوں کے امیر! جن لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے

یہ فرمایا ہو کہ وہ ہر آلائش سے پاک اور صاف ہیں۔ آپ انہیں حسد ونفاق سے

متصف کر رہے ہیں۔ آپ کو اتنا بھی خیال نہیں کہ خود رسول اللہ صلی اللہ وآلہ

وسلم کا دل بھی تو بنو ہاشم ہی کے ایک فرد کا دل تھا۔

اس سے پہلے ایک مرتبہ انہی خلیفۂ دوم نے بڑی ترنگ میں حضرت عبداللہ

ابن عباس سے کہا تھا۔

کرھنا لکم اف تجتمع النبوۃ والخلافۃ معاًفی بیت واحد

(ہمیں یہ بات ناپسند تھی کہ نبوت وخلافت ایک ساتھ ایک ہی گھر میں جمع

ہو کر رہ جائیں۔)

اس تعلّی کا دندانِ شکن جواب مسکت جواب حضرت عبداللہ ابن عباس نے یہ دیا تھا۔

"خدا نے اپنے فیصلے تمہاری پسند وناپسند کے مطابق نہیں کیے۔ تمہیں تو یہ

پسند نہ تھا کہ نبوت بنو ہاشم کے ایک فرد کے حصے میں آئے۔"

محمدؐ عربی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جوتیوں کے طفیل میں مسند فرمانروائی پر متمکن ہونے

والے ایک معمولی چرواہے کا لڑکا کس لہجہ اور کس گستاخانہ انداز میں ڈینگیں ہانک رہا ہے۔

اور یہ وہی عمر ابن خطاب ہیں جو بستر علالت پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم

کے اس ارشادِ گرامی کو کہ "قرطاس اور قلم لاؤ کہ میں تمہیں ایک ایسی بات لکھ دوں کہ میرے بعد

تم گمراہی سے بچ سکو۔"

یہ کہہ کر ٹھکرا دیتا ہے کہ:۔

ان الرجل لیھجر و یھد و (سسر العالمین للغزالی ص۔)

یہ شخص یعنی رسول خدا ہذیان بک رہا ہے یا یہ بیہودہ بول رہا ہے۔ (العیاذ باللہ)

تہذیب و شرافت کی زبان سے جو لوگ آشنا ہیں وہ کسی بزرگ و محترم شخصیت تو کجا کسی عام آدمی کے لیے بھی الفاظ کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ جو منہ میں آیا بک دیا۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ پاک کے لیے لفظ ہذیان، وہی شخص استعمال کر سکتا ہے جسے نہ حضورؐ کی ذاتِ اقدس سے عقیدت و محبت ہو نہ تہذیب و اخلاق سے اس کا کچھ واسطہ ہو نہ مقام نبوت سے کچھ آشنائی۔

تاریخی پسِ منظر

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے حدیث و سیر کی مبسوط کتابوں میں بہ استثنائے چند واقعات کی ترتیب یا انداز بہ طور خاص اس نوعیت کا رکھا گیا ہے کہ واقعات کے پسِ منظر سے مطلقاً آگاہی حاصل نہیں ہوتی نہ ان واقعات کے پیش منظر و پس منظر میں کوئی رابطہ محسوس ہوتا ہے، نہ واقعات کے تجزیہ و تحلیل کی ضرورت کسی مورخ نے محسوس کی اور کرتے بھی کیوں کہ اس سے ان کی عقیدتوں کے محل خود کے اپنے ہاتھوں مسمار ہو جاتے۔

کیا تاریخ محض واقعات کے اعادہ و تکرار ہی کا نام ہے؟ کیا مورخ کا یہ بنیادی فرض نہیں کہ وہ ان واقعات کے پسِ پردہ محرکات کو بھی بے نقاب کرے۔

مثلاً سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کے باب میں جو ڈرامہ کھیلا گیا، انصار و مہاجرین کے درمیان جو چپقلش رونما ہوئی اور جس طرح ایک شخص نے اس ڈرامے میں مرکزی کردار ادا کیا مورخین کی ذمہ داری نہ تھی کہ وہ اس صورتِ حال کی وضاحت پیش کرتے جو وہاں رونما ہوئی اور فرد واحد کو جس بناء پر یہ مقتدر ہونے کا موقع ملا اس کے اسباب و علل و عوامل پر روشنی ڈالتے؟

حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں حضرت عمر کا نام کسی اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ حضورؐ کے عہدِ ہمایوں میں نہ ابوبکر کو کسی نوع کی سماجی یا دینی برتری حاصل تھی۔ نہ عمر کو۔ کسی مستند یا صحیح روایت میں یہ نہیں ملتا کہ حضورؐ کسی دینی معاملہ میں ان لوگوں سے مشاورت فرماتے تھے اگرچہ بعض فرضی، خود ساختہ، جعلی اور وضعی روایتوں کے ذریعے ان دونوں شخصیتوں کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملائے گئے ہیں لیکن وہ تمام روایات نقد وجراح کی رو سے سراسر مشکوک اور ناقابلِ اعتبار ہیں اور خود اہلسنت ہی کے نامور محدثین نے ان میں سے ایک ایک روایت کے مجروح، ضعیف اور موضوع ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ اگر کوئی روایت بفرض محال سند کے اعتبار سے درست بھی ہے تو روایت کی رو سے لغو اور لایعنی ہے۔

راویانِ حدیث کی جرح ونقد کے فن پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں اس امر کی تصریح ملتی ہے کہ "فضائل شیخین" پر جتنی بھی حدیثیں کتب صحاح میں موجود ہیں وہ سراسر موضوعات اور جعلی ہیں۔ خاص طور پر یہ حدیث کہ:

"اقتدو الذین بعدی ابی بکر و عمر"

(میرے بعد ان دو کی پیروی اختیار کرو یعنی ابوبکر اور عمر کی۔)

یا مثلاً وہ مشہور حدیث کہ:

"اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم"

(میرے صحابہ ستاروں کے مانند ہیں ان میں سے جس کی پیروی کروگے ہدایت پاجاؤگے۔)

ابن تیمیہ جیسے غالی خارجی نے بھی اپنی کتاب "المنتقی" میں اسے یکسر موضوع اور من گھڑت حدیث قرار دیا ہے مگر منبروں پر واعظ آج بھی اس سے چٹخارے لیتے نظر آتے ہیں۔ تہذیب التہذیب، کمال فی اسماء الرجال اور تذکرۃ الموضوعات جیسی کتابوں کا تتبع کیجئے

ان سب "فضائل و مناقب" کا بھرم کھل جائے گا۔

میں نے کتبِ حدیث میں ان احادیث کا جائزہ لیا ہے جو شیخین کے فضائل و مناقب پر مشتمل ہیں تو ایک عجیب انکشاف ہوا کہ خلیفۂ اوّل کی منقبت میں بیشتر حدیثیں یا تو خلیفۂ دوم کی روایت کردہ ہیں یا پھر لے دے کے حسب ذیل افراد میں سے کسی ایک کی طرف منسوب ہیں۔

(۱) عبداللہ بن عمر (۲) عائشہ (۳) عبداللہ بن عمرو العاص (۴) ابوہریرہ (۵) عبدالرحمان بن ابی بکر (۶) حفصہ (۷) مغیرہ بن شیبہ

اسی طرح خلیفۂ دوم کی فضیلت میں جن احادیث کا چرچا ہے وہ یا تو خلیفۂ اوّل کی روایت کردہ ہیں کہ دنیا کا دستور ہے۔ من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو۔ یا پھر وہی مذکورہ بالا افراد جن کا اوپر حوالہ دیا گیا اور یہ سب کرایہ کے راوی اور پیشہ ور داستاں گو ہیں۔ اسی طرح حضرت عائشہ کی فضیلت میں جو حدیثیں وضع کی گئیں ان میں انہی افراد کی روایتوں کا حصہ سب سے زیادہ ہے جس سے صاف طور پر ملی بھگت اور چنڈال چوکڑی کا سراغ ملتا ہے۔

اس کے برعکس جن احادیث میں اہلِ بیت نبوت بالخصوص امیرالمومنین علیؑ کے مناقب و فضائل کا تذکار جمیل ہے ان میں ایک بھی راوی حضرت علیؑ کے اپنے قریبی رفقا میں سے نہیں ہے۔ نہ ابوذر غفاری، نہ سلمان فارسی، نہ عمار یاسر، نہ مقداد، نہ بلال بلکہ ان روایتوں کے راوی کم و بیش سب ہی مخالف گروہ کے لوگ ہیں اور اسے کہتے ہیں جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے۔

خیر یہ تو ایک ضمنی مبحث بیچ میں آگیا بات ہو رہی تھی اس ناشدنی کی کہ ایک شخص جو رسول اللہؐ کے عہد ہمایوں میں قطعاً بے اثر تھا یہ کیسا عجوبہ ہے۔ حضورؐ کی آنکھیں بند ہوتے ہی یکایک اتنا طاقتور بن گیا کہ امت کی پوری ہیئت اجتماعیہ اس ایک شخص کی مرضی اور خواہش کے تابع ہو کر رہ گئی۔ یہ بھی نہیں کہ یہ شخص کوئی بہت بڑا سورما تھا اور اس کی بہادری کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی یا غزوات و سرایا میں اُس نے بہادری کے ایسے جوہر دکھائے تھے کہ

ہر جگہ اس کی بہادری کے چرچے تھے۔
جنگ احد میں میدانِ جنگ سے فرار اور غزوۂ خیبر میں ان کی مہم کی ناکامی کا ذکر تاریخ کا حصّہ بن چکا ہے اور اس کا انہیں خود بھی اعتراف تھا۔
ایسا شخص، ہماری مراد عمر ابن خطاب ہے حضورؐ کے وصال کے فوراً بعد ایک ایسی شخصیت بن کر ابھرتا ہے جس کے ہاتھ میں ملّتِ اسلامیہ کے تمام معاملات کی باگ ڈور آجاتی ہے اور وہ جسے چاہتا ہے اس کے سر پر خلافت کا تاج رکھ دیتا ہے اور اصحابِ رسولؐ میں سے جس کو چاہتا ہے زدوکوب کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا بلکہ اس کی شورہ پشتی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ پیغمبرؐ کی اکلوتی اور چہیتی بیٹی کو جا کر دھمکاتا ہے اور اس کے مکان کو آگ لگا دینے کی دھمکی دیتا ہے۔
وہ کیا حالات تھے جو ایک بے حیثیت شخص کے "بادشاہ گر" (KING MAKER) بننے کا موجب بنے اور ساری قوت اسی کے ہاتھ میں مرتکز ہو کر رہ گئی۔

جیش اُسامہ

جیش اُسامہ کی تیاری خود حضور نبی اکرم صلّے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے حکم سے ہوئی. اس لشکر میں سپاہیوں کے نام بہ نام شمولیت بھی حضورؐ اکرم کے ایماء اور فرمان کے ذریعے عمل میں لائی گئی یعنی حضورؐ ہی نے فرداً فرداً ایک ایک شخص کو اس فوج کے لیے نامزد فرمایا۔ ان عام سپاہیوں میں نام نہاد عاشقانِ رسولؐ کا وہ ٹولہ بھی تھا جو بعد میں امور خلافت کی بندر بانٹ میں پیش پیش رہا۔ اس لشکر اسامہ میں ابوبکر اور عمر بھی شامل تھے اور انہیں اس میں کوئی نمایاں مقام بھی نہیں دیا گیا تھا۔ فوج کے چار اہم عہدوں میمنہ، میسرہ، قلب مقدمۃ الجیش میں سے کسی عہدے کے قابل بھی ان دونوں بزرگوں کو نہیں سمجھا گیا۔ مگر

کسی مؤرخ کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ ان حالات کا کھوج لگاتا کہ فوج کے دو ادنیٰ سپاہی کیونکر اس مرتبہ و مقام تک پہونچے کہ وہ حضورؐ کے مقرر کیے لشکر میں اپنی ذمہ داریوں سے اعراض و انحراف کر کے حصول خلافت کی تگ و دو میں براہ راست شریک ہو گئے۔ انہیں یہ کس نے موقع فراہم کیا۔

جیش اسامہ میں ایک معمولی اور عام سپاہی کی حیثیت میں اپنی نامزدگی پر انھیں اعتراض تھا۔ مگر حضور نے اس اعتراض کو پر کاہ کی وقعت بھی نہ دی اور انہیں لشکر اسامہ میں کوئی ادنیٰ اسی اہمیت، یا معمولی عہدہ و منصب دینے سے بھی انکار فرمایا مگر ایسے کم سواد اور بے حیثیت لوگوں کو یہ اختیار کس نے دیا کہ وہ فوج میں اپنی نامزدگی از خود منسوخ کر کے مسند خلافت پر براجمان ہو گئے۔

طالع آزما فوجیوں اور ابن الوقت قسم کے لشکریوں کی بابت تو اس قسم کے واقعات تاریخ کے اوراق میں بکثرت ملتے ہیں کہ حکمراں کے مرتے ہی ان سے کچھ لوگوں نے اقتدار کی رسہ کشی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور حکومت پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گئے لیکن کیا کسی منظم، اصولی اور باقاعدہ منضبط فوج کے بارے میں بھی یہ سننے میں آیا ہے کہ اس نے اقتدار کی منتقلی میں اس سے گھٹیا کردار کا مظاہرہ کیا ہو جس کی نظیر ہمیں حضورؐ کے وصال کے بعد سقیفہ بنو ساعدہ کے ہنگامے میں نظر آتی ہے۔ واقعات کے تانے بانے پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ آج اتنی صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اصل حقیقت کا سراغ پانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ مگر قرون اولیٰ اور ازمنہ وسطیٰ کے لوگ منہ میں گھنگنیاں ڈال کر بیٹھے رہے اور ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کا مرقع بنے رہے۔ ہم نے دوسری جنگ عظیم کے ایک نامور ہیرو اور فاتح جنرل ڈگلس ہیک آرتھر کا حال اخباروں میں پڑھا ہے اسے جب امریکی صدر رہبری ٹرومین نے اس کے عہدے سے برطرف کیا تو وہ ڈسپلن کے پابند ایک فوجی کی طرح احتجاج کا ایک لفظ نکالے بغیر گھر آ کر بیٹھ گیا۔

مہذب قوموں کی یہی وہ روایتیں ہیں جو ان کے مستقبل کو تابناک اور ان کے حال کو درخشاں بناتی ہیں۔ بالخصوص فوجی نظم وضبط تو ایک ایسا قومی وملی تقاضا ہے کہ اس سے صرف وہی قومیں روگردانی کرسکتی ہیں جو فوضویت اور انارکی کی راہ پر گامزن ہوں۔ اور جن کا نصب العین کوئی نظریہ یا کوئی پروگرام نہیں بلکہ محض ہوس اقتدار ہو اور اقتدار کی اس جنگ کا جیسا بھونڈا مظاہرہ رسولؐ اللہ کے ان "مقربین بارگاہ" صحابہ نے کیا وہ "جیش اسامہ" سے خود کو مستثنیٰ کرلینے کی کارروائی سے صاف ظاہر ہے۔

شرمناک اور شرانگیز خطبہ

کتب حدیث وسیر کے اس مطالعے کے دوران جب میری نظر خلیفۂ اوّل ابوبکر ابن ابی قحافہ کے اس خطبے پر پڑی جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصال کے فوراً بعد غم واندوہ میں ڈوبے ہوئے مسلمانوں کے سامنے دیا گیا تو مجھے بڑا تعجب ہوا کہ یہ کون بول رہا ہے اور کہاں سے بول رہا ہے۔

یہ خطبہ دراصل اس ڈرامے کا نقطۂ عروج (CLIMEX) ہے جو اس موقع پر خلیفۂ دوم عمر ابن خطاب نے کھیلا تھا۔ حدیث میں آیا ہے کہ وہ ننگی تلوار لے کر مسجد نبوی کے دروازے پر کھڑے ہوگئے اور چلّانے لگے کہ: "جو شخص یہ کہے گا کہ محمدؐ انتقال فرما گئے ہیں میں اسے قتل کردوں گا۔" (سیرت النبیؐ ج ۱)

اتنے میں جب بنو اُمیہ کے حلیف قبیلہ بنو اسلم کے لوگ مدینہ میں داخل ہوگئے۔ تاریخ کے الفاظ میں مدینہ منورہ کی گلیاں بنو سلیم کے افراد سے کھچا کھچ بھر گئیں اور ڈرامے کا ایک اہم کردار جو اس مرحلے پر مدینہ سے باہر اپنی اراضی کی دیکھ بھال کیلئے گیا ہوا تھا یعنی جناب ابوبکر، تو اس نے آتے ہی مسجد نبوی میں یہ ایمان سوز خطبہ ارشاد

فرمایا کہ :- الا من کان یعبد محمدا فان محمدا اقدمات و من کان یعبد اللہ فان اللہ حی لا یموت ۔

(جو شخص محمدؐ کی پوجا کرتا تھا وہ سن لے کہ محمد مر گئے ہیں اور جو اللہ کی عبادت کرتا ہے وہ سن لے کہ اللہ زندہ ہے اور کبھی نہیں مرے گا۔)

اہلِ سنت کے پیشہ ور واعظوں اور بکاؤ خطیبوں کی تقریروں میں بارہا خلیفۂ اوّل کا یہ خطبہ سنا اور بے شمار کتابوں میں اسے پڑھا تھا وہ اسے توحید کا شاہکار خطبہ قرار دیتے رہے ہیں۔ لیکن حالات کی افتاد کے پسِ منظر میں جب میں نے اس مختصر سے خطبہ کا جائزہ لیا تو میں نے محسوس کیا کہ واقعی یہ خطبہ شاہکار ہے مگر خباثت نفس کا شوخ چشمی اور گستاخی کا، بے ادبی اور بے مروتی کا، بدلحاظی اور بدطینتی کا۔

بھلا جس معاشرے کی تشکیل حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توحید کی بنیادوں پر فرمائی ہو، جس ماحول اور معاشرے میں حضورؐ نے شرک اور بت پرستی کی ادنیٰ سی آمیزش بھی گوارا نہ کی ہو اس معاشرے میں کون ایسا بدبخت انسان تھا جو محمدؐ کی پرستش کرتا تھا۔ وہ محمد عربی علیہ وآلہ وسلم جنھوں نے اپنے خونِ جگر سے توحید کے عقیدے کی آبیاری کی، جس نے اسی عقیدۂ توحید کے لیے پورے عرب کی دشمنی مول لی۔ جس نے اسی توحید کی تبلیغ و اشاعت کے لیے سفر طائف کے دوران پتھر کھائے، جس نے توحید کے نظریہ کو دنیا میں پھیلانے اور اجاگر کرنے کے لیے احد میں اپنے دانت شہید کروائے اور اپنے چہرے پر زخم کھائے، اسی کی برپا کی ہوئی سوسائٹی اور اسی کے تیار کیے ہوئے سماج میں اس کی مسند پر زور زبردستی سے قبضہ کرنے والا شخص یہ کہہ رہا ہے۔

جو محمدؐ کی پرستش کرتا ہے سن لے کہ محمدؐ مر گیا۔

حدیث و تاریخ کی تمام کتابوں میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ جب حضورؐ کے اکلوتے اور چہیتے فرزند حضرت ابراہیمؑ کا عہدِ طفولیت میں انتقال ہوا تو اس روز سورج کو گہن

لگا۔ عربوں کا عقیدہ تھا کہ کسی بڑے آدمی کی موت پر سورج گہنا جاتا ہے۔

اولادِ نرینہ کی تمنا حضورؐ کی عمر بھر کی تمنا تھی اور اس تمنا کی لاش حضورؐ کی نظروں کے سامنے موجود تھی اس نازک اور دلگداز لمحہ میں بھی حضورؐ کو جس بات کا سب سے پہلا خیال آیا وہ بچے کی موت پر غم واندوہ کے جذبات کا اظہار نہ تھا بلکہ عربوں کی بدعقیدگی کی اصلاح کا خیال تھا۔ تعزیت کے لیے آنے والے افرادِ امت کے سامنے عقیدے کی درستگی پر حضورؐ نے سب سے پہلے توجہ مبذول فرمائی اور ارشاد فرمایا:

ان الشمس والقمر آیتان من آیات اللہ انہ لا ینخسفان لموت احد ولا لحیات احد۔

(سورج اور چاند خدا کی آیاتِ قدرت میں سے دو نشانیاں ہیں ان کے گہن میں آنے کا کسی کی زندگی اور موت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔)

خدا کا وہ آخری پیغمبر جس نے زندگی کے اس کٹھن مرحلہ پر جب کہ اس کے اپنے دل کا سورج گہنا گیا تھا۔ اپنے منصبِ رسالت کی ذمہ داریوں کو فراموش نہ فرمایا اور تصورِ توحید کو گہن نہ لگنے دیا اور وحدانیت خداوندی، عظمتِ الٰہی اور اس کی قدرت کی کارفرمائیوں کو اس طرح نمایا فرمایا کہ توحید کا نظریہ اور زیادہ نکھر کر سامنے آگیا۔

دراصل یہ گستاخانہ فقرہ کہہ کر خلیفۂ اوّل جناب ابوبکر ان لوگوں کو براہِ راست دھمکی دے رہے تھے جن کی وفاداریاں حضورِ اقدسؐ کی ذاتِ گرامی سے غیر متزلزل تھیں، جن کی دنیا و آخرت کا تمام تر سرمایا اور اثاثہ صرف حضورؐ کی ذات اقدس تھی۔ یہ انصار و مہاجرین کے وہ گنے چنے افراد اور اہلبیت اطہار کے گھرانے کے وہ مقدس ارکان تھے جن پر حضورؐ کی وفات شہادت آیات سے صدمات غم والم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ یہ انہیں دھمکایا جا رہا ہے کہ دیکھو اور خوب اچھی طرح سن لو کہ تمہاری نازبرداری کرنے والا، تمہاری ہر طرح رعایت ملحوظ رکھنے والا، تمہارے دکھوں، دردوں اور غموں میں تمہارا برابر کا ساجھی اور شریک اب

اس دنیا سے رخصت ہوا۔ اب ہماری نوبت ہے۔ ہم جو چاہیں گے کریں گے۔ ہمیں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے اور اگر تمہیں اپنی جان پیاری ہے اور اپنی عزت و ناموس کی حفاظت مطلوب ہے تو ہمارے فیصلوں پر چپ چاپ سر جھکا دو۔ اختیار و اقتدار حکومت پر اب ہمارا قبضہ مکمل ہو چکا ہے اب وہی کچھ ہوگا جو ہم چاہیں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس گستاخانہ خطبہ کو پڑھ کر ایک مسلمان کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ یہ بالکل وہی صورتِ حال ہے جس سے اپنے دَور کے جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کے ہاتھوں دو چار ہوئے تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے جس قوم پر اپنی نبوت و رسالت اور اپنے جسم و جان کی تمام توانیانیاں صرف کر دی تھیں۔ جب اس قوم نے حضرت موسیٰؑ کے احکام کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو انھوں نے دکھے دل کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں یہ درد بھری فریاد کی تھی کہ:- رب انی لا املک الا نفسی و اخی فافرق بیننا و بین القوم الفاسقین (مائدہ پ۶)

(خداوندا میں تو صرف اپنی اور اپنے بھائی (ہارونؑ) کی جان کا نذرانہ پیش کر سکتا ہوں بہتر ہے کہ ہمارے اور اس قوم کے درمیان جو نافرمان اور بدکردار ثابت ہوئی ہے ہمیشہ کے لیے جدائی ڈال دے۔)

تاریخ نے پھر ایک بار خود کو دہرایا اور خدا کے آخری اور برگزیدہ پیغمبر کی اُمت نے اپنے جلیل القدر محسن و ہادی کے ساتھ وہی سلوک کیا جو موسیٰؑ کی اُمت نے ان سے اور اُن کے بھائی سے کیا تھا۔ شاید تاریخ دعوت و عزیمت کی یہ بھی ایک مستقل روایت رہی ہے کہ جن لوگوں کی اصلاح و فلاح کے لیے پیغمبر اپنی پوری زندگی صرف کر دیتا ہے وہ قوم احسان فراموشی ناسپاسی اور قدر ناشناسی کی ایسی ہی حرکات کی مرتکب ہوتی رہی ہے۔

حضرت علیسیٰؑ کو تو ان کے بارہ حواریوں میں سے صرف ایک حواری کی غدّاری سے تختہ دار تک پہونچنا پڑا لیکن حضورؐ کے معاملے میں تو حواریوں کی ایک کثیر تعداد ہے جو دشمنی

بہ آستین اور خنجر بہ کف اپنے پیغمبرؐ کے ساتھ غدرِ عہد کی مرتکب ہو رہی ہے۔ سچ ہے۔

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

اور شاید یہی وہ نکتہ تھا جن کی جانب حضور اکرم صلی اللہ وآلہ وسلم نے اپنے اس ارشادِ گرامی کے ذریعے دنیا کو متوجہ فرمایا تھا کہ:

ما اذی بنی قط کما اوذیت۔

(کسی پیغمبر کو اتنا نہیں ستایا گیا جتنا مجھے ستایا اور دکھ دیا گیا۔)

دوسرے انبیاء علیہم السلام کی اذیتوں کا سلسلہ تو ان کی زندگیوں تک محدود رہا مگر حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایذا رسانی کا سلسلہ تو حضورؐ کے وصال کے بعد بھی جاری رہا بلکہ جو لوگ حضورؐ کی موجودگی میں کسی وجہ سے حضورؐ کی ایذا رسانی میں شامل تھے حضورؐ کے بعد انہیں کھیل کھیلنے کا زیادہ موقع ملا اور انہوں نے خوب دل کی بھڑاس نکالی۔

شتر کینہ قوم

کسی انسان کو ایذا پہنچانے کی بدترین صورت یہ ہے کہ اس کے بچوّں کو اس کے خاندان کے قریبی افراد کو اور اس کے اہلِ بیت کو ستایا دھمکایا اور ہراساں کیا جائے اور اس باب میں خلافتِ راشدہ نے جو کارنامے انجام دیئے وہ اہلِ بصیرت سے مخفی نہیں ہیں۔ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آثار و قرائن کے ذریعے بھی اور وحی خداوندی کی بناء پر بھی یہ احساس ہو گیا تھا کہ عربوں کی شتر کینہ قوم آپ کے خاندان سے بغض و عناد کے درپردہ جذبات رکھتی ہے اسی لیے حضورؐ نے جناب زید بن ارقم کی روایت کے مطابق جسے مشہور محدث مسلم نے اپنی کتاب "صحیح مسلم" میں درج کیا ہے صحابہ سے مخاطب ہو کر تین مرتبہ یہ فقرہ دہرایا۔ اذکرکم اللہ فی اھل بیتی (اپنے خاندان والوں کے بارے میں تمھیں بہ طور

خاص متنبہ کرتا ہوں کہ ان سے معاملہ کرتے ہوئے اللہ رب العزت کی خوشنودی کو ملحوظ خاطر رکھنا)

جب سارا عرب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغمبرانہ عظمت کے سامنے سرنگوں ہوگیا تو وہ لوگ جو درپردہ حضورؐ کے دشمن تھے اور وہ لوگ جو حضورؐ سے خاندانی رقابت رکھتے تھے انگاروں پر لوٹنے لگے۔ حضورؐ کو اس امر کا احساس تھا کہ یہ لوگ حضورؐ کے بعد حضورؐ کے افراد خاندان سے بدلے چکائیں گے جیسا کہ حضورؐ نے ایک موقعے پر امیر المومنین سیدنا علی علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ :-

ضغائن فی صدور اقوام لایبد ونھا لك الا بعدی (کامل ابن اثیر ج ۲ ص۲۶)

(کچھ لوگوں کے سینوں میں تمہارے خلاف بغض وکینہ کے جذبات پنہاں ہیں میرے بعد وہ لوگ تمہارے ساتھ معاندانہ رویہ کے ذریعے ان جذبات کا اظہار کریںگے۔)

چنانچہ لسان نبوت ووحی نے جس امر واقعہ کی خبر دی تھی وہ ظاہر ہو کر رہا۔

قرآنِ مقدس نے جب یہ کہا تھا کہ :

قل لآ أسئلکم علیه اجرا الا المودة فی القربیٰ

(اے پیغمبرؐ! آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے اپنی اس پیغمبرانہ جدوجہد کا کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا۔ ہاں یہ چاہتا ہوں کہ میرے قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا)

تو یہ بھی دراصل اسی خطرہ کی نشاندہی تھی جو حضورؐ کو اپنے نام نہاد صحابہ کے متوقع طرز عمل سے لاحق تھا اور بعد کے واقعات نے ثابت کر دکھایا کہ ابوبکر وعمر سے لے کر معاویہ تک اور ہندہ سے لے کر عائشہ تک سب ہی نے اپنے طرز عمل سے اس اندیشہ پر مہر تصدیق ثبت کر دی جسے پیغمبرؐ نے اپنی بصیرت وفراست سے جو وحی الٰہی کی صیقل سے مجلّا ومنوّر ہوئی تھی۔ محسوس فرمایا تھا۔

یہ آیت بجائے خود اس امر کا بین ثبوت ہے کہ رسول اللہ کے نام نہاد صحابہ خاندانِ نبوت کے بارے میں کیا عزائم رکھتے تھے۔ قرآن مقدس نے بہت سے انبیاء کے

تذکرہ میں یقوم لا اسئلکم علیہ اجر ان اجری الا علی اللہ (میں تم سے اپنی خدمات کا کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔) کا فقرہ بھی نقل کیا ہے۔ یہ صرف حضورؐ کی ذات ہے جس سے یہ کہلوایا گیا کہ میں تم سے اجرِ رسالت کا طلبگار ہوں اور وہ یہ کہ میرے قریبی رشتہ داروں سے حسنِ سلوک کا معاملہ کیا جائیگا۔ ظاہر ہے کہ اگر امت کی جانب سے نبیؐ کے قرابت داروں سے ساتھ بدسلوکی کا اندیشہ نہ ہوتا تو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

بعض نابلد اور کم فہم لوگ یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ "مودۃ فی القربیٰ" کی اس آیت کریمہ کا وہ مفہوم درست نہیں ہے جو اس سے شیعہ مراد لیتے ہیں بلکہ اس آیت کا سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ:-

"میرا اجرِ رسالت یہ ہے کہ تم اپنے رشتہ داروں سے محبت کا برتاؤ کرو۔"

اوّل تو یہ بات ہی سرے سے بے ربط اور انمل بے جوڑ ہے ذوی القربیٰ سے حسن معاملت کا حکم قرآن مقدس میں کئی جگہ آیا ہے۔ اس کا پیرایہ بیان اور اسلوبِ عبارت بالکل مختلف ہے۔ اجرِ رسالت تو حضورؐ کا ذاتی اور نجی معاملہ ہے۔ اس کا مسلمانوں کی باہمی قرابتوں کی پاسداری سے کیا تعلق ہو سکتا ہے اس لیے اسلام کے بیشتر نامور مفسرین نے خواہ وہ کسی بھی مکتبِ فکر کی نمایندگی کرتے ہوں اس سے مراد حضورؐ کے اپنے قرابت دار لیے ہیں اور یہی قرینِ قیاس بھی ہے اور قرینِ صواب بھی۔ بلکہ ایک نامور سنّی عالم اور ساتویں صدی ہجری کے ایک زبردست صوفی بزرگ امیر کبیر سید علی ہمدانی نے "مودۃ القربیٰ" کے عنوان سے فضائل اہلِ بیتؑ پر ایک مستقل کتاب تصنیف فرمائی ہے۔

اس آیتِ کریمہ سے جہاں اہلِ بیتؑ نبوت کی عظمت کا واضح اشارہ ملتا ہے وہاں خود پیغمبرؐ کی مظلومیت و بے چارگی کا بھی پتہ چلتا ہے کہ جس قوم کی فلاح و بہبود کے لیے حضورؐ نے دن رات ایک کر دیئے۔ جس نے ایک پراگندہ اور منتشر قوم کو پستیوں سے

نکال کر اجتماعیت، وحدت اور شیرازہ بندی کی بلندیوں تک پہونچا، خود اس قوم کی جانب سے اپنے خاندان کے معاملے میں کیسے کچھ خطرات حضورؐ کو لاحق تھے اور وقت نے بہت جلد انہیں ثابت کر دکھایا۔

صحیح مسلم کی وہ روایت جس میں اہلِ بیتؑ کے معاملے میں خدا سے ڈرتے رہنے کی تلقین کی گئی ہے اس پر بھی بعض بر خود غلط لوگ یہی اعتراض پیش کرتے ہیں کہ اپنے اہلِ بیتؑ سے حسن سلوک کی تلقین پیغمبرانہ مقام کے منافی ہے اور اس لیے ایسی روایتیں موضوع ہیں کیونکہ ان روایتوں سے پیغمبرؐ پر خویش پروری اور اقربا نوازی کا الزام عائد ہوتا ہے۔ لیکن حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حالات کے جس تناظر میں اس قسم کی ہدایت فرمائی اگر وہ پیشِ نظر ہوں تو ایسے تمام اعتراضات لایعنی اور مہمل قرار پاتے ہیں۔

حضور اقدس صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ایک ایسے ماحول میں ہوئی جہاں قبائلی نظام اپنی تمام تر عصبیتوں کے ساتھ قائم تھا۔ قبائلی نظامِ زندگی میں حریفانہ کشمکش کی داستان محتاجِ بیان نہیں۔

نبوت و رسالت ایک موہبت خداوندی اور ایک عطیہ الٰہی ہے۔ حضورؐ قریش کے ایک نامور قبیلہ بنو ہاشم سے تعلق رکھتے تھے۔ قبائلی نظامِ زندگی میں کسی قبیلے کے کسی ایک فرد کا کسی اعزاز سے متصف ہونا حسد و رشک کا باعث بنتا ہے۔ اسی سبب سے عرب کے دوسرے قبیلے بنو ہاشم سے چشمک رکھتے تھے۔ چنانچہ بنو ہاشم سے دیگر قبائلِ عرب کی اس رقیبانہ بلکہ حریفانہ روش کا شکوی ایک مرتبہ حضورؐ کے چچا حضرت عباس نے حضورؐ سے کہا یہی شکایت ان لوگوں سے حضرت علیؑ کو بھی تھی۔ حضورؐ کے دیگر اعزّہ و اقارب کو بھی یہی گلہ تھا۔

کیا یہ اقتدار کی جنگ تھی؟

حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفر و باطل کے خلاف جتنی جنگیں لڑیں ظاہر

ہے کہ کوئی ایسا شخص جس کے دل میں ایمان کا شائبہ بھی موجود ہو وہ ان جنگوں کو ہوس اقتدار کی جنگ قرار نہیں دے سکتا۔ اگر حضورؐ کا مطمع نظر ذاتی اقتدار ہوتا تو ان قبائل کی حضورؐ کے خاندان سے دشمنی سمجھ میں آسکتی تھی لیکن اگر حضورؐ کے پیش نظر صرف اعلائے کلمۃ اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ تھا تو اسلام کے حلقہ بگوش ہو جانے کے بعد ان قبائل کو بنو ہاشم سے دشمنی کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح امیر المومنین سیدنا علیؑ ابن ابی طالبؑ کی رزم آرائیوں نے تقریباً تمام غزوات میں جو فیصلہ کن کردار ادا کیا اور ان کی شمشیر ذوالفقار نے معرکۂ حق و باطل میں جو جوہر دکھائے ظاہر ہے کہ وہ بھی نہ تو اس مقصد سے تھی کہ ذاتی شجاعت کی دھاک بٹھائی جائے نہ اس لیے تھی کہ بنو ہاشم کا اقتدار قائم کیا جائے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذہن قبائلی عصبیت سے کس درجہ پاک اور منزہ تھا اس کی ایک شان دار مثال حضرت حمزہ کا وہ مشہور واقعہ ہے جب ابو جہل نے حضورؐ کو گالیاں دیں اور آپ کی شان میں نازیبا کلمات کہے اور آپ کی توہین کا مرتکب ہوا تو حضرت حمزہ اگرچہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے مگر بھتیجے کے ساتھ بدسلوکی کی خبر سن کر سخت غضبناک ہوئے اور بھری مجلس میں ابو جہل کے سر پر غرور کو اپنی کمان کے وار سے زخمی کیا اور حضورؐ کو آکر بتایا کہ وہ ابو جہل سے اس کی بدسلوکی کا انتقام لے آئے ہیں۔ اس پر حضورؐ کی بے لوث شخصیت کا عظیم مظاہرہ ہوا۔ آپؐ نے حضرت حمزہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"عم محترم! مجھے اس سے ذرّہ بھر خوشی نہیں ہوئی کہ آپ نے ابو جہل سے میرا انتقام لے لیا۔ مجھے خوشی تو جب ہوتی کہ آپ میرا پیغام توحید قبول کر لیتے۔" (سیرۃ النبیؐ ج ۱)

امیر المومنین سیدنا علی علیہ السلام کا یہ واقعہ ہی کتب تاریخ و سیر میں موجود ہے کہ دشمن سے دو بدو مقابلہ میں جب آپ نے دشمن کو زیر کیا تو اس نے آپؑ کے منہ پر اپنے منہ کا پانی ڈال دیا۔ امیر المومنینؑ نے اسکے قتل سے ہاتھ روک لیا۔ اسے بڑا تعجب ہوا کہ اس ذلیل حرکت پر تاؤ کھانے کے بجائے اس کی جاں بخشی ہو گئی۔ اس پر امیر المومنینؑ نے اسے بتایا کہ میرا اور تمہارا مقابلہ کسی ذاتی

دشمنی کے نتیجے میں نہ تھا مگر جب تم نے یہ حرکت کی تو میرا ذاتی غصہ بھی اس میں شریک ہو گیا اور میں یہ نہیں چاہتا کہ میرا کوئی عمل بھی رضائے خداوندی سے ہٹ کر میری اپنی ذات کے لیے ہو۔

اس بے نفسی اور بے غرضی کے باوصف محض اس جرم میں کہ یہ دونوں مقدس شخصیتیں، بنوہاشم کے قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں۔ دوسرے قبائل نے بنوہاشم سے دشمنی کا وطیرہ اختیار کیا بالخصوص سیدنا حضرت علیؑ تو "گل است سعدی و در چشم دشمناں خار است" مصداق ہو کر رہ گئے۔

اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عرب کا کوئی قابلِ ذکر قبیلہ ایسا نہ تھا جس کا کوئی سورما اس ناقابلِ تسخیر انسان کی ضرب ید اللّٰہی کا نخچیر نہ بنا ہو، ان کی شجاعت و شامت اور ان کی دلاوری وزور آوری کا پورے قبائلِ عرب میں کوئی حریف و ہمسر نہ تھا۔ اور یہی بات قبائلِ عرب کو آتش زیر پا رکھتی تھی لیکن جس طرح حضور اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی معرکہ آرائی ان کے اپنے ذاتی اقتدار کے لیے نہ تھی بعینہٖ حضرت علیؑ کی رزم آرائی نہ تو اپنی شجاعت کا سکہ جمانے کیلئے تھی۔ نہ بنوہاشم کا اقتدار قائم کرنے کی خاطر، نہ اس سے ان کا کوئی ذاتی مفاد وابستہ تھا مگر برا ہو قبائلی عصبیت کا کہ سیدنا علی ابنِ ابی طالبؑ کا وجود مسعود قبائلِ عرب کی خاندانی نخوت و رعونت کیلئے ایک چیلنج بن گیا۔ اگرچہ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فتح مکہ کے روز اس نخوت و رعونت اور قبائلی عصبیت کی اس بیمار ذہنیت کو یہ کہہ کر مسترد فرمایا دیا تھا کہ:۔

یا معشر قریش "ان اللہ اذھب عنکم نخوۃ الجاھلیہ وتفاخرھا بابائکم۔" (بخاری ومسلم)

"اے گروہِ قریش اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کے غرور، خاندانی برتری کے تصور اور آباؤ اجداد کے کارناموں پر فخر وناز کی رسم بد کو مٹا دیا ہے۔

لیکن صدیوں کی خاندانی روایات کا اثر ذہنوں سے اتنی جلدی محو نہیں ہوتا۔ حضورؐ نے اس چیز کو محسوس فرمایا اور اپنے اہلبیت کے بارے میں بار بار مسلمانوں کو انتباہ فرمایا کہ میرے

اہلِ بیتؑ نے میدانِ جہاد میں جو کارگزاری پیش کی ہے وہ دین کی سربلندی کے لیے تھی۔ انہوں نے ذاتی اغراض کے تحت کچھ نہیں کیا۔ اس بناء پر جو لوگ ان سے بغض رکھیں گے وہ گویا خود مجھ سے بغض رکھیں گے اور جو ان سے عہد محبت کو استوار کریں گے وہ در حقیقت مجھ سے پیمان وفا باندھیں گے اور در حقیقت یہی مفہوم ہے اس آیتِ کریمہ کا جس میں "مودۃ فی القربیٰ" کا تقاضا کیا گیا ہے۔ یا زید بن ارقم کی اس روایت کا کہ "اہلِ بیت کے معاملے میں محتاط رہو۔"، یہ خویش پروری یا اقربا نوازی نہیں تھی بلکہ جاہلی عصبیت اور قبائلی تعصب کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھی جسے آج بعض خود غرض لوگ بڑی ڈھٹائی سے غلط معنی پہناتے ہیں۔

حدیث غدیر

حضور اقدس صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب سیدنا علیؑ کو من کنت مولاہ فعلی مولاہ [1] (جس کا میں آقا ہوں علیؑ بھی اس کا آقا ہے۔) کی خلافت پر متمکن فرمایا

---

[1] من کنت مولاہ فعلی مولاہ کی اس روایت کو جسے حدیثِ غدیر کا نام دیا گیا ہے۔ ایک سو دس [۱۱۰] سے زیادہ صحابہ نے روایت کیا ہے۔ تابعین کے گروہ میں سے چوراسی [۸۴] حضرات نے یہ روایت نقل کی ہے۔ تین سو ترپن [۳۵۳] علمار نے اس روایت کا حوالہ دیا ہے۔ پچیس [۲۵] مؤرخوں نے، ۲۷ محدثین نے، ۱۱ مفسرین نے، اٹھارہ متکلمین نے اس حدیث کو اپنی اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے لغت کے نامور علماء نے بھی اس حدیث سے استناد کیا ہے، اور ستائیس نامور علمار نے حدیث کے موضوع پر کتابیں لکھیں۔ یوں اس حدیث کا پایۂ تواتر کے درجے تک پہونچا ہوا ہے اور خبر متواتر کا انکار کفر ہے۔ مشہور مؤرخ یعقوبی (متوفی ۲۷۸ھ) اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ:۔

حرج النبی صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم لیلا منصرفا الی الحدنۃ فصار الی الموضع بالقرب من الحجفہ (بقیہ حاشیہ ص ۱۱۱ پر)

تھا تو یہ بھی خویش پروری اور اقربا نوازی کا مظاہرہ نہ تھا۔ بلکہ پروانۂ شمع نبوت اور جان نثار رسالت کی ان والہانہ اور بیش بہا کارگزاریوں کا صلہ تھا جو امیر المومنین علیہ السلام

یقال لہ "غدیر خم" لثمانی عشر لیلۃ خلت من ذی الحجۃ وقام خطیبا واخذ بید علی ابن ابی طالب علیہ السلام فقال "الست اولی بالمومنین من انفسھم قالو بلیٰ یا رسول اللہ قال فمن کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم وال من والاہ وعاد من اعداہ (ج ۲ ص ۹۳)

(حاشیہ ص ۱۱۱) حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم حجۃ الوداع سے فارغ ہو کر رات کے وقت مدینۂ منورہ کے لیے روانہ ہوئے اور اٹھارہویں ۱۸ ذی الحجہ کو جحفہ کے قریب ایک مقام "غدیر خم" میں تشریف فرما ہوئے۔ یہیں حضورؐ نے وہ خطبہ دیا جس میں سیدنا علی علیہ السلام کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا۔ کیا میں مسلمانوں پر ان کی جان سے زیادہ حق نہیں رکھتا ہوں؟ سب نے اثبات میں جواب دیا، تب حضورؐ نے فرمایا جس کا میں مولا ہوں علیؑ بھی اس کا مولا ہے۔ خدایا تو اس سے دوستی رکھ جو علی کا دوست ہو اور تو اس سے دشمنی رکھ جو علی کا دشمن ہو۔"

حدیثِ غدیر پر یوں تو بہت سی کتابیں لکھی گئیں لیکن "الغدیر" کے نام سے بیس جلدوں میں ایک معرکہ آرا کتاب عراق کے ایک نامور عالم علامہ امینی نے ترتیب دی ہے جس کی گیارہ جلدیں طبع ہو کر علمی حلقوں سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔

یہ کتاب اسلام کے ورثۂ علمی کا شاہکار ہے کہ تاریخ اسلامی میں اس کی جامعیت کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ کتاب جو اپنے موضوع کی وسعت کے اعتبار سے ایک انسائیکلوپیڈیا یا دائرۃ المعارف کا درجہ رکھتی ہے بیک وقت تاریخ بھی ہے اور تنقید تاریخ بھی۔ یہ فن حدیث پر نقد و نظر بھی ہے اور فن رجال پر سیر حاصل تبصرہ بھی۔

کتنے ہی عماموں کے پیچ اس کتاب کی گرہ کشا تحریر سے ڈھیلے پڑ (بقیہ حاشیہ ص ۱۱۲ پر)

نے ہر معرکہ میں سرانجام دیں۔ اس باب میں اگر کسی دوسرے شخص کا وہ

(بقیہ حاشیہ صـ۱۱۱) گئے ہیں۔ عقیدتوں کے کتنے پربت اس کی ضرب یداللّٰہی سے شکست و ریخت ہوئے ہیں اور کتنے ہی مبروص چہروں سے اس نے نقاب اٹھایا ہے۔

مسلک جعفریہ کی تائید و حمایت میں بہت سے قلم تلوار بنے لیکن اس کتاب کے مصنف علّام نے جس طرح اپنے قلم کو ذوالفقار بنایا ہے اس کی داد صرف اہلِ علم و نظر اور ارباب فکر و دانش ہی دے سکتے ہیں۔ اس کتاب نے خلافتِ راشدہ کی نام نہاد عظمت کو طشت ازبام کیا ہے اور خلفائے ثلاثہ کی شخصیتوں کو اس طرح عریاں کر دیا ہے کہ عقیدتوں کے آبگینے ٹوٹ کر رہ گئے ہیں اور عظمتوں کے تاج محل مسمار ہو کر رہ گئے ہیں۔ خون کا وہ سرطان جس نے پچھلی ۱۴ صدیوں سے ملّتِ اسلامیہ کے جسدِ ظاہری کو مضمحل اور اس کے باطن کو مسموم کر رکھا ہے۔ اس کا مداوا اگر کوئی کتاب بن سکتی ہے اور اس کا علاج اگر کسی دارالشفا میں مل سکتا ہے تو وہ صرف اس کتاب کے اوراق میں دستیاب ہے۔ الغدیر کی گیارہ ضخیم جلدیں جہاں مصنّف کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت اور تحقیق و تدقیق کا نادر نمونہ ہیں۔ وہاں اہلبیتؑ اطہار کے مقام بلند کا واضح نقشہ بھی اس سے ذہن میں اُبھرتا ہے اور مقامِ اہلبیت کے منکروں کے لیے تو یہ کتاب اپنے گوناگوں دلائل اور بوقلموں مضامین کے اعتبار سے سند و حجت کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ ایک بلند پایۂ دستاویز ہے جسے شیعیانِ علیؑ کے موقف کی تائید و حمایت میں ہمیشہ حجت قاطعہ،، کی حیثیت حاصل رہے گی۔

الغدیر کے مؤلف نے اس کتاب میں ان تمام روایات و احادیث کو اسناد کے اہتمام کے ساتھ جمع کر دیا ہے جنھیں گذشتہ تیرہ سو سال میں ہر مکتب فکر کے علماء و محدثین اہل تاریخ و سیر اور اصحابِ تفسیر و کلام نے اپنی مستند و معتبر کتابوں میں امیرالمؤمنین علی علیہ السلام کے فضائل و مناقب میں پیش کیا گیا ہے۔

الغدیر کا بنیادی موضوع چونکہ حدیث "غدیر خم،، ہے۔ اسی (بقیہ حاشیہ صـ۱۱۳ پر)

ریکارڈ ہو جو سیدنا علیؑ کا اسلامی اور مجاہدانہ خدمات کا ہے تو اسے پیش کیا جائے فضیلت

(بقیہ حاشیہ صـــ۱۱۲) مناسبت سے کتاب کا نام "الغدیر" رکھا گیا ہے۔ کتاب کے مصنف نے اس حدیث کی صحت روایت کو ثابت کرنے کے لیے بیشمار کتب حدیث وسیر کو چھان مارا ہے۔ بالخصوص اہلِ سنت کی تمام مستند و معتبر کتب کو کھنگال کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہر دور میں محدثین و مؤرخین نے اس روایت کی صحت کو تسلیم کیا ہے۔ مصنف نے اللہ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے اپنا پورا زورِ بیان، زورِ قلم اور زورِ تحقیق اس امر پر صرف کیا ہے کہ حدیثِ غدیر خبر متواتر کا درجہ رکھتی ہے۔ اور وہ اس امر کو دلائل و براہین کے ساتھ ثابت کرنے میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔

کتاب کا اسلوب مناظرانہ نہیں ہے محققانہ ہے۔ اس لیے اس میں نہ کہیں کسی کی دل آزاری کی گئی ہے، نہ کسی فرقے پر کیچڑ اچھالی گئی ہے نہ کسی شخصیت کو بلا وجہ نشانۂ تنقید بنایا گیا ہے۔

حدیثِ غدیر کے اس تواتر کے باوجود جو لوگ امیرالمؤمنین سیدنا علی ابن ابی طالب کرم اللہ تعالیٰ وجہہٗ کی ولایت کے قائل نہیں ہیں۔ یہ جن حضرات نے سیدنا علی علیہ السلام کی ولایت کو قبول کرنے سے انکار کیا، ان کے حق کو غصب کیا اور حدیثِ غدیر کی روح کو ملحوظ نہیں رکھا اور مسندِ حکومت پر بزور قبضہ کر کے اپنی خلافت کی بساط بچھائی۔ مؤلف کتاب نے ضمناً ان شخصیتوں کا تذکرہ بھی تاریخ کے اوراق میں محفوظ کر دیا ہے تاکہ آنے والی نسلیں از خود جائزہ لے کر یہ فیصلہ کر سکیں کہ آیا غاصب حق پر تھے یا جنابِ امیرؑ کا موقف صحیح تھا۔

کتاب میں جو ضمنی مباحث معرضِ بحث میں آئے ہیں بنیادی طور پر ان کا تعلق بھی ولایت امیرالمؤمنین سے ہے حضور سرکار رسالت مآبؐ کے بعد ان کی جانشینی اور خلافت کا معاملہ امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا یا اس باب میں خود حضورؐ کی اپنی خواہش اور مرضی کو بھی کچھ اہمیت حاصل ہے یہ وہ بنیادی نکتہ اور اصولی بحث ہے جس پر کتاب میں بڑی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے غرضیکہ بحث و نظر کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو مؤلف علام کی نگاہوں سے چھپا رہ گیا ہو۔ اور کسی پہلو (بقیہ حاشیہ صـــ۱۱۴ پر)

کی خود ساختہ، من گھڑت اور جعلی روایتوں کے ذریعے نہیں حقائق کی روشنی میں جائزہ لیجئے کہ گروہِ صحابہ میں کون ایسا ہے، بجز علیؑ ابنِ ابی طالبؑ کے جس نے حضورؐ کے لیے خود سپردگی اور فداکاری کا ایسا نمونہ پیش کیا ہو جیسا کہ حضرت علی نے کیا۔

بدر و احد و خندق و خیبر و حنین میں کس کی شجاعت اور کس کے زورِ بازو اور کس کی تیغ خاراشگاف نے دشمنانِ دین کو پیوندِ خاک کیا۔ دعوت ذی العشیرہ میں انا نصیرک یارسول اللہ (میں یارسول اللہ آپ کی نصرت و حمایت کروں گا۔) کے غیر مشروط عہدِ وفاداری کو سب سے زیادہ کس نے نبھایا؟ کیا آج تک تاریخ کسی ضعیف روایت کے ذریعے بھی کسی نام نہاد جانشین پیغمبرؐ کو سیدنا علیؑ کے مقابلے میں لانے کی جرات کر سکی ہے؟ "دکھ بھریں بی فاختہ اور کوّے انڈے کھائیں"۔ اہلِ سنّت حضرات سے التماس ہے کہ وہ حالات کا معروضی جائزہ لیں تو انہیں اندازہ ہو گا کہ پروردۂ آغوش نبوت بھی علیؑ معہ رہا بھی علیؑ، تیغ زن بھی علیؑ، فاتح بدر و احد و خندق و خیبر بھی علیؑ، شب ہجرت بستر نبوت پر سونے والا بھی علیؑ، پیغمبرؐ کی امانتوں کو ادا کرنے والا بھی علی،

(بقیہ حاشیہ صـ۱۱۳) کو انہوں نے تشنہ نہیں چھوڑا اور کسی موضوع کو نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ یہ علامہ امینی کا ایسا علمی کارنامہ ہے جس پر پوری ملّتِ اسلامیہ ان کی ممنون احسان رہے گی۔ بالخصوص ملّتِ جعفریہ تو ان احسانات کے بارے میں کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی کہ انہوں نے صدیوں کے ماہ و سال اور روز و شب پر پھیلے ہوئے لاکھوں صفحات کو جو متفرق مضامین کی شکل میں ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے یک جا کر دیا اور ان کی شیرازہ بندی اس خوش اسلوبی سے کی ہے کہ اہلِ فکر و نظر کے ہاتھ مجتمع اور مرتب شکل میں ایک ایسا بیش قیمت اثاثہ آگیا ہے جو صدیوں کی سرشاری کا سروسامان اپنے اندر رکھتا ہے۔

وقت نے مہلت دی اور حالات کی مساعدت رہی تو انشاء اللہ بہت جلد اسی کتاب کی تلخیص و ترجمہ کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی سعادت نصیب ہوگی۔

باب مدینۃ العلم بھی علیؑ، آیات برات کا اعلان کرنے والا بھی علیؑ، یمن کی مہم کا سپہ سالار بھی علیؑ، غدیر خم کا ہیرو بھی علیؑ اور قیادت کی باگ ڈور سپرد کرنے کا وقت آئے تو پیغمبرؐ محض خویش پروری اور اقربا نوازی کے الزام سے بچنے کے لیے اپنی خلافت اپنی سسرال کو ہبہ کر جائے۔

داماد خلیفہ بنے تو خویش پروری اور خسر بنے تو انصاف پسندی، جس کو لڑکی دی ہے وہ مسند خلافت پر متمکن ہو نبوت پر حرف آئے اور جس کی لڑکی ہے وہ خلیفہ بن جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ داماد کا رشتہ زیادہ اہم ہے یا سسر کا، نسبی تعلق زیادہ قوی ہوتا ہے یا ازدواجی، اگر پیغمبرؐ نے سسر کو یا بیوی کے کسی قریبی عزیز کو جانشینی کا اعزاز بخشا تو گویا اس نے نسبتی قرابت پر ازدواجی رابطہ کو ترجیح دی۔ یہ ایک ایسی انہونی بات ہے کہ پیغمبرؐ تو بجائے خود رہا۔ اگر کوئی مرد معقول بھی اس قسم کی مذبوحی حرکت کرے تو اس کا شمار عقلمندوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح جو شخص سسر کو داماد پر فوقیت دیتا ہے وہ غیر اہم کو اہم پر فوقیت دینے کا قصور وار ہے اور یہ بات بھی پیغمبرانہ فراست کے سراسر منافی ہے اور پھر داماد بھی وہ کہ جو نسبی قرابت میں سب سے سبقت لے گیا ہو۔

ایمان ابو طالبؑ

خانوادۂ بنو ہاشم سے عربوں کے بغض و حسد اور امیر المومنین علیؑ سے ان کی کینہ توزی کا ایک اور ثبوت ایمان حضرت ابو طالبؑ کا معاملہ ہے۔ تاریخ و حدیث کی تمام کتابیں جو اہلِ سنّت والجماعت کے نامور محدثین و مؤرخین نے مرتب کی ہیں اس امر پر متفق ہیں کہ حضرت ابو طالبؑ نے زندگی کے آخری لمحات میں کلِ توحید پر ایمان لانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ اخترت النار علی العار (مجھے جہنم کی آگ قبول ہے مگر اپنے

آبائی مسلک کے منحرف ہونے کی عار منظور نہیں۔) اس پر حضورؐ نے اپنے اس محسن و مربی چچا کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا تھا کہ" دوزخ میں سب سے کم عذاب ابو طالبؑ پر ہوگا ان کو آگ کے جوتے پہنائے جائیں گے جن سے ان کا دماغ یوں کھولنے لگے گا جیسے چولھے پر ہنڈیا کھولتی ہے۔" (والعیاذ باللہ) چونکہ دورِ بنی اُمیہ و بنی عباس کے خود فروش علماء و محدثین و فقہا کے دل کا ناسور صرف سیدنا علیؑ ابن ابی طالبؑ کی ہمہ جہتی فضیلت و عظمت ہے اس لیے ان کی مقدور بھر کوشش یہ رہی ہے کہ کوئی ایسی دور کی کوڑی لائی جائے اور کوئی ایسا قصہ گھڑا جائے جس سے سیدنا علیؑ کی عظمت پر حرف آئے اور عامۃ الناس کی نگاہوں میں ان کی قدر و منزلت کو کم کیا جائے۔ چنانچہ سیدنا ابو طالبؑ کے کفر کا معاملہ بھی اسی قسم کے مخترعات ذہنی کی ایک گھٹیا مثال ہے کہ اس سے جہاں حضرت ابو طالبؑ کی توہین و تذلیل کا پہلو نکلتا ہے وہاں بالواسطہ سیدنا علیؑ کی شخصیت بھی مجروح ہوتی ہے۔

وہ حدیث جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے وضع حدیث کی ایک ایسی بیہودہ اور بھونڈی کوشش ہے کہ عقل و منطق اور روایت و دانش کے جس پہلو سے اس کا جائزہ لیا جائے یہ ایک لچر بلوچ اور لغو سخن سازی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ستودہ صفات سراپا مروت و حیا تھی۔ ایک ایسی شخصیت گرامی جس کی حیا چشمی کا یہ عالم تھا کہ گو عبداللہ بن ابی منافقوں کا سردار اور مدینہ منورہ میں دشمنان رسولؐ کا سرغنا تھا مگر چونکہ اس کا فرزند ایک سچا مسلمان تھا تو حضورؐ نے محض اس کے فرزند کی دلداری اور دل جوئی کی غرض سے اس رئیس المنافقین کے جنازے میں شرکت فرمائی۔

ایک طرف تو حضورؐ کی مروت و رواداری کا یہ عالم دوسری جانب اپنے عمر بھر کے غمگسار اپنے عمِ بزرگوار اپنے محسن و مشفق چچا کے معاملے میں ایسی بے مروتی کہ ان کی زندگی بھر کی وفاؤں کا پاس کیا نہ ان کے فرزند اور اپنے عزیز ترین رفیق کار علیؑ ابن ابی طالبؑ کی دلشکنی کا احساس فرمایا نہ اپنی اس مہربان چچی کے جذبات غم و ماتم کا احترام کیا جس کے

بارے میں وہ فرما چکے تھے کہ:

لم ار بعد ابی طالب ابر بی منہا -

(ابو طالبؑ کے بعد مجھ پر سب سے زیادہ احسان کرنے والی عورت میری چچی تھی۔)

وہ چچی جسے رسول اللہ "اُمّی بعد امی" (ماں کے بعد ماں کی طرح میرا خیال رکھنے والی) فرماتے تھے۔ دوسری بات ورقہ بن نوفل کا معاملہ ہے، ان کے تذکرہ میں ہماری تمام کتابیں ہمیں خبر دیتی ہیں کہ ان کے مجرد اتنا کہہ دینے سے کہ: "اگر میں اس وقت تک زندہ رہا جب یہ لوگ تمہیں مکّہ سے باہر نکال باہر کریں گے تو میں تمہاری مدد کرونگا" حضورؐ نے ورقہ بن نوفل کے جنتی ہونے کی نوید سنائی اور ان کے مرنے پر ارشاد فرمایا تھا۔ "میں نے ورقہ بن نوفل کو سبز لباس میں ملبوس جنّت میں محوِ خرام دیکھا"، لیکن حضرت ابو طالبؑ جو عمر بھر حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے سینہ سپر رہے اور ہر آڑے وقت میں حضورؐ کی دست گیری اور پشت پناہی فرماتے رہے تو ان کی زندگی بھر کی وفاؤں کا صلہ حضورؐ نے انہیں یہ دیا کہ ان کا ٹھکانا جہنم بتایا۔

تیسری بات یہ کہ وہ کون سی عار تھی جو حضرت ابو طالبؑ نے جیتے جی اپنے بھتیجے کیلئے گوارا نہیں کی؟ شعبِ ابو طالبؑ میں تین برس تک قریش کے سوشل بائیکاٹ اور سماجی مقاطعہ سے بڑھ کر بھی کوئی عار ہو سکتی تھی۔ تعجب ہے کہ ساری زندگی تو وہ اپنے بھتیجے کی نصرت وحمایت کے سبب ہر قسم کی عار اور ہم چشموں کی لعنت و ملامت گوارا فرماتے رہے اور تمام قبائلِ عرب سے ٹکر لینے میں کبھی انہوں نے عذر وننگ محسوس نہ کی اور مرتے وقت انہیں عار کا خیال ستانے لگا۔

ایک سُنّی عالم سے ایمان ابو طالبؑ کے موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کے والد ماجد کا حوالہ دیا کہ وہ حالتِ کفر میں دنیا سے اٹھے اور آخرت میں ان کا حشر جہنمیوں کے ساتھ ہوگا۔ قطع نظر اس کے کہ یہ واقعہ حضرت ابراہیمؑ کے والد گرامی

کا ہے یا ان کے چچا آذر کا، میں نے ان سُنّی عالم سے عرض کیا کہ ابراہیمؑ کے منہ بولے باپ نے ابراہیمؑ کو یہ دھمکی دی تھی کہ: لئن لم تنته لا رجمنك (اگر تم اپنی اس دعوتِ توحید سے باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا۔) لیکن سیّدنا ابو طالبؑ کا طرزِ عمل تو اس سے بالکل مختلف تھا۔ جب تمام قبائلِ عرب کے سربرآوردہ نمائندوں نے متفقہ طور پر حضرت ابو طالبؑ کو یہ دھمکی دی تھی کہ وہ اپنے بھتیجے کو توحید کی تبلیغ سے باز رکھیں ورنہ سارے قبائل سے لڑائی لڑنے کے لیے تیار ہو جائیں تو اس حوصلہ شکن مرحلے پر بھی یہ سیّدنا ابو طالبؑ ہی کی ذاتِ گرامی تھی جنھوں نے اپنے بھتیجے سے فرمایا تھا۔ "بھتیجے! تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو برملا کہو۔ میرے جیتے جی کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔"

متعصّب سُنّی مورخ ابنِ کثیر نے "البدایہ والنہایہ" میں یہ پورا واقعہ قلم بند کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ قبائلِ عرب کی اس وارننگ اور الٹی میٹم کے بعد حضرت ابو طالبؑ نے حضور نبی اقدس صلے اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"یا ابن اخی! ان قومك قد جاؤنی فقالوا کذا وکذا الذی قالوا له فابق علی وعلی نفسك ولا تحملنی من الامر ما لا اطیق قال فظن رسول اللہ صلی اللہ علیه وآله وسلم انه قد بدا لعمه فیه بدا وانه خاذله ومسلمه وانه قد ضعف عن نصرته والقیام معه قال فقال رسول اللہ علیه وآله وسلم یا عم! واللہ لو وضعوا الشمس فی یمینی والقمر فی یساری علی ان اترك هذا الامر حتی یظهره او اهلك فیه ما ترکته قال' ثم استعبر رسول اللہ صلی اللہ علیه وآله وسلم فبکی ثم قام، فلما ولی ناداه ابو طالب فقال اقبل یا ابن اخی فاقبل علیه رسول اللہ صلے اللہ علیه وآله وسلم فقال اذهب یا ابن اخی فقل ما احببت فواللہ لا اسلمتك

لشیئ ابداً۔ (البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۴۸ طبع مصر)

بھتیجے! تیری قوم کے لوگ چل کر میرے پاس آئے تھے اور انہوں نے مجھ سے ایسی بات کہی ہے اس لیے مجھ پر اور خود اپنے حال پر رحم کرو اور مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جس کا متحمل ہونا میرے بس سے باہر ہو۔ یہ بات سن کر حضورؐ نے خیال فرمایا کہ اب چچا کے سامنے ایک نئی صورتِ حال رونما ہوگئی ہے اور اس لیے وہ ان کی پشت پناہی اور مدد سے گریز اختیار کر رہے ہیں۔ انہیں تنہا چھوڑنے اور ان کی نصرت و حمایت سے دست کش ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں اور ان کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہونے سے پہلو تہی کر رہے ہیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا:

عمِ گرامی! قسم بخدا اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی لا کر رکھ دیں اور مجھ سے یہ توقع رکھیں کہ میں اپنی تبلیغ سے باز آجاؤں گا تو یہ ممکن نہیں یا تو یہ دین غالب آکر رہے گا یا میں اس راہ میں ختم ہو جاؤں گا۔"

اس کے بعد حضورؐ کا جی بھر آیا اور آپؐ اشکبار ہوگئے۔ پھر جب آپ اٹھ کر جانے لگے تو ابو طالبؑ نے آواز دے کر واپس بلایا۔ حضورؐ ان کے سامنے گئے تو ابو طالبؑ نے فرمایا بھتیجے جاؤ اور جو کچھ تم کہنا چاہتے ہو برملا کہو۔ خدا کی قسم میں تمہیں کبھی کسی مرحلے پر تنہا نہیں چھوڑوں گا۔

جانثاری اور فداکاری کے اس پیکرِ عظیم اور اسلام کے اس اولین پشتیبان کو کفر کا طعنہ دینا اور اس پر زبان طعن دراز کرنا احسان فراموشی اور ناسپاسی کا ایسا گھناؤنا مظاہرہ ہے کہ اس پر تہذیب و شرافت دم بخود ہیں۔ اگر ابو طالبؑ مردِ مومن نہیں تھے تو اس دھرتی پر ایمان ایک جنس نایاب کے سوا کچھ نہیں۔ ع

عنقا بہ روزگار کسے نامہ بر نہ بود

سیّدنا حضرت ابو طالبؑ کے بارے میں ان کے کفر کے متعلق روایات کا ایک

راوی ابوہریرہ ہے۔ اس بدبخت ازلی کو سیدنا علیؑ اور ان کے خانوادہ شرف ومجد سے خداواسطے کا بیر تھا اور اسی نے وہ روایت گھڑی جس میں آگ کے بجائے عار کو قبول کرنے کا ذکر ہے۔

یہ شخص ۷ھ میں غزوۂ خیبر کے بعد مسلمان ہوا جبکہ سیدنا ابوطالبؑ ۱۰ھ بعثت میں وصال فرما گئے لیکن ابوہریرہ کی بیسیوں روایتیں ایسی ہیں جن میں وہ خود موقع کا گواہ بنتا ہے۔

اس دروغ بیانی کی ایک واضح مثال مستدرک حاکم کی وہ حدیث ہے جو بخاری ومسلم کی شرائط کی رو سے صحیح حدیث ہے، اس میں وہ کہتا ہے۔

دخلت علی رقیۃ بنت رسول اللہ امرأۃ عثمان و بیدھا مشط فقالت خرج رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم من عندی آنفاً رجلت شعرہ فقال کیف تجدین اباعبد اللہ یعنی عثمان قالت بخیر قال اکرمیہ فانہ من اشبہ اصحابی بی خلقا۔

میں رسول اللہ کی بیٹی رقیہ کے یہاں گیا جو عثمان کی بیوی تھیں۔ اس وقت ان کے ہاتھ میں کنگھا تھا۔ رقیہ کہنے لگیں ابھی ابھی رسول اللہ میرے یہاں سے اٹھ کر گئے ہیں۔ میں نے ان کے بالوں میں کنگھا کیا؟ انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ تم نے ابوعبداللہ یعنی عثمان کو کیسا پایا ہے؟ رقیہ نے کہا بہت خوب پایا اس پر حضورؐ نے فرمایا اس کی عزت کرو کہ وہ اخلاق میں سب سے زیادہ مجھ سے مشابہ ہے۔"

ابوہریرہ غزوہ خیبر کے بعد مسلمان ہو یعنی ۷ھ میں جبکہ حضرت رقیہ کا انتقال ۲ھ میں جنگ بدر کے فوراً بعد ہو گیا تھا۔ وہ یمن کا رہنے والا تھا۔ یہ مدینہ میں رہتی تھیں۔ ابوہریرہ اگر کافر تھا تو حضرت رقیہ کے یہاں کیسے گیا۔ اور میاں بیوی کے باہمی تعلقات کے بارے میں رازدارانہ بات انہوں نے ابوہریرہ سے کیوں کی۔ پھر یہ بات

بھی اپنی جگہ طے ہے کہ قبولِ اسلام سے قبل ابوہریرہ کا مدینے آنا ہرگز ثابت نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سارا واقعہ اس نے محض عثمان کی فضیلت ثابت کرنے کے لیے گھڑا اور ہمارے کم فہم اور فرومایہ محدثین نے ابوہریرہ کے اس جھوٹے قصے کو اپنی کتابوں میں جوں کا توں نقل کر دیا یعنی ہمارے یہ آئمہ محدثین "نقل رایاید" کے معیار سے بھی فروتر لوگ تھے۔

اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کی ترتیب وتدوین کا آغاز ہی بنی امیہ کے دورِ اقتدار میں ہوا اور اس دور میں معاویہ اور اس کے بعد اس کے جانشینوں نے فرضی حدیثوں اور جعلی روایتوں کے ذریعے ابوبکر وعثمان کی شخصیتوں کو بلند و بالا کرنے کی باقاعدہ مہم چلائی۔ معاویہ کے دور کے واضعین حدیث کا جو بورڈ تشکیل پایا اس میں ابوہریرہ کے علاوہ عبداللہ ابن عمرؓ، عبداللہ بن عمر بن العاص، سمرۃ بن جندب، عبداللہ بن سلام اور اسی قبیل کے کئی پیشہ ور ضمیر فروش، راویانِ حدیث کے نام ملتے ہیں۔

وضع حدیث کی جس رسم بد کا آغاز خلیفۂ اوّل ابوبکر بن ابی قحافہ نے کیا تھا اور محض سیدہ فاطمہؑ کو ان کے ورثہ پدری سے محروم کرنے کی غرض سے اس رسم کو ان کے نام لیواؤں نے پھر کچھ اس طرح اپنایا کہ اب اہلِ سنّت کی کتبِ حدیث میں بہت کم حدیثیں ایسی ملیں گی جن کی اسناد کے بارے میں شک وشبہہ کا اظہار نہ کیا گیا ہو۔ اگر خلیفۂ اوّل موقع ومحل کی مناسبت سے حدیث وضع کر سکتا ہے اور اسے حضورؐ کی جانب نسبت دے سکتا ہے تو ان کے چھٹ بھیاّ اس میدان میں پیچھے کیوں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ اس حمام میں بیشتر صحابہ ننگے نظر آتے ہیں۔ ہر ایک نے اپنی بساط کے مطابق اپنی ضرورت کے تحت اور حسبِ منشاء حدیثیں گھڑیں۔ عثمان بن عفان کو "ذوالنورین" کا خطاب بھی اسی قماش کے راویوں نے دیا۔ ان دروغ گو راویوں میں جو زمرۂ صحابہ میں محسوب ہوتے ہیں ایسے ایسے بدنہاد لوگ بھی گزرے ہیں جنہوں نے سیدّنا علی ابن ابی طالبؑ کو مفسد اور کافر قرار دینے کے لیے ایک حدیث وضع کی اور اس کے عوض معاویہ کے خزانے سے ۴ لاکھ سکہ رائج الوقت کی

رشوت قبول کی۔ یہ شخص سمرۃ بن جندب تھا جس نے برسرِ منبر قرآن کی ان آیات کو سیدنا علیؑ پر چسپاں کیا۔ ومن الناس من یعجبک قولہ فی الحیاۃ الدنیا ویشھد اللہ علی ما فی قلبہ وھو الد الخصام واذا تولی سعی فی الارض لیفسد فیھا ویھلک الحرث والنسل واللہ لا یحب الفساد واذا قیل لہ اتق اللہ اخذتہ العزۃ بالاثم فحسبہ جھنم ولبئس المھاد۔ (سورہ بقرہ پارہ ۲)

اسی گروہ صحابہ کے افراد تھے جنہوں نے سیدنا ابو طالبؑ کو کافر ثابت کرنے کے لیے جھوٹی حدیثیں تیار کیں، معاویہ کی فضیلت کی داستانیں گھڑیں۔ اسے کاتبِ وحی، کا خطاب بخشا اور وہ سب کچھ کہا جو نہ روایتاً صحیح تھا نہ درایتاً اور کمال تو اس گروہ کا ہے جو خود کو اہلِ سنّت کہتا ہے اور ہدایت عقل کے خلاف ان روایتوں کا پشتارہ اپنا پیٹھ پر لادے ہوئے عقل و خرد کا منہ چڑا رہا ہے۔ سُنّی ہونے کا مطلب ہی یہ رہ گیا ہے کہ عقل سُن ہوگئی ہے۔ دماغ سُن ہوگئے ہیں۔ اور اسی بنا پر ہر سُنی سنائی بات پر آمنا و صدقنا کہنا ان کا شعار بن گیا ہے۔

میں یہ بات طنزاً نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ اجتماعی نفسیات کے اس کلیہ کی جانب میرا اشارہ ہے جس کی رو سے کسی جماعت میں شامل افراد اپنے ذہنوں سے معاملے کی تہ تک پہونچنے اور کسی معاملے پر غور کرنے کی بجائے جماعتی ذہن سے سوچتے ہیں اور اس لیے حقیقت تک رسائی سے محروم رہتے ہیں۔ "موسیولیبان" نے اپنی کتاب "روح الاجتماع" میں اجتماعی نفسیات کے اس خطرناک رجحان کی نشاندہی کی ہے اور اسے قوموں کے لیے انتہائی خطرناک قرار دیا ہے۔ ایسے میں اس گروہ کی بے حسی اور کم فہمی کا کیا ٹھکانا جس کے نام کا جزو ہی الجماعت ہو۔

اس خطرناک ذہنی انحطاط سے ہٹ کر اگر آپ سُنّی شیعہ نقطۂ نگاہ پر غور کریں اور اپنے ذہن و دماغ کی توانائیوں کو صرف کرکے اس نزاع و اختلاف کا جائزہ لیں تو آپ پر

یہ حقیقت منکشف ہونے میں کچھ بھی دیر نہیں لگے گی کہ ایک جانب اہلسنت والجماعت کا گروہ ہے جسے رسول اللہ سے بھی پیار کا دعویٰ ہے اور حضورؐ کے دشمنوں سے بھی ان کی عقیدت اپنی جگہ استوار ہے اور دوسری جانب شیعانِ علیؑ کا گروہ ہے جو ہر بات کو رسول اللہ کی پسند وناپسند کے میعار پر پرکھتا ہے اور صرف انہیں لوگوں سے رشتہ عقیدت استوار کرتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عہد وفا استوار رکھتے ہیں۔

تاریخ کی تضاد بیانی

ہوش وحواس وعقل وخرد کی بقائی کے ساتھ سیرت نبوی کا مطالعہ کریں تو اس مضامین میں ایک بات جو دل ونگاہ کو بری طرح کھٹکتی ہے وہ تاریخ کی تضاد بیانی ہے۔ تضاد بیانی کسی ایک دائرے میں محدود نہیں ہے بلکہ واقعات میں، اعمال میں اور اقوال میں ہر جگہ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اس تضاد بیانی کو ممکن ہے برداشت کیا جاتا لیکن اب اس سے پیغمبرؐ کی شخصیت پر اور ان کی ذات پر حرف آئے تو اسے کیونکر گوارا کیا جاسکتا ہے تاریخ کی یہی وہ تضاد بیانیاں ہیں جن سے اسلام دشمن قوتوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کے سرمایۂ فکر وعمل کو" ایں دفتر بے معنی نے غرق آب اولیٰ" کی بے وقعتی کی نذر کردیا۔

ہمارے ذخیرہ احادیث میں ایسا بہت مواد ملتا ہے جس کی رو سے بعض تیسرے درجہ کی شخصیتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فوقیت اور برتری دی گئی ہے اور ان شخصیتوں کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے کہ ان کے مقابلے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کبریٰ ہیٹی اور کمتر نظر آتی ہے۔

ہمارے اکثر وبیشتر مورخین نے حضورؐ کی سیرت نگاری میں عقل ودرایت کے بہت سے اہم گوشوں کو یکسر نظر انداز کردیا ہے اور روایتوں کی جانچ پرکھ یا جرح وتعدیل

کی جانب مطلق توجہ نہیں دی جس سے جا بجا عظمتِ پیغمبری مجروح دکھائی دیتی ہے لیکن سیرت نگاروں کی اپنی بے مائیگی اور کوتاہ فہمی کے سبب اس قسم کی خرافات کی بھرمار ہوگئی جو اعلیٰ انسانی اقدار کے علاوہ اصول اخلاق اور تہذیب و شائستگی کے معمولی آداب اور شریعت اسلامیہ کے بنیادی تقاضوں سے ادنیٰ سی مناسبت بھی نہیں رکھتی ہیں لیکن سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے اوراق ان سے بھرے پڑے ہیں۔

مثال کے طور پر جنگ بدر کے ضمن میں اسیرانِ جنگ کے متعلق قرآن مقدس کے دسویں پارے کی ایک آیتِ کریمہ کی تشریح اور اس کی شانِ نزول کا قصہ کچھ اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ وہ ذاتِ اقدس واطہر جو مہبط نبوت اور مصدر ہدایت تھی اس کی رائے کو جو نبوت کے ساتویں سال مسلمان ہوا اور جس کا ایمان صلح حدیبیہ کے مرحلہ تک بھی شک و تذبذب کا شکار تھا وحی الٰہی کے ذریعے پیغمبرؐ کی رائے پر ترجیح دی گئی۔

تفسیر قرآن کی سنی روایتیں جتنی بھی دستیاب ہیں ان سب میں یہ واقعہ بڑی تفصیل سے مذکور ہے کہ عمر ابن خطاب کی رائے کو رسول اللہؐ کی رائے کے مقابلے میں درست قرار دیا گیا اور ہم ہیں کہ اس قسم کی بیہودہ روایات و خرافات کو سیرت کے مقدس نام یا تفسیر قرآن کی آڑ میں نہ صرف برداشت کر رہے ہیں بلکہ اس پر داد و تحسین کے ڈونگرے بھی برسا رہے ہیں اور ہمیں ذرا احساس نہیں ہو پاتا کہ ہم پیغمبرؐ کی بات یا رائے کو غلط قرار دے کر کیسی سنگین غلطی بلکہ مجرمانہ روش کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

ایک طرف تو ہم حضور سرور کائنات محمد عربی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم الانبیاء سید المرسلین اور افضل الرسولؐ قرار دیتے ہیں اور دوسری جانب ہمیں یہ کہتے ہوئے ذرا شرم دامنگیر نہیں ہوتی کہ اس کے کسی نام نہاد صحابی کی رائے وحی خداوندی کے موافق اور پیغمبرؐ کی رائے وحی الٰہی کے خلاف تھی حضورؐ چاہتے تھے کہ بدر میں جو مشرک قیدی ہو گئے ہیں ان سے فدیہ لے کر انہیں آزاد کر دیا جائے مگر عمر ابنِ خطاب ان سب کو تہ تیغ

کرنا چاہتے تھے اللہ تعالیٰ کو عمر کی رائے پسند آئی اور رسولؐ اللہ کی رائے کو اس نے سختی سے مسترد کر دیا۔

یہ عالم ہے کہ اس کے راویوں میں ناصبی اور خارجی تک موجود ہیں جو کھل کر سیدنا علیؑ پر لعن طعن کرتے تھے عمران بن حطان جیسے ملعون راوی بھی بخاری کے معتبر راویوں میں سے ہیں۔ یہ وہی دوں فطرت شخص ہے جس نے امیرالمومنینؑ کے قاتل عبدالرحمٰن ابن ملجم کو اس کے اس فعلِ قبیح پر اپنے اشعار میں داد دی تھی۔ ایسے ہی بے شمار راویوں کے نام "اسماء الرجال" کی فہرست میں شامل ہیں جو اہلِ بیت علیہم السلام کی دشمنی میں تمام حدود اخلاق و شرافت کو پھاند گئے۔

یہ عجیب بات ہے کہ پیغمبرؐ کے نام نہاد دوستوں کی تو اس قدر افزائی کہ ان کے بارے میں تنقیدی زاویہ رکھنے والے کا ایمان ہی مشکوک قرار دیا جائے اور پیغمبرؐ کے خاندان کے وہ قریبی افراد جن کی طہارت و پاکیزگی کی گواہی خود قرآن مقدس نے دی اور پیغمبرؐ نے بھی ان کی عصمت و تقدس پر مہر تصدیق ثبت کی۔ ان پر اگر کوئی شخص ناروا تنقید کرے اور اپنی خباثتِ نفس کے چھینٹے ان پر اڑائے تو اس پر کسی کی رگ حمیت نہیں پھڑکتی۔ ابوبکر و عمر و عثمان اگر بالفرض حضورؐ کے دوست تھے اور بقول شاعر؏

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

تو کیا علیؑ ابن ابی طالبؑ کا شمار حضورؐ کے دشمنوں میں ہوتا ہے کہ اوّل الذکر تین افراد پر اگر جرح کی جائے اور ان کی غلط حکمت عملی پر تنقید کی جائے تو وہ ناقابل معافی جرم قرار پائے اور سیدنا علی علیہ السلام پر اگر زبان طعن دراز ہو تو اس کو تحقیق کا شاہکار قرار دے کر تحسین کا خراج پیش کیا جائے۔ محمود احمد عباسی کی کتابوں پر بڑے بڑے جغادری علمائے اہلسنّت کو بغلیں بجاتے دیکھا کیونکہ ان کتابوں سے سیدنا علیؑ کی بالواسطہ اور بلاواسطہ مذمت کا پہلو نکلتا ہے۔ اسی قبیل کی دیگر کتابیں بھی ہاتھوں ہاتھ لی گئیں اور ان کے مصنفوں کو

یارِ غار کون؟

ہمارے ان نام نہاد محدثین نے قرآنِ مقدس کے ان مجمل یا مبہم واقعات کو جن میں کسی فردِ واحد کا نام نہیں لیا غلط روایات کے ذریعے ان کی شانِ نزول کا رشتہ ابوبکر و عمر و عثمان سے جوڑ دیا اور ان بے سروپا روایتوں کے ذریعے خلفاءِ ثلاثہ کی عظمت و فضیلت کے محل استوار کیے گئے حالانکہ نہ کوئی قرینہ ان کے حسبِ حال ہے نہ حالات کی افتاد اس کی تصدیق کرتی ہے اور ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ ان روایتوں کو شیعہ لٹریچر میں در آنے کا موقع مل گیا۔

شیعہ لٹریچر میں سنّی روایتوں کے گھس آنے کا بڑا سبب تو جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں وہ زبردست جھوٹا پروپیگنڈا ہے منظم طریقے سے اہلِ بیت کی مخالفت اور ان کے دشمنوں کی موافقت میں دورِ خلفائے ثلاثہ اور بنی امیہ و بنی عباس میں اس زور شور سے کیا گیا اور اس باقاعدگی کے ساتھ اسے پھیلایا گیا کہ اس پروپیگنڈے سے اپنے اور بیگانے یکساں طور پر متاثر ہوئے۔ ہٹلر کے مشیر اطلاعات گوئبلز نے کہا تھا جھوٹ اس تسلسل سے بولا جائے کہ اس پر سچ کا گمان ہونے لگے۔ سو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے جھوٹ بولا اور اس ٹھاٹھ سے بولا کہ گوئبلز کی روح بھی شرما گئی بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ تاریخی واقعات میں جھوٹ کی آمیزش کا جو سلیقہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو تھا اور جس عمدگی سے انہوں نے سچ میں جھوٹ کی ملاوٹ کو ایک فنِ لطیف بنا کر پیش کیا تو یہ انہی دانشوروں کا اور محققوں کا کارنامہ ہے۔ کوئی اور قوم ہوتی تو اتنا جھوٹ بولنے پر اور اس خوش اسلوبی سے جھوٹ کو سچ بنانے کی جدوجہد میں خون تھوکنے لگتی۔

جھوٹ گھڑے گئے، جھوٹی داستانیں اڑائی گئیں، من گھڑت قصے دہرائے گئے۔

فرضی شخصیتوں کے طولانی تیار کئے گئے اور ایسے ایسے مستند معتبر راوی "گھر سے آیا ہے معتبر نائی" کے قبیل کے داستان گو ایجاد کئے گئے کہ ان کا وجود معشوق کی کمر کی طرح ناپید تھا۔

صنم سنتے ہیں تیرے بھی کمر ہے کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے

مثال کے طور پر خلیفۂ اوّل کا یار غار ہونا تشخص کے ساتھ قرآن سے ثابت نہیں ہے لیکن سُنّی اور شیعہ دونوں کی مستند کتابیں اس امر کی توثیق کرتی ہیں کہ واقعی صاحبِ غار ابوبکر تھے۔

کسی نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ جس شخص کو تین سال کے اس عرصہ میں جو شعب ابی طالب میں حضورؐ نے اور آپ کے خاندان اور آپ کے جان نثار صحابہ نے گزارا یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ حضورؐ کے ایک سچّے پیروکار کی حیثیت سے خود کو اس قید اور پابندی کی اذیت میں مبتلا کر سکے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ غار کی شب ہائے تار میں حضورؐ کا رفیق و ہمدم رہا ہو۔

شیعہ علماء کا کہنا ہے کہ بے شک غار کے ساتھی تو ابوبکر ہی تھے لیکن ان کی گھبراہٹ اور ان کے حزن و ملال کی کیفیت نے ان کے مرتبہ کو گھٹا دیا۔ میں ان شیعہ علماء سے بصد ادب یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس آیت کے اسلوبِ بیان پر غور کریں کہ آیا آیت کا انداز از قبیل مدح ہے یا از قبیل ذم۔ عربی کے ایک ادنیٰ طالبِ علم کی حیثیت سے میں نے جہاں تک اس آیت کے پیرایۂ بیان پر غور کیا ہے مجھے تو اس میں خوبی ہی کا پہلو نظر آیا ہے۔ معیت خداوندی کے شرف میں حضورؐ کا اپنے اس رفیق سفر کو شریک کرنا میرے اس موقف کی تائید کرتا ہے۔

تاریخ کے ذرائع اطلاع میں ایک اہم ذریعہ وجدانِ سلیم بھی ہے جبکہ اس کی بنیاد قرائن پر رکھی گئی ہو۔ بلاشبہ حضورؐ اپنے ساتھ سفر میں کسی نہ کسی شخص کو رفاقت کا شرف نہ ور بخشتے تھے لیکن صرف اسی کو جو حضورؐ سے خصوصی نسبت کا تعلق رکھتا ہو۔

سفر طائف میں حضورؐ کی رفاقت کا اعزاز حضورؐ کے منہ بولے بیٹے حضرت زید

بن حارثہ کو حاصل ہوا۔ جو حضورؐ کے دل سے قریب تر تھے اور جن پر حضورؐ کو بھرپور اعتماد تھا۔ ہجرت مدینہ کے سفر میں وہ شخص کیونکر شریک راہ بن سکتا تھا جس کا نام اس سے پہلے کسی معاملے میں کبھی سننے میں نہیں آیا۔ اس سفر میں بھی یارِ غار اور رفیق سفر ہونے کا اعزاز حضرت زید بن حارثہ ہی کے مقدر کا طرۂ امتیاز بنا اور وہی یارِ غار کہلانے کے مستحق ہیں کہ ایک بزرگ شخصیت کو سفر میں ایسے قابل اعتماد ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے جو طاقت ور بھی ہو اور خدمت گزار بھی اور سفر طائف میں اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔

سفر طائف سے سفر مدینہ بہر حال زیادہ کٹھن اور صبر آزما تھا اس کے لیے اس شخص کو کیونکر رفیق سفر بنایا جا سکتا تھا جس کا اپنا وجود منحنی اور اپنا پاؤں لنگ تھا لیکن گھڑنے والوں نے "پائے درویش لنگ است"، کے باوصف یہ بے پر کی بھی اڑائی کہ یہ مرد نحیف و نزار حضورؐ کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر غارِ ثور کی بلندی تک لے گیا۔

تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ ابوبکر کا جسم حضورؐ کے مقابلے میں نہایت نحیف و نزار تھا۔ حضورؐ ایک تندرست و توانا اور وجیہہ و شکیل اور قوی ہیکل انسان تھے جبکہ اس جانشین پیغمبرؐ کا حلیہ یہ تھا کہ کلے کی ہڈیاں ابھری ہوئی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی گوشت سے خالی چہرہ، جسم اکہرا اور وزن ہلکا پھلکا تھا۔ (سیرۃ الصحابہ ج ۲)

مجھے یہاں ایک لطیفہ یاد آ گیا چوہے اور ہاتھی کی دوستی ہو گئی۔ ہاتھی ابھی بچہ تھا مگر ہاتھی پھر ہاتھی ہے۔ ایک روز چوہے نے اس کے قد و قامت اور اس کی بھاری بھرکم جسمانی ساخت کی بنا پر پوچھ لیا کہ جناب کی عمر کیا ہو گی؟ ہاتھی کے بچے نے بتایا چھ مہینے۔ پلٹ کر ہاتھی نے چوہے سے پوچھا اور آپ کا سن شریف؟ چوہا منہ بنا کر بولا۔ عمر تو ابھی بھی اتنی ہی ہے مگر ذرا بیمار و بیمار رہتے ہیں۔

بنابریں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یارِ غار ابوبکر تھے اور معیت پیغمبرؐ کا اعزاز انہیں حاصل ہوا وہ محض ایک "خبر واحد" کی بنا پر جسے دور بنی امیہ کے بے ضمیر راویوں نے ایک خاص

منصوبہ کے تحت گھڑا ہے سخت غلط فہمی کا شکار ہیں۔ اگر اس سے قبل حضور نے اس شخص کو کبھی سفر و حضر میں اپنی معیت اور رفاقت کا اعزاز بخشا ہوتا تو یہ بات سمجھ میں آ سکتی تھی اور یہ امکان پیدا ہو سکتا تھا کہ اس سفر میں بھی حضورؐ نے اس کو اپنا ساتھی بنایا اور اگر اس سے پہلے کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا تو اس قصہ میں اس شخص کا نام سراسر جعلسازی پر مبنی اور ایجاد بندہ ہے۔

یہی حال واقعہ افک کا بھی ہے جس میں قرآنِ مقدس نے نام لیے بغیر آیات برائت و عصمت نازل کیں ان کا مورد حضرت عائشہ کو بنانا بھی اسی قسم کی دھاندلی ہے جبکہ اس واقعہ کا تعلق حضرت ماریہ قبطیہ سے ہے۔

دراصل ہمارے علمائے اہلسنّت نے "بدنام گر ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا" کے مصداق ہر اس واقعہ کو جس میں فضیلت کا کوئی عنصر موجود ہو خواہ اصل واقعہ کتنا ہی خفت آمیز اور شرم ناک کیوں نہ ہو اسے اپنی پسندیدہ شخصیتوں پر چسپاں کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اسی طرح قرآنِ مقدس کی دوسری بہت سی آیتوں کی شانِ نزول کے بارے میں یہی التزام کیا گیا کہ فلاں آیت نزلت فی ابی بکر کی شان میں نازل ہوئی۔ گویا گروہ صحابہ میں یہی ایک خدا کے ایسے چہیتے تھے کہ جو آیت اترتی تھی انہی کی شان میں اترتی تھی اور تاک کر انہی کو اپنا نشانہ بناتی تھی۔ حماسہ کے شاعر نے شاید ایسے ہی برخود لوگوں کے لیے کہا تھا۔

کانک ربك لم یخلق لخشیة سواھم من جمیع الناس انسانا

"شاید خدا نے پوری نسلِ انسانی میں خوفِ الٰہی کے لیے ان کے سوا کسی کو پیدا ہی نہیں کیا تھا۔ یہی تھے جن کے دل خشیتہ الٰہی سے معمور تھے۔"

شاید یہی سبب ہو کہ کسی جنگ میں ان حضرت کا کوئی کارنامہ تاریخ میں نظر سے نہیں گزرا نہ کسی کافر کی جان ان کے ہاتھ سے ضائع ہوئی، نہ کسی دشمن دین و ایمان سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی، نہ انھوں نے کسی کو قتل کیا، نہ خود ان کے قتل ہونے کی نوبت آئی۔

جن کے دلوں کی دنیا خوف خدا سے آباد ہو وہ اس قسم کی دنیاوی حرکتیں کہاں کرتے ہیں۔ ہاں اگر اقتدار کا ڈنکا ان کے ہاتھوں میں ہو تو لوگوں کو ڈرانے دھمکانے، گیدڑ بھبھکیاں دینے، ہراساں کرنے، دوسروں کے مال پر ہاتھ صاف کرنے اور دوسروں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کے معمولی کام کریں تو کریں۔ یہ باتیں خوف خدا کے منافی تھوڑا ہی ہیں۔

بساطِ سیاست کے دو مہرے

کم ہوں گے اس بساط پہ ہم جیسے بد قمار
جو چال ہم چلے سو نہایت بری چلے

مطالعۂ کتب کے دوران شیخین یعنی ابوبکر و عمر کی خلافت کے متعلق جو کچھ نظر سے گزرا اس سے میرے جیسا غیر جانبدار شخص جس نے کسی ایک شیعہ کتاب کا مطالعہ نہیں کیا تھا اس نتیجے پر پہونچا کہ عرب کے دو غیر معروف، غیر اہم اور حیثیت قبیلوں یعنی بنی تیم جو ابوبکر کا قبیلہ تھا اور بنو عدی جو عمر ابن خطاب کا قبیلہ تھا ان دو قبیلوں میں سے خلافت کے لیے دو ایسے اشخاص کی نام زدگی جو حضورؐ کے زمانے میں اتنی اہمیت کے حامل بھی نہ تھے کہ انھیں اہم فوجی یا سیاسی منصب پر فائز کیا جاتا درحقیقت بنی امیہ کی درپردہ سازش کی مرہون منت ہے۔ بنو امیہ جو بنو ہاشم کے براہ راست حریف تھے، انہوں نے حضورؐ کے وصال کے بعد یہ چال چلی کہ یکے بعد دیگرے اپنے دو مہروں کو آگے بڑھا دیا۔ ان کو پلاشیری دی اور انہیں خلافت کا لالچ دے کر اپنے آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا۔ کم تر حیثیت کے ان دو افراد کا انتخاب اس مصلحت کی بنا پر کیا گیا کہ یہ دونوں کبھی اتنی جرأت نہیں کر پائیں گے کہ بنو امیہ کے اقتدار پر قابض ہونے کے منصوبوں میں رخنہ اندازی کر سکیں کیوں کہ ان کی اپنی کوئی انفرادی حیثیت تھی ہی نہیں۔

اس میں یہ مصلحت بھی کارفرما تھی کہ اگر حضورؐ کے وصال کے فوراً بعد بنو امیہ کا کوئی

فردِ مسند خلافت پر متمکن ہو جاتا تو انصار اور دیگر قبائلِ عرب اور بنو ہاشم میں اس کا شدید ردِ عمل ہوتا اور بنی امیہ کا سارا منصوبہ خاک میں مل جاتا اس لیے نظرِ انتخاب ان دو حضرات پر پڑی اور قرعۂ فال ان دو ہستیوں کے نام نکلا اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان دونوں بزرگوں نے بڑی مہارت، چابکدستی اور نہایت چالاکی سے بنو امیہ کے اس منصوبہ کو پروان چڑھایا۔

اس درپردہ سازش، اس مکروہ دسیسہ کاری اور اس مذموم سیاسی حکمتِ عملی کے ثبوت کے لیے حسب ذیل واقعات کو بطور استشہاد پیش کیا جا سکتا ہے۔

(۱) حضور نبی اکرمؐ کی وفات کی خبر کو اس وقت تک دبایا گیا جب تک بنو امیہ کا حلیف قبیلہ بنو اسلم مدینہ منورہ میں داخل نہیں ہو گیا۔ بنو اسلم کے افراد اس کثرت سے مدینہ میں داخل ہوئے کہ تاریخ کے الفاظ میں "ملات المدینۃ زقاقا"، مدینہ کے گلی کوچے ان سے بھر گئے۔ اس کے بعد ہی سقیفہ بنو ساعدہ کا وہ ڈرامہ کھیلا گیا جس میں انصار و بنو ہاشم کو پیچھے دھکیل کر ابو بکر کی خلافت کا اعلان کر دیا گیا۔ بنو امیہ اس سارے عرصہ میں پسِ منظر میں رہے، لیکن ساری منصوبہ بندی انہی کی تھی اور وہ کامیاب رہی۔

(۲) بنو ہاشم کو اقتصادی طور پر مفلوج کرنے کے لیے باغِ فدک کو ہتھیا لیا گیا تاکہ اُن کے معاش کی کوئی صورت باقی نہ رہے اور وہ معاشی بحران میں مبتلا ہو کر بے اثر اور بدحال ہو جائیں۔

(۳) ابوبکر نے مرتے وقت خلافت کی نام زدگی کے لیے جو وصیت لکھوائی اس سے بھی اس ملی بھگت کا پردہ فاش ہوتا ہے۔

یہاں ہم شبلی نعمانی کی "الفاروق" ہی سے اقتباس پیش کر رہے ہیں تاکہ اندازہ ہو کہ خاندان بنی امیہ اور ابوبکر و عمر کے درمیان کیا پخت و پز ہو چکی تھی۔

"جب اس بات کے چرچے ہوئے کہ حضرت ابوبکر حضرت عمر کو خلیفہ کرنا چاہتے ہیں تو بعضوں کو تردد ہوا کہ طلحہ نے حضرت ابوبکر سے جا کر کہا کہ آپ کے موجود ہوتے عمر کا ہم

لوگوں کے ساتھ کیا برتاؤ تھا۔ اب وہ خود خلیفہ ہوں گے تو خدا جانے کیا کریں گے۔ اب آپ خدا کے ہاں جاتے ہیں یہ سوچ لیجیئے کہ خدا کو کیا جواب دیجیئے گا؟ حضرت ابوبکر نے کہا میں خدا سے کہوں گا، میں نے تیرے بندوں پر اس شخص کو مقرر کیا جو تیرے بندوں میں سب سے زیادہ اچھا تھا۔ یہ کہہ کر حضرت عثمان کو بلایا اور عہدنامہ لکھوانا شروع کیا۔ ابتدائی الفاظ لکھوائے جا چکے تھے کہ غش آگیا۔ حضرت عثمان نے یہ دیکھ کر یہ الفاظ اپنی طرف سے لکھ دیے کہ میں عمر کو خلیفہ مقرر کرتا ہوں۔" تھوڑی دیر کے بعد ہوش آیا تو حضرت عثمان سے کہا کہ کیا لکھا تھا؟ مجھ کو پڑھ کر سناؤ۔ حضرت عثمان نے پڑھا تو بے ساختہ اللہ اکبر پکار اٹھے اور کہا کہ خدا تم کو جزائے خیر دے۔" (الفاروق ص ۱۲۶)

یہ ساری روایت ہی اس امر کی منہ بولتی شہادت ہے کہ ابوبکر، عمر، عثمان تینوں اس خفیہ منصوبہ کے اہم کردار تھے اور مقصد وہی تھا کہ بتدریج خاندان بنی امیہ کے لیے راہ ہموار کی جائے۔

(۴) اس کا ایک واضح ثبوت دمشق کی گورنری کے عہدہ پر ابوسفیان کے بیٹے یزید کا تقرر ہے، اور یہ تقرر خلیفۂ اوّل کے حکم سے ہوا۔ دمشق اپنے جغرافیائی محل وقوع اور اپنی سیاسی و تجارتی اہمیت کے پیش نظر مملکتِ اسلامیہ کا سب سے زیادہ حسین اور خودکفیل علاقہ تھا۔ اکابر صحابہ کی موجودگی میں ایک ایسے شخص کا تقرر جو فتح مکّہ کے روز مسلمان ہوا ایک خفیہ منصوبہ کا غماز ہے۔ اس کے بعد پورے شام کے علاقے پر یزید کے بھائی معاویہ بن ابی سفیان کو عمر ابن خطاب کی جانب سے گورنری کا پروانہ عطا کیا گیا یہ صاف طور پر اس خفیہ منصوبہ کا ایک حصّہ ہے۔ گویا جان بوجھ کر ایسے حالات پیدا کیے جا رہے تھے کہ اگر کسی مرکز میں بنی امیّہ کی مخالف قوت برسر اقتدار آجائے تو شام کا یہ اہمیت کا مرکز گریز پالیسی کے ذریعے وحدت قلت کو پارہ پارہ کر سکے اور مرکزی حکومت کے دائرۂ اختیار و اقتدار کے لیے ایک زبردست سیاسی اور فوجی خطرہ کا موجب بنے جیسا کہ سیّدنا علی علیہ السلام کے

سربرآرائے خلافت ہونے پر اس کا عملی مظاہرہ ہوا اور شام نے معاویہ کی سرکردگی میں مرکز سے بغاوت کی۔

پورے پچیس ۲۵ سال تک اس علاقے پر ایک ہی خاندان کی بالادستی اور ایک ہی قبیلے کی گورنری مسلط کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس تجارتی شہ رگ پر بنی امیہ کو مکمل کنٹرول حاصل رہے جو پوری اسلامی ریاست کی اقتصادی فلاح و بہبود میں بڑی اہمیت کی حامل تھی۔

گورنروں کا تقرر عموماً دو چار سال کے لیے عمل میں لایا جاتا ہے مگر شام کی گورنری کو بنوامیہ کی میراث بنا دیا گیا تاکہ ان کے قدم مضبوط رہیں۔ اگر ابوبکر و عمر نے اپنے تدبر اور سیاسی سوجھ بوجھ سے یہ فیصلہ کیا تو یہ ان کی بے بصیرتی اور بے تدبیری کا شاہکار رہے کہ انہوں نے اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کے دشمن قبیلے کے پاؤں اس طرح جما دیے کہ انھیں کوئی ہلا نہ سکے۔

لیکن نظر بہ ظاہر یہ حضرات بنوامیہ کی اس سازش میں برابر کے شریک تھے جو بنی امیہ نے اسلامی ریاست پر قبضہ جمانے اور خانوادۂ نبوت سے انتقام لینے کے لیے تیار کی تھی۔

کتبِ حدیث میں ایسی کئی روایتیں ملتی ہیں جن میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تین قبیلوں سے ان کی اسلام دشمنی کی بناء پر طبعاً نفرت تھی۔ ترمذی کی روایت ہے، عمران بن حصین صحابی کہتے ہیں۔

مات النبی صلے اللہ علیہ والہ وسلم وھو یکرہ ثلاثۃ احیاء ثقیف و بنی حنیفہ و بنی امیہ۔

"حضورؐ اپنی وفات کے آخری لمحات میں تین قبیلوں کو سخت ناپسند فرماتے رہے۔ ثقیف، بنو حنیفہ اور بنو امیہ

ایک اور روایت میں جو متعدد کتب و حدیث میں مذکور ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ حضورؐ نے تین مرتبہ یہ فقرہ دہرایا :- یا ویل لبنی امیہ خدا کرے بنی اُمیّہ تباہ ہو جائیں۔ اس روایت کو شاہ عبد الحق محدث دہلوی نے بھی اشعۃ اللمعات میں نقل کیا ہے اور اس پر تبصرہ لکھا ہے۔

ابوبکر عمر جن کے بارے میں بڑی شد و مد کے ساتھ یہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ وہ محرم راز پیغمبرؐ تھے۔ وہ اس حقیقت سے لاعلم تو نہیں رہے ہوں گے کہ بنی اُمیّہ سے حضورؐ کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ وہ اس خاندانی پس منظر سے تو ضرور ہی آگاہ ہوں گے جو ان دو حریف قبیلوں کے درمیان رقابت و عداوت پر مبنی تھا۔ وہ اس طرز عمل سے بھی بے بہرہ اور بے خبر نہ ہوں گے جو بنی اُمیّہ نے حضورؐ کے بارے میں زندگی بھر روا رکھا۔ ایسی صورت میں محبت رسولؐ کا تقاضا کیا تھا؟ کیا یہ لوگ محبت رسولؐ سے واقف نہیں تھے؟ یا پھر اتنے بے حس تھے کہ انہیں حضورؐ کے ذاتی دشمنوں کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کرتے ہوئے ذرا بھی خیال نہ آیا کہ اس سے حضورؐ کے دل پر کیا گزری ہوگی اور ان کے اس کھلے معاندانہ رویہ سے حضورؐ کو کس درجہ اذیت پہونچی ہوگی۔ قرآن کہتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لُعِنُوْا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِیْنًا۔

"جو لوگ خدا اور رسولؐ کو اذیت پہونچاتے ہیں دنیا و آخرت میں ان پر لعنت کی گئی ہے اور اللہ نے ان کے لیے توہین آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

(۵) بنو امیّہ کے ساتھ حضرت ابوبکر و عمر کی اس سازباز اور سوچی سمجھی سازش کا ایک اور ثبوت وہ چھ رکنی کمیٹی ہے جو عمر ابنِ خطاب نے اپنے زخمی ہونے کے بعد مقرر کی اور اسے ہدایت کی کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ چن لے۔ اس مقصد کے لیے عبد الرحمٰن بن عوف کو یہ خصوصی اختیار دیا کہ انتخاب کی نگرانی وہ کریں۔ وہ خود بھی اس کمیٹی کے رکن تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ عثمان بن عفان کے قریبی رشتہ دار تھے۔ ان کے سیاسی جوڑ توڑ کا طبعی

رجحان عثمان بن عفان کی جانب تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ حضرت عمر نے ویٹو پاور اپنے لڑکے عبداللہ بن عمر کو دے دی تھی گویا پوری پیش بندی اس امر کی کر رکھی تھی کہ قرعۂ فال کہیں سیدنا علی علیہ السلام کے نام نہ نکل آئے اور عثمان بن عفان کے علاوہ کوئی دوسرا خلیفہ نہ بن سکے۔

اور بالآخر حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے فوراً بعد جس ڈرامے کا آغاز ہوا تھا اور جس میں نمایاں کردار عمر ابن خطاب کا رہا تھا۔ عثمان بن عفان کے خلیفہ بننے سے اس کا ڈراپ سین ہو گیا اور محمد کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کی قائم کی ہوئی اسلامی مملکت کا نظام ایک ایسے گروہ کے قبضہ میں چلا گیا جو حضورؐ کی ذات کا اور حضورؐ کے مشن کا سخت مخالف تھا۔

عثمان ابن عفان جو خاندان بنی اُمیہ کے ایک فرد تھے ان کی خلافت کا دور بنی اُمیہ کے عروج کا نقطۂ آغاز تھا۔ انھوں نے اپنے دورِ حکومت میں وہ تمام ہتھکنڈے استعمال کئے جن کا مقصد اقتدار کو ایک طویل عرصہ کے لیے بنی اُمیہ کی تحویل میں دیے رکھنا تھا۔ انہوں نے جو طور طریقے اپنائے ان کا فائدہ اسی خاندان کے ایک دوسرے شخص معاویہ بن ابی سفیان نے پوری طرح اٹھایا اور یوں اسلامی حکومت اسلام دشمن قبیلے کی خانہ زاد بن کر رہ گئی۔ تاریخ اسلامی کا یہ کیسا عجوبہ ہے کہ وہ حق اور وہ اختیار جو ابوبکر نے عمر کیلئے اور عمر نے عثمان کے لیے استعمال کیا اور جس کے نتیجے میں خاندان بنو امیہ کو برسرِ اقتدار آنے کا موقع ملا۔ اس حق و اختیار سے رسولؐ کو محروم کر دیا گیا کہ وہ کسی کو اپنا جانشین نامزد نہ کر سکے۔

یا تو یہ کہیئے کہ حضورؐ کو اس نازک اور حساس معاملہ کی اہمیت کا احساس ہی نہیں تھا تب الیوم اکملت لکم دینکم کا اعلان ہی غلط ہوا یا پھر حضورؐ اس مسئلہ کو امت کی صوابدید پر چھوڑ گئے۔ تب ابوبکر و عمر نے سنتِ نبوی سے انحراف کیوں کیا اور اسوۂ پیغمبرؐ سے روگردانی کس لیے کی ان میں سے کسی ایک بات کو مانے بغیر چارہ

نہیں اور دونوں صورتوں میں "دال میں کالا" صاف نظر آرہا ہے۔

حضورؐ اپنے بعد جانشین کا تعین فرما گئے تھے مگر جو منصوبہ حضورؐ کی مرضی و منشا کے علی الرغم بنایا جاچکا تھا وہ تو خاندان بنی اُمیہ کے اقتدار کی راہ ہموار کرنا تھا۔ سو اس کے لیے ان دونوں بزرگوں نے اپنا اپنا رول بڑے سلیقے سے ادا کیا۔[1]

---

[1] دار العلوم دیوبند کے بانی مولانا قاسم نانوتوی اپنے رسالہ "انتباہ المومنین" میں ایک جگہ حضورؐ کی جانشینی کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"القصہ عجب نیست کہ دریں واقعہ ہم کم وبیش مقتضائے عمسیت بشری و محبت نسبی میلانِ خاطر انور بجانب حضرت امیر رضی اللہ عنہ، باشد" (صفحہ ۱۵ مطبوعہ دیوبند ۱۳۵۲ھ)

یعنی کوئی تعجب نہیں کہ جانشینی کے مسئلہ پر بھی مقتضائے بشریت اور نسبی قرابت کی بناء پر حضورؐ کا رجحان طبع حضرت علی علیہ السلام کی جانب ہو۔ قطع نظر اس کے کہ حضورؐ کا رجحانِ طبع امیر المومنینؑ کو جانشین بنانے کا بربنائے تقاضائے بشریت یا بربنائے تقاضائے نسبی تھا یا حکمِ خداوندی کے تحت۔ لیکن جو بات تیرہ سو سال بعد قاسم نانوتوی کی سمجھ میں آگئی وہ حضورؐ کے ان "وفادار صحابہ" کے علم میں نہیں تھی کہ حضورؐ حضرت علیؑ کو اپنا جانشین دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ بات ان کے علم میں تھی تو پیغمبرؐ کی خواہش کے احترام ہی کا نام تو اسلام و ایمان ہے۔ تقاضائے محبت کیا تھا؟ حضورؐ کی خواہش کو بروئے کار لانا ان کے پیرو کاروں کے لیے ضروری تھا کہ نہیں؟ لوگ تو اپنے محبوب کے اشارۂ ابرو پر جان و مال و عزت و آبرو پر ہر شے قربان کر دیتے ہیں مگر جہاں جہاں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسے لوگوں کو آگے لایا جارہا ہے جن کا حضورؐ سے بیر ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ محبت اگر اسی کا نام ہے تو دشمنی کسے کہتے ہیں؟

خلافتِ راشدہ یعنی چہ

اور اب ذرا اس "خلافتِ راشدہ" کے احوال و کوائف پر بھی ایک نظر ڈالتے چلئے جس کے بارے میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں اور جس کے بارے میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ چشم فلک نے اس سے بہتر حکومت اس دھرتی پر قائم ہوتے نہیں دیکھی۔

"خلافت راشدہ" کا پہلا دور ڈھائی برس کے لگ بھگ رہا۔ اس دور میں اس حکمت عملی سے کھلم کھلا انحراف کی روایت قائم کی گئی جس حکمتِ عملی کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اختیار فرمائے رکھا۔

اسلام امن و سلامتی اور اخوت انسانی کا مذہب ہے۔ اس کا مقصد توحید الٰہی کی دعوت و تبلیغ اور اصلاحِ معاشرہ کی ہمہ گیر تحریک کا فروغ رہا ہے۔ اس راہ میں جن لوگوں نے رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی اور مزاحمت و تصادم کی روش اپنائی ان کے ساتھ خالصتہً دوامی نوعیت کی جنگیں بھی لڑی گئیں، جہاد کا اعلان بھی ہوا، قتل و خوں ریزی کی ایک حد تک اجازت بھی دی گئی۔ لیکن ایک امن پسند انسان کی طرح حضورؐ نے کبھی دوسروں پر از خود جنگ مسلط نہیں فرمائی۔ تمام غزوات و سرایا اور حضورؐ کے عہد کی تمام جنگیں اور لڑائیاں دفاعی نقطۂ نگاہ سے ناگزیر تھیں اور اسی لیے ان میں حصہ لینا پڑا۔ کسی ایک جنگ میں بھی حضورؐ کی جانب سے از خود ابتدا نہیں کی گئی۔

اس سلسلے میں ایک نمایاں مثال غزوۂ تبوک کی ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو اطلاع ملی کہ رومی فوجیں مدینہ منورہ پر چڑھائی کی زبردست تیاری کر رہی ہیں۔ رومی قوت کے مقابلے کے لیے حضورؐ نے ہنگامی بنیادوں پر اس دور کی اس سپر پاور سے رزم آرائی کا اہتمام فرمایا۔ موسم سخت گرم تھا، سفر دور دراز کا تھا، مسلمانوں کی عسکری، اقتصادی اور فوجی قوت رومی سلطنت کے مقابلے میں بالکل نہ ہونے کے برابر تھی۔ اسی لیے اس جنگ کو اتنی

اہمیت دی گئی کہ جن صحابہ نے بھول کر بھی اس میں شرکت سے گریز کیا ان کا سوشل بائیکاٹ ہوا۔ اس فوج کو جو غزوہ تبوک کے لیے تیار کی گئی "جیش عُسرت" کا نام دیا گیا یعنی انتہائی تنگی اور تکلیف کا لشکر۔ جب اسلامی لشکر مدینہ منورہ سے تقریباً دو سو میل کے فاصلے پر تبوک کے مقام تک پہونچا تو رومی فوج کا کہیں دور دور تک پتہ نشان نہیں تھا۔

کوئی طالع آزما اور موقع پرست انسان ہوتا اور ہوس ملک گیری اس کا مطمح نظر ہوتا تو وہ تبوک اور اس کے آس پاس کے علاقے پر قبضہ جماتا اور نہیں تو کم از کم جزیہ و خراج پاتا و اِن جنگ کے ذریعے اس علاقے کو زیر نگیں کر لیتا مگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے تشریف لے گئے تھے ویسے ہی واپس تشریف لے آئے کسی کی نکسیر تک نہیں پھوٹی۔ کوئی علاقہ فتح نہیں ہوا، خوں ریزی کا کوئی ہنگامہ گرم نہیں ہوا، ملک گیری اور ہوس اقتدار کی کوئی کارروائی بروئے کار نہیں لائی گئی کیونکہ اسلام ایک پُرامن نظامِ زندگی کا علمبردار ہے۔ ہلاکو، چنگیز، نپولین، ہٹلر اور اسی قبیل کی استعماری قوتوں کے خونیں طرزِ فکر کی اس آئین میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

لیکن خلیفۂ اوّل و دوم و سوم نے جو جنگی حکمتِ عملی اختیار کی وہ ایک "غذائی فوج دار" یا "مان نہ مان میں تیرا مہمان" کی سی تھی کہ بلاوجہ اور بلاسبب قوموں پر جنگ مسلط کی گئی اور قتل و غارت گری کا بازار اس حد تک گرم کیا گیا کہ آج پوری دنیا میں اسلام ایک خونیں مذہب کے طور پر بدنام ہو چکا ہے۔

دکھ ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مہاتما بدھ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو امن کا شاہزادہ اور امن کا پیغمبر قرار دیا جائے اور نسلِ انسانی کا وہ عظیم رہنما جو قرآن کے الفاظ میں پوری کائنات کے لیے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا گیا اس کے بارے میں پڑھی لکھی دنیا میں یہ چرچا عام ہو کہ وہ ایک خونخوار مذہب کا بانی تھا۔ والعیاذ باللہ ۔ وائے گر در پس امروز بود فردائے۔

حضورؐ رحمۃ اللعالمین صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دنیا بھر میں اس بدنامی کا سہرا حضورؐ کے انہیں تین جانشینوں کے سر ہے جنھوں نے محض اپنے عوام کو اپنے استبدادی ہتھکنڈوں سے زیر کرنے کی خاطر پوری دنیا کو جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا اور یہ نہ سوچا کہ نظریات وافکار تلوار کے زور پر نہیں پھیلائے جاتے بلکہ امن وسلامتی کے پیغام اور رفاہ عام کے انتظام سے نظریات کی صداقت کا سکہ جمایا جاتا ہے۔

"اسلام تلوار کے زور سے پھیلا"، کا صدیوں کا پروپیگنڈا مسلمانوں کے دامن پر ایک بدنما داغ رہ گیا ہے اور "جہاد"، کو "فساد فی الارض"، سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ قرآن مقدس نے جا بجا "زمین میں فساد پھیلانے سے"، لوگوں کو روکا ہے اور ایسی بہت سی قوموں کا تذکرہ اس کے اوراق میں محفوظ ہے جنھیں صرف اس جرم میں صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا کہ وہ زمین میں فساد پھیلانے کی مرتکب ہوئی تھیں۔

یہ "خلافت راشدہ"، تھی جس کے کم از کم پچیس سال محاذ آرائی، جنگ جوئی، ملک گیری اور غارت گری کے لیے وقف ہو کر رہ گئے تھے۔ گویا اس پورے عرصہ میں اسلامی مملکت میں ہنگامی حالت کا نفاذ رہا۔

اس "خلافت راشدہ"، کا پورا ڈھانچہ جبر وتشدد کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے جس میں نہ اپنوں کو چین کی زندگی میسر آئی، نہ غیروں کو سکون ملا، ہنگامہ خیزی اور فتنہ انگیزی کا یہ وہ بھیانک دور ہے جس میں بڑے بڑے صحابہ کو مدینہ منورہ میں نظر بندی کے دن گزارنے پڑے اور خویش پروری واقربا نوازی اور "اندھا بانٹے ریوڑیاں ہر پھیر اپنوں کو دے"، کا سماں بندھ گیا۔

اس "خلافت راشدہ"، کے ایک کمانڈر انچیف نے یہ کرتوت تاریخ اسلامی کے اوراق پر سیاہ دھبہ کی طرح ثبت کئے ہیں کہ اس نے ایک کلمہ گو مسلمان کو کافر قرار دے کر محض اس بنا پر قتل کر دیا کہ اس کی بیوی بہت خوبصورت تھی اور یہ سپہ سالار اعظم اسے اپنی

ہوس رانی کا تختہ مشق بنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ ایامِ عدت کے روزِ آغاز ہی میں اس نے اس حسینہ کو اپنے حجلہ عروسی کی زینت بنا لیا۔ اور خلافتِ راشدہ تھی کہ سر نہوڑائے بیٹھی رہی۔ نہ منہ سے بولی نہ سر سے کھیلی اور لوگوں کے اصرار کے باوجود اس بدقماش سپہ سالار کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی بلکہ اسے "اللہ کی تلوار" کا خطاب بھی مرحمت کر دیا گیا۔

کیا اللہ کی تلوار اندھی ہوتی ہے؟ کیا اللہ کی تلوار عورتوں کا شکار کرتی ہے؟ کیا اللہ کی تلوار کلمہ گو مسلمانوں کے سر قلم کرنے کے لیے لہرائی جاتی ہے؟

یہی وہ تلوار تھی جس کے بارے میں بیگانوں اور غیروں نے مشہور کر رکھا ہے کہ "اسلام تلوار کے زور سے پھیلا"۔ یہ جبر و استبداد کی تلوار تھی جس نے اسلام کو رسوا کرنے میں بھرپور حصہ لیا۔ یہ اللہ کی تلوار نہ تھی، عصیاں و تمرد، شہوت رانی اور زور و زبردستی کا گھناؤنا مظاہرہ تھا۔

غصب حقوق کی منصوبہ بندی

اس خلافت راشدہ کی بنیاد غصب حقوق پر رکھی گئی۔ پیغمبرؐ کی جانشینی پر جس شخص کا حق سب سے فائق تھا جسے خود لسانِ نبوت و وحی نے اپنا وصی اور اپنا جانشین مقرر فرمایا تھا اور جسے یہ اعزاز دیا گیا کہ "پیغمبرؐ کے بعد امت کا امام وہی ہوگا" اس امام کو ایک سازش کے تحت اس کے حق جانشینی سے محروم کر دیا گیا۔

غصبِ حقوق کی تیسری مثال ابوبکر کا اپنے بعد عمر ابنِ خطاب کو امت پر مسلط کرنا ہے، عمر ابن خطاب کو السابقون الاولون پر ترجیح دی گئی اور اس طرح بہت بعد میں مسلمان ہونے والے ایک بے حقیقت کو امت پر مسلط کر دیا گیا۔

غصب حقوق کی چوتھی مثال عمر ابن خطاب کا اپنے بعد ایسا بندوبست کرنا تھا جس کے ذریعے سوائے عثمان بن عفان کے دوسرا کوئی نام زد ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

غصب حقوق کی پانچویں مثال عثمان بن عفان کا وہ طرز عمل ہے جو انہوں نے دوسرے تمام مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے خاندان کے نااہل اور بدکار لوگوں کو بڑے بڑے عہدے تفویض کر کے پیش کیا۔

غصب حقوق کے اصول پر قائم اس خلافت راشدہ کے تینوں خلیفوں نے جو کردار پیش کیا وہ تاریخ اسلامی کا بدترین کردار ہے۔ اس خلافت راشدہ کا سب سے گھناؤنا اور تباہ کن کارنامہ یہ ہے کہ اس کے پچیس سالہ دور میں اسلام کو اس راہ سے ہٹا دیا گیا جو راہ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے لیے تجویز کی تھی۔ اسلام ایک پیغام انقلاب بن کر ابھرا تھا۔ ایک ایسا انقلاب جو زندگی کے تمام شعبوں میں برپا کیا گیا۔ اقتصادیات ہوں یا سیاست، معیشت ہو یا معاشرت، سیاست ہو یا عبادت، انتظام حکومت ہو یا نظامِ معیشت، داخلی استحکام ہو یا خارجی معاملات ــــ امن یا صلح کا قرینہ ہو یا ہنگامۂ جنگ۔ اسلام نے دنیا کو ہر محاذ پر عدل و مساوات، اعتدال و توازن اور میانہ روی کی تلقین کی، امیر و غریب کے درمیان کسی نوع کے تفاوت کی نفی کی، غربت و امارت کے تضاد کو ختم کرنے کی تعلیم دی، طبقاتی امتیاز کو مٹایا اور سماجی اونچ نیچ کو لعنت قرار دیا۔

حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی حیات طیبہ میں ایسا کوئی تضاد موجود نہیں تھا جو معاشرہ کے دوسرے افراد سے انھیں ممیز و ممتاز کرنے کا باعث بنتا۔ انھوں نے اپنی امت کے لیے بھی کبھی یہ پسند نہ فرمایا کہ اس میں بڑے اور چھوٹے شریف و وضیع اور ادنیٰ و اعلیٰ کا فرق پیدا ہو۔ مساواتِ انسانی کا جو سبق حضورؐ نے دنیا کو دیا اس کی نظیر تاریخ انسانی میں ناپید ہے۔ ابوداؤد کی روایت کے مطابق ایک شخص نے مدینہ منورہ میں منزلہ مکان بنوایا اور اس پر سفیدی بھی کروائی۔ حضورؐ نے اس شخص سے قطع تعلق فرمالیا اور جب تک اس نے اپنے مکان کو اسی سطح پر نہیں پہونچا دیا کہ جو عام مسلمانوں کے معیارِ زندگی کے مطابق تھی۔ اس سے حضورؐ کی بول چال بند رہی۔ حضورؐ کو یہ بات گوارا

نہیں تھی کہ اسلامی معاشرہ میں طرزِ بود و ماند اور اندازِ معاشرت میں کسی قسم کا فرق و امتیاز نمایاں ہو۔

ملوکیت و استبداد اور سرمایہ داری کے بوجھ کے نیچے دبی ہوئی انسانیت کے لیے حضورؐ کا پیغام مساوات ایک ایسے انقلاب کی تمہید ثابت ہوا جس نے قیصر و کسریٰ کی بساطِ شہنشاہیت کو الٹنے میں اہم کردار ادا کیا۔

لیکن "خلافتِ راشدہ" کے اس دورِ نامسعود میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس انقلابی مشن کو یک لخت فراموش کر دیا گیا۔ وظائف کی تقسیم میں اتنا فرق رکھا گیا کہ آج کے نظام سرمایہ داری میں بھی تنخواہوں کا اس درجہ تفاوت دیکھنے سننے میں نہیں آیا۔ عالیشان محلات کی تعمیر کی گئی۔ مالِ غنیمت کو اللوں تللوں پر صرف کیا گیا۔ بیت المال کی دولت اپنے ہوتوں سوتوں پر بے دریغ لٹائی گئی اور امارت و سرمایہ داری کے مظاہرے عام ہو گئے، جن سے معاشرے میں طبقاتی کشمکش کے جذبات بھڑک اٹھے۔ خود حضرتِ عمر کا قتل ایک مزدور کے ہاتھوں ہوا جسے شکایت تھی کہ اس کا آقا اس کا استحصال کر رہا ہے۔

ایک مزدور کے ہاتھوں خلیفۂ دوم کا قتل اسلامی تاریخ کا بڑا عبرت انگیز واقعہ ہے۔ اس واقعہ کی ٹھیک ٹھیک اہمیت سے عموماً لوگ بے خبر اور ناواقف ہیں اور اسے محض ایک وقتی ہیجان کا نتیجہ یا سیاسی گھٹن کا ردِعمل قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ واقعہ دراصل اس اسلامی مزاج کی عکاسی کرتا ہے جس میں آقا و مزدور دونوں کو یکساں مراعات و حقوق کی ضمانت دی گئی۔ لیکن جب اسلامی ریاست کا فرماں روا ایک مزدور کے مقابلے میں آقا کو فوقیت دے تو یہ بالکل صحیح ردِعمل تھا جس کا مظاہرہ ایک مزدور کی جانب سے ہوا۔ یہ واقعہ خود اس امر کا غماز ہے کہ خلافتِ راشدہ کے اس پرآشوب دور میں تمیزِ بندہ و آقا کی ایک ایسی افسوس ناک صورتِ حال پیدا ہو چکی تھی کہ بالآخر

ع توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

کی نوبت آپہونچی اور اسلام کی عظیم الشان سلطنت کا فرماں روا ایک مزدور کے سہ دھاری خنجر کا نشانہ بن گیا۔

عثمان بن عفان کے خلاف عوامی بغاوت کا جو بھانڈہ پھوٹا وہ بھی غریبوں اور پسماندہ طبقوں ہی کی جانب سے ایک شدید ردعمل تھا جو "خلافت راشدہ" کے اس تیسرے عمر رسیدہ اور از کار رفتہ فرد کی جانب سے اپنے جانذان پر بے جا نوازشات کی وجہ سے ظہور پذیر ہوا۔

شہنشاہیت کے زخم خوردہ وہ لوگ جو نظام قیصر و کسریٰ کی چیرہ دستیوں سے تنگ آئے ہوئے تھے اور اسلام کے نظام عدل و مساوات کے دامن میں پناہ لینے کی غرض سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے جب انہوں نے دیکھا کہ اسلام کی مسند فرمانروائی پر متمکن شخص کا طرز عمل شہنشاہی طور طریقوں کا آئینہ دار ہے تو انہوں نے اس کے خلاف بالکل اسی طرح بغاوت کردی جس طرح وہ اپنے سابقہ حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

حضرت عثمان نے جب عوام کے حقوق پامال کرنے شروع کئے اور اپنے قبیلہ بنی امیہ کے بچوں لفنگوں کو بیجا داد و دہش سے نوازنے کا طریقہ اختیار کیا تو اسلام کے دلدادہ اور گرویدہ افراد جو اسلام کو اپنی تمام مشکلات و مصائب کا حل سمجھتے تھے بگڑ گئے۔ انہوں نے اپنے سروں کی آنکھوں سے دیکھا کہ خلیفۂ وقت بگڑے نواب کی طرح ملک کی ساری دولت اور تمام وسائل معیشت اپنے ہی قبیلے کے لیے مختص کیے جا رہا ہے اور ملک کے تمام کلیدی عہدوں پر بنی امیہ ہی کے افراد براجمان ہوتے جا رہے ہیں اور گویا ایک نیا حقوق یافتہ خاندان بلکہ ایک شاہی خانوادہ (ROYAL FAMILY) اسلامی ریاست کے ٹکڑوں پر پالا پوسا اور تیار کیا جا رہا ہے۔ تو انھوں نے ایک بھرپور بغاوت کے ذریعہ اس مستبد حکمراں کا تختہ الٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس "خلافت مستبدہ" نے جسے "برعکس نہند نام زنگی کافور" کے مصداق خلافتِ راشدہ سے تعبیر کیا گیا۔ اسلام کے نظام عدل و مساوات کا تیا پانچہ کر کے رکھ دیا

کہ آج چودہ سو سال ہونے کو آئے ہیں اسلام کے اس نظام عدل و مساوات کا کسی اسلامی ملک میں نشان تک نظر نہیں آتا۔

حالانکہ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذہن میں جس آئیڈیل (IDEAL) اور مثالی حکمراں کا تصور تھا۔ اس کے بارے میں حضور اقدس صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:۔

الا ابشر کم بالمہدی یرضی عنہ ساکن السماء والارض قسطا کما ملئت جورا و یقسم المال صحاحا قیل وکیف یارسول اللہ قال بالسویہ بین الناس۔

(میں تمہیں مہدی کی آمد آمد کی خبر خوش نہ سناؤں جس سے زمین و آسمان کے تمام باشندے خوش رہیں گے جو زمین کو عدل و انصاف سے اس طرح معمور کر دے گا جیسا کہ وہ پہلے ظلم سے بھری ہوئی ہوگی، جو مال کو ٹھیک ٹھیک تقسیم کرے گا ——— صحابہ نے دریافت کیا: مال کی صحیح تقسیم سے کیا مراد ہے؟ ارشاد فرمایا کہ دولت کی تقسیم انسانوں میں مساویانہ ہوگی۔

یہ ہے وہ صحیح اسلامی حکومت اور یہ ہے خلافتِ راشدہ کے اصلی خدوخال کا سراغ جو نہ دورِ ابوبکر میں کہیں ملتا ہے نہ عہدِ فاروقی و عثمانی میں، بلکہ دورِ عثمانی تو غالباً تاریخ انسانی کا بدترین دور تھا۔

تقریباً سبھی مؤرخین نے یہ بات لکھی ہے کہ حضرت عثمان نے اپنے عہدِ خلافت میں بعض ایسی غلط کاریاں فرمائیں جو ان کے خلاف ملک گیر نفرت کی صورت اختیار کر گئیں۔ یہ سب مؤرخ اہلِ سنت ہی کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور سبھی اس امر پر متفق ہیں کہ حضرت عثمان نے اپنے دورِ خلافت میں اپنے قریبی رشتہ داروں کو ان کی نااہلیت کے باوجود بڑے بڑے عہدوں سے نوازا۔ ان پر بیت المال کے دروازے کھول دیے اور اپنے قبیلہ

بنی امیہ کو انھوں نے بیجا داد و دہش سے مالا مال کر دیا۔

دارالعلوم دیوبند کے نامور شیخ الحدیث علامہ انور کاشمیری نے اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

ثم ان سبب تهييج هذه الفتن ان امير المومنين عثمان رضي الله عنه كان يستعمل اقاربه وكان بعضهم لايحسنون العمل فقدح الناس فيهم وبلغوا امرهم الى عثمان رضي الله عنه فلم يصدقهم وظن انهم يعرضون باقاربه بلا سبب ولعلهم لايطيب بانفسهم فيشكون هم (فیض الباری شرح بخاری ج ۲)

حضرت عثمان کے خلاف عامۃ الناس کے ہیجان کا سبب اور باعث یہ ہوا کہ امیر المؤمنین عثمان اپنے رشتہ داروں کو مناصب حکومت پر سرفراز کرتے رہتے تھے اور ان میں سے بعض کی روش درست نہیں تھی۔ اس پر لوگوں نے ان عہدہ داروں کے خلاف اعتراضات کیے ان کی شکایت حضرت عثمان سے کی مگر حضرت عثمان نے ان شکایات کو صحیح نہیں سمجھا بلکہ یہ خیال کیا کہ یہ لوگ میرے رشتہ داروں سے بلا وجہ حسد کرتے ہیں اور لوگوں کو یہ گوارا نہیں کہ میرے رشتہ دار عہدہ و منصب پر فائز ہوں اس لیے وہ ان کی شکایتیں کرتے ہیں۔[1]

---

[1] حضرت عثمان نے اپنے جن قرابت داروں کو گورنریاں بخشیں ان میں ایک نام ولید بن عتبہ بن ابی معیط کا بھی ہے، جسے قرآنِ مقدس نے "فاسق" کا خطاب دیا تھا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شخص کو بنی المصطلق سے صدقات وصول کرنے بھیجا۔ بنو المصطلق کو جب خبر ہوئی کہ حضورؐ کے قاصد ان سے صدقہ وصول کرنے آ رہے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئے اور ان کے استقبال کے لیے نکلے لیکن ولید کو نہ جانے کیا سوجھی کہ وہیں سے پیچھے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۶ پر)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی مشہور کتاب "الاصابہ" میں بھی اسی قسم کی صورتِ حال کا تذکرہ کیا ہے۔ (الاصابہ ج ۲ ص ۴۵۵) اور اس باب میں تو تمام مؤرخین و محدثین متفق اللسان ہیں کہ حضرت عثمان نے خویش پروری اور اقربا نوازی کا جو چکر اپنے عہدِ خلافت میں چلایا اس سے بڑے بڑے صحابہ برہم ہوئے۔ ایک صحابی تو ان کے یہ لچھن دیکھ کر ان کے سامنے ہی رو پڑے۔ انہوں نے پوچھا روتے کس لیے ہو؟ وہ صحابی بولے روتا اس لیے ہوں کہ تم نے دامے درمے اسلام کی جو خدمت سرانجام دی تھی آج مع سود اسے واپس لے رہے ہو۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۴۵) بیرون واپس پلٹا اور حضورؐ سے آکر کہہ دیا کہ بنو مصطلق صدقہ دینے سے انکاری ہیں۔ حضور یہ سن کر بہت غضب ناک ہوئے اور ابھی ارادہ فرما ہی رہے تھے کہ ان کے خلاف کارروائی کی جائے کہ اتنے میں بنو مصطلق کا ایک وفد بارگاہ نبوت میں حاضر ہوا اور اس نے آکر ساری بات بتائی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جب آپ کا قاصد بیچ راستے سے واپس لوٹ گیا تو ہم یہ سمجھے کہ آپ شاید ہم سے ناراض ہیں اور ہم اللہ کے اور آپ کے غضب سے پناہ مانگتے ہیں۔ اس موقع پر سورۂ حجرات کی یہ آیت نازل ہوئی کہ: ۔ یا ایھا الذین آمنوا ان جائکم فاسق بنبا فتبینو اان تصیبوا قوما بجہالۃ علی ما فعلتم نادمین " اے ایمان والو اگر کوئی بدکار شخص تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو۔ مبادا تم کسی قوم کے خلاف کوئی اقدام غلطی سے کر بیٹھو اور بعد میں پچھتاؤ۔"

ابن عبدالبر نے استیعاب میں صراحت کی ہے کہ اہلِ علم کے نزدیک اس باب میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ یہ آیت ولید بن عتبہ بن ابی معیط ہی کے باب میں نازل ہوئی۔

اس "فاسق" کو جو حضرت عثمان کا ماں جایا بھائی تھا حضرت عثمان نے سعد بن ابی وقاص کو ہٹا کر کوفے کا گورنر مقرر کیا تھا۔

یہ صحابی عبداللہ بن ارقم تھے جو بیت المال کے انچارج تھے۔ عثمان ان کے منہ سے اپنے خلاف یہ تنقید سن کر غضب ناک ہو گئے اور بولے بیت المال کی چابیاں ہمارے حوالے کر دو۔ ہمارے پاس تمہارے علاوہ بھی بہت سے کارکن ہیں۔

صحابہ یا خرابہ

صحابہ کی عظمت کی فرضی داستانیں اور قرآنِ مقدس کی وہ بے شمار آیتیں دوسری طرف جن میں حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان صحابہ کی کج ادائی کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ وفا کے ماتھے پر پسینہ آجائے اور جبیں دوستی عرق عرق ہو جائے۔

غزوۂ حنین میں جب تیروں کی بوچھاڑ ہوئی تو سارے جلیل القدر صحابہ دم دبا کر بھاگ نکلے۔ اس موقع پر حضورؐ کے جن پانچ چھ جاں نثار فدائیوں کو ثابت قدم رہنے کا شرف حاصل ہوا ان میں آنحضورؐ کے ابن عمؑ سیدنا علی علیہ السلام حضورؐ کے ایک دوسرے چچازاد بھائی سفیان بن الحارث اور حضورؐ کے عم بزرگوار حضرت عباس بن عبدالمطلب کے نام تو ملتے ہیں مگر کسی تذکرہ نگار نے روایتی عاشقِ رسولؐ ابوبکر یا عمر یا عثمان یا کسی اور کا نام نہیں لیا۔ حدیث کی تمام کتابوں میں البتہ ابوبکر کے ڈینگ مارنے کا قصہ ضرور مذکور ہے کہ انہوں نے اس موقع پر کہا تھا۔

"آج حنین کے معرکہ میں ہمیں کون شکست دے سکتا ہے جبکہ ہماری تعداد بہت زیادہ ہے۔"

خدا پر اعتماد اپنی قوت ایمانی پر بھروسہ کرنے کے بجائے کثرت تعداد پر غرّہ کرنے کا انجام یہ ہوا کہ پہلے ہی ہلّے میں یہ تمام عاشقانِ رسولؐ بھاگ نکلے۔

ان صحابہ کی بے مروتی، ان کی خست اور ان کی فرمائیگی کا جائزہ لینا ہو تو

چوتھے پارے میں غزوۂ اُحد کی روداد پڑھ لیں، اکیسویں پارے میں سورۂ احزاب کی وہ آیات پیش نظر رکھیں جن میں میدانِ جنگ سے ان کے فرار کی عبرتناک داستان بیان کی گئی ہے سورۂ جمعہ کے آخری رکوع کے مضمون کا مطالعہ کریں، تیسویں پارہ کے سورۂ ماعون کے معانی پر ایک نظر ڈالیں، سورۂ توبہ کی ان آیات پر جو گیارہویں پارے کے دوسرے رکوع میں ہیں غور کریں، سورۂ تحریم پارہ ۲۸ اور سورۂ منافقین ۲۸ اور سورۂ بقرہ اور دیگر بہت سی آیات قرآنیہ میں ان صحابہ کی جو کارگزاریاں بیان کی گئی ہیں ان سب پر محض ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں اور سوچیں کہ وہ کون سا جرم ہے جو صحابہ کی بستی میں نہیں ہوا۔ انسانیت کے دامن پر سب سے بدنما داغ تو بے مروتی اور بے لحاظی کا ہوتا ہے اور تاریخ کی متواتر شہادت اگر موجود ہے کہ صحابہ خود رسول اللہ کے ساتھ اِس جرم کے مرتکب ہوئے تو اس کے بعد باقی کیا بچتا ہے کہ اس کے لیے صحابہ کی صفائی پیش کی جائے۔

حیرت بالائے حیرت تو یہ ہے کہ صحابہ تو رہے ایک طرف خود امہات المومنین میں دو عورتیں ایسی ہیں جن پر صحبت نبوی کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا۔ شاعر نے سچ کہا ہے ؎

باران کہ لطافت طبعش خلاف نیست

در باغ لالہ روید و در شورہ زار خس

عائشہؓ بنت ابوبکر کا جرم کچھ کم ہے کہ وہ ام المومنین ہوتے ہوئے ماں کی بجائے ڈائن کا روپ اختیار کر گئیں اور ان کی لگائی بجھائی کی فطرت سے امت کے درمیان تفرقہ و نفاق کی ایسی آگ بھڑکائی جس میں ہزاروں صحابہ و تابعین بھسم ہو کر رہ گئے اور جب وہ میدانِ جنگ میں حضرت علیؑ سے سیاسی اور اخلاقی شکست کھا گئیں تو تمام عمر اس جرم پر مگرمچھ کے آنسو بہاتی رہیں۔

مشہور انگریز مؤرخ وکرنے اعتراف کیا ہے کہ اگر جناب عائشہ سیدنا علی علیہ السلام کے عہد میں مسلمانوں کو خانہ جنگی میں مبتلا نہ کر دیتیں تو پوری دنیا اسلام کی حلقہ بگوش ہو

گئی ہوتی مگر حضرت عائشہ کو سیدنا علیؑ سے جو بغض وعناد تھا اس نے انہیں چین سے بیٹھنے نہ دیا اور انھوں نے اسلام کی نظریاتی شان وشوکت کو اپنی آتشِ انتقام کی بھٹی میں جھونک دیا۔ (حاضر العالم الاسلام ج ا ص ۱۴۱)

امیر المومنین سیدنا علی علیہ السلام نے حضرت عائشہ کی اس معاندانہ روش پر جو مختصر تبصرہ فرمایا تھا وہ بڑا جامع ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

"لوگو! عائشہ بصرہ کی طرف روانہ ہوئی ہے، اس کے ساتھ طلحہ وزبیر بھی ہیں اور یہ دونوں اپنے اپنے لیے خلافت کے طلب گار ہیں۔ طلحہ عائشہ کا ہم زاد اور ہم قبیلہ ہے اور زبیر اس کا بہنوئی ہے۔ خدا کی قسم سرخ اونٹ پر سوار یہ عورت، اس کا ہر قدم اور ہر اقدام خدا کی نافرمانی اور اس کی معصیت کی جانب ہے اور اس کا ہر عمل خدا کے غضب کو دعوت دے رہا ہے۔ (تاریخ ابی الفداء ج ا ص ۱۸۰)

مشہور مستشرق بروکلمان نے حضرت عائشہ کے طرزِ عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "وہ عثمان کے خلاف شورش برپا کرنے کے بعد خود تو مکہ روانہ ہوگئیں اور جب ان کی برپا کی ہوئی شورش کے نتیجے میں حضرت عثمان قتل ہوگئے تو بھس میں چنگاری لگا بی جمالو الگ کھڑی نہیں رہیں بلکہ اب انہوں نے اپنی فتنہ انگیزی کا رُخ امیر المومنین سیدنا علیؑ کی جانب موڑ دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ عائشہ نہایت فتنہ پرور عورت تھیں اور فتنہ انگیزی ان کی سرشت میں داخل تھی۔ (بروکلمان فی تاریخ الشعوب اسلامیہ ص ۱۲۳)

حضرت عائشہ کے بارے میں اہلِ سنّت نے فضائل ومناقب کا جو طامار باندھ رکھا ہے اسے ذہن میں رکھئے اور پھر حقائق پر نظر ڈالیے جن سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اسلام کو پیغمبر اسلام کو اور خود اپنی ذات کو اس درجہ رسوا اور ذلیل وخوار کرنے کی مجرمانہ کوشش کی تو آپ کو اس بات کا اندازہ ہوگا کہ حضرت عائشہ کا وجود اسلام کے لیے کس قدر مضرتوں اور خطروں کا باعث بنا۔

ازواجِ مطہرات کے لیے قرآن مقدس کی واضح ہدایت تھی کہ وہ گھروں میں بیٹھی رہیں۔ (سورۂ احزاب پ۲۲) مزید برآں خود حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا اور مخاطب تمام ازواج موجود تھیں۔

هذه الحجة ثم ظهور الحصر

(اس حج کے بعد تمہیں گھر کی چٹائیوں کو ہمیشہ کے لیے اختیار کرنا ہوگا۔)

ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے اپنی ازواج سے مخاطب ہو کر فرمایا:

اینکن اتقت الله و لم تات فاحشة مبینة و لزمت ظهر حصیرها فهی زوجتی فی الآخرة (طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۱۵۰)

(تم میں سے جو عورت اللہ سے ڈرتی رہی اور کسی برائی اور علانیہ بدعنوانی کی مرتکب نہ ہوئی اور وہ اپنے گھر کی چٹائی کو پکڑے رکھا تو وہی آخرت میں میری بیوی ہوگی۔"

حضورؐ نے نام لیے بغیر اپنی ایک بیوی کے بارے میں پیش گوئی فرمائی تھی کہ اس پر مقامِ حَوْاَبْ کے کُتے بھونکیں گے اور یہ حضرت عائشہ ہی تھیں جو جنگ جمل کے لیے جاتی ہوئی وہاں سے گزریں اور وہاں ان پر کتے بھونکے۔ یہ واقعہ خود بتا رہا ہے کہ حضرت عائشہ نے قرآن پاک کی نص قطعی و حضورؐ کے فرامین کی خلاف ورزی کی اور اس طرح احکام شریعت سے انحراف کی راہ اختیار کی۔ اُم المومنین حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ نے ایک بار اپنی ایک بیوی کے گھر سے باہر نکلنے کا ذکر فرمایا اس پر عائشہ ہنسیں۔ یہ دیکھ کر حضورؐ نے فرمایا:

انظری یا حمیرا ان لا تکرنی انتِ

(دیکھنا اے حُمیرا (حضرت عائشہ کا لقب)، کہیں وہ تم ہی نہ ہو۔)

بخاری اور دیگر کتب حدیث میں ہے کہ غالباً ان کے اسی متوقع طرز عمل کی بناء پر حضور اقدس صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ کے گھر کی جانب اشارہ کر کے

یہ خبر دی تھی کہ عائشہ کے گھر سے شیطان کا سینگ طلوع ہوگا۔ بخاری کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:۔

حدثنا موسیٰ بن اسمٰعیل حدثنا جویریہ عن نافع عن عبد اللہ بن عمر قال قال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطیبا فاشار نحو مسکن عائشۃ فقال ھٰھنا الفتنۃ ثلاثا من خیث یطلع قرن الشیطان۔ (البخاری فی الخمس فی باب ماجاء فی بیوت ازواج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حال ہی میں ایک دریدہ دہن شخص نے پاکستان میں "صدیقۂ کائنات" کے عنوان سے سیرتِ عائشہ پر ایک کتاب لکھی ہے اور اپنے بے سروپا استدلال، اپنے خارجیانہ ذہن اور اپنی پستیٔ فطرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے امیر المومنین سیدنا علیؑ کی خلافتِ راشدہ سے انکار کیا ہے۔ اس سے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے عائشہ کی فضیلت کی آڑ میں امیر المومنین علیہ السلام کے خلاف جلے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں۔ لیکن یہ جاہل و اجہل اور اخبث و ارزل شخص ان سب سے بازی لے گیا ہے۔ اسے ساون کے اندھے کی طرح ہر طرف یہودیوں کی سازش کا جال پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ کوئی اس لال بجھکڑ سے پوچھے کہ اس کے قول کے مطابق جب عثمان پر خلافت نبوت ختم ہوگئی تو نبیؐ کے اس نااہل خلیفہ کے دور میں سبائیت پروان چڑھتی رہی اور یہودیت پر پُرزے نکالتی رہی مگر یہ نبی کا خلیفہ "روم جل رہا تھا اور نیرو بانسری بجا رہا تھا" کے مصداق چین کی بنسری بجاتا رہا اور یہودیت کا گماشتہ عبد اللہ ابن سبا اس کی ناک کے نیچے اسلام دشمنی کا کھیل کھیلتا رہا اور اسے کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ع

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

آئینہ ان کو دکھایا تو بُرا مان گئے

شیعیت کے خلاف سنّی حلقوں میں اس بات کا چرچا رہا ہے کہ اس کی بنیاد ایک یہودی عبد اللہ ابن سبا نے رکھی اور اس تنہا شخص نے مسلمانوں کے معاشرہ میں وہ ہنگامہ کھڑا کیا کہ خلافت راشدہ کی اینٹ سے اینٹ بج کر رہ گئی، خلیفہ ثالث نہایت بری موت مارے گئے اور پوری امت مسلمہ کا شیرازہ ایک یہودی کی دسیسہ کاریوں سے بکھر کر رہ گیا۔

لیکن ازراہِ انصاف ذرا غور تو کیجئے کہ یہ کیسے ممکن ہوا کہ تن تنہا ایک شخص ایک ایسے معاشرے میں نقب لگانے میں کامیاب ہو گیا جسے پیغمبرؐ اور اسکے جانشینوں نے بڑی مضبوط بنیادوں پر قائم کیا تھا۔ ایک یہودی بچہ خواہ وہ کیسا ہی بہروپ کیوں نہ بھرے یہ بات عملاً بھی محال ہے اور عقلاً بھی متعذر کہ وہ ایک عظیم الشان نظریاتی مملکت کو ڈائنامیٹ کر دے، ایک مثالی ریاست کو تہس نہس کر دے اور ایک ایسی تحریک کی بنیاد رکھ جائے جس کی آتش دامانیوں سے اس امت میں فتنہ و فساد کی آگ ہمیشہ بھڑکتی رہے۔ شیعیت کی بنیاد اگر عبد اللہ ابن سبا یہودی کے زرخیز دماغ کی پیداوار ہے تو وہ جلیل القدر صحابہ اور گروہ تابعین کے سرکردہ افراد جن کی عظمتوں کے ڈنکے بجائے جاتے ہیں وہ کن کونوں کھدروں میں چھپے بیٹھے تھے کہ ایک یہودی کی سازشوں کا قلع قمع نہ کر سکے۔ اگر عبد اللہ بن سبا ایسا ہی کامیاب سیاست داں تھا کہ اس کی سیاسی چیرہ دستیوں اور ترک تازیوں سے برسرِ اقتدار طبقہ بوکھلا گیا اور اس سے تاب مقابلہ نہ لا کر پسپائی اختیار کر گیا کہ نہ معاویہ کی سیاست گری اس کا توڑ کر سکی، نہ مغیرہ بن شعبہ کی مکاری اسے زیر کر سکی، نہ عمرو بن العاص کی عیاری اس کا مقابلہ کر سکی، نہ طلحہ و زبیر اس کی راہ کی رکاوٹ بن سکے، نہ حضرت عائشہ اس سیلاب کے بند ھ باندھ سکیں۔

تو یہ عبد اللہ ابن سبا نہ ہوا آفت کا پرکالہ ہوا کہ سب منہ دیکھتے رہ گئے اور وہ ایک ایسی تحریک کا بیج بونے میں کامیاب ہو گیا جو آج چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود نہ صرف زندہ ہے بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ طاقت ور بن کر پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔

آج روئے زمین کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں شیعیت کے قدم بڑی پائیداری کے ساتھ جم نہ چکے ہوں۔ سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں کوئی خالی دن نہیں گزرتا جب شیعیانِ علیؑ کا گروہ ان لوگوں پر لعنت نہ کرتا ہو جو سیدنا علی ابن ابی طالب علیہما السلام کے حریف بنے، جنہوں نے جناب امیر علیہ السلام کی حق تلفی کی، جنھوں نے اہلبیت نبوت کے حقوق غصب کئے بالخصوص محرم کے ماہ عزا میں تو الا لعنۃ اللہ علی الظالمین کا آواز اس شدت سے گونجتا ہے کہ ظالموں کی بوسیدہ ہڈیاں ان کی قبروں میں چٹخنے لگتی ہیں۔ عبد اللہ ابن سبا کی شخصیت تو ڈھائی سو برس کے بعد گھڑی گئی۔ ایک سراسر مفروضہ شخصیت ہے جسے سنّیوں نے شیعوں کے جواب میں استدلال کے فقدان کے باعث وضع کیا ورنہ اللہ نے کوئی ایسا انسان پیدا نہیں کیا جس کا نام عبد اللہ بن سبا ہو۔

علمائے اہلِ سنّت نے یہ نام تو محض اپنے بدنام اسلاف کے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے ایجاد کیا۔ نہ اس نام کا کوئی شخص تھا نہ اس نے کوئی تحریک چلائی نہ یہ یہودیوں کی کوئی سازش تھی۔ یہ اپنا کیا دھرا تھا جو سامنے آرہا تھا۔ اپنے ہی کرتوتوں نے ایک ہیولیٰ سامنے لا کھڑا کیا اور اس میں انہیں اپنا چہرہ یہودیوں جیسا نظر آیا۔ ع

یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

لوگ اتنے نادان بھی نہیں تھے کہ یہودی صفت مسلمانوں کی کارگزاریوں کو دیکھ کر قرآن کے خلاف اپنے ردِ عمل کا اظہار نہ کرتے اور جب اس ردعمل کا اظہار شروع ہوا تو انہوں نے اپنی بدکاریوں کا پشتارہ اٹھا کر ایک سراسر مفروضہ شخصیت کی گردن پر رکھ دیا اور اسے عبد اللہ

ابن سبا کا نام دے دیا۔ ؏

نام ان کا آسماں ٹھیرا لیا تحریر یں

عبد اللہ ابن سبا کے فرضی اور من گھڑت ہونے پر تو تاریخ اپنا فیصلہ دے چکی ہے اور خداوند قدوس جزائے خیر دے اس عظیم محقق اور دانشور علامہ سید مرتضیٰ عسکری مدت فیوضہم کو جنہوں نے عبد اللہ بن سبا کے موضوع پر دستاویزی ثبوت کے ساتھ دو جلدوں میں ایک معرکہ آرا کتاب لکھ کر واضح کر دیا ہے کہ ایسا کوئی شخص سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ بہت بعد میں واضعین حدیث کے ایک نامی گرامی اور پیشہ ور کذاب سیف بن عمر تمیمی نے اس کا ہیولیٰ تیار کیا اور اس میں جان ڈال کر دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ اسے پہلے پہل طبری نے گود لیا اور سیف بن عمر تمیمی کی روایات کو اپنی کتاب میں نقل کرنے کی حماقت کی۔ اور بعد میں جتنے بھی مورخ گزرے انہو نے اس شخصیت کا ذکر اپنی کتبِ تاریخ میں طبری ہی کے حوالے سے کیا اور جھوٹ کو سچ بنا دیا۔

جتنے ستوں تھے ریت کی دیوار پر اٹھائے ہم نے کس احتیاط سے تعمیر گھر کیا

البتہ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ۲۳ سالہ تبلیغی زندگی میں دو یا حد سے تین یہودی مسلمان ہوئے اور وہ سب معاویہ بن ابی سفیان کے کیمپ میں تھے اور معاویہ نے ان کے سپرد یہ کام کیا تھا کہ وہ اسلام کو اپنی تاویلات باطلہ اور اپنی روایاتِ فاسدہ سے اس حد تک بگاڑ کر رکھ دیں کہ اسلامی تعلیمات کا چہرہ مسخ ہو جائے۔

عبد اللہ ابن سلام نو مسلم یہودی، کعب احبار اور وہب بن منبہ یہ تین وہ شخص ہیں جنہوں نے حکومت وقت یعنی معاویہ کی سرپرستی میں قرآن مقدس کی تفسیر کو اسرائیلی روایات کے ذریعے مسخ کر دیا اور آج ہمارے پاس جس قدر تفسیری اثاثہ ہے اس کا نوے فیصد حصہ انہیں خرافات پر مشتمل ہے جو معاویہ کے ان زرخرید قلمکاروں

نے فراہم کیا ہے۔

تاریخ کے ریکارڈ پر یہ بات موجود ہے کہ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اس دھرتی پر اس آسمان کے نیچے سب سے سچے انسان حضرت ابوذر غفاریؓ نے ایک مرتبہ عبداللہ ابن سلام کی اسی قسم کی تاویلات زائغہ پر غضب ناک ہو کر اسے "او یہود کے بچے" کہہ کر پکارا اور لاٹھی لے کر اس کی پٹائی کرنی چاہی کیونکہ حضرت ابوذر غفاری نے محسوس فرمایا کہ یہ شخص دین اسلام کو بگاڑنے میں سرگرم عمل ہے۔

وہ حدیثیں جن میں حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی برتری کا تصور پیش کیا گیا ہے وہ سب اسی یہودی دماغ کی پیداوار ہیں اور ایسی حدیثیں زیادہ تر آپ کو "صحیح بخاری" میں ملیں گی جو خود یہودی نژاد تھا۔

(اضواعلی السنۃ المحمدیہ)

اسوۂ ابراہیمی

اہل سنت والجماعت کو شیعہ حضرات سے سب سے بڑی شکایت ان کی رسم تبرّا سے ہے۔ یہ اعتراض سینوں کے ہاں ہمیشہ زباں زد خاص و عام ہے۔ تبرّا کے لفظی معنی تو اظہار برأت و بیزاری کے ہیں لیکن عام طور پر اس سے لعنت و ملامت کے الفاظ لیے جاتے ہیں۔ سنیوں کو شیعوں سے یہ گلہ رہا ہے کہ وہ صحابہ پر تبرّا بھیجتے ہیں بالخصوص اصحابِ ثلاثہ ان کے تبرّا کی زد میں رہتے ہیں۔

قرآن مقدس نے ظالموں، کافروں اور بدکاروں سے اظہار بیزاری اور اعلان براءت کو اسوۂ ابراہیمی قرار دے کر اس کی پیروی کرنے کی ہدایت کی ہے اور اسے ایک بہترین نمونۂ عمل سے تعبیر کیا ہے۔ (سورۂ ممتحنہ پ ۲۸)

توجہاں تک ظالموں سے نفرت بغض وعداوت اور اظہار بیزاری کا تعلق ہے تو عین تعلیماتِ اسلامی کے مطابق ہے۔ اگر کوئی شخص بہ ظاہر اہلِ ایمان کے زمرہ میں شامل ہو لیکن اس کی زندگی ظلم وزیادتی کی آئینہ دار ہو تو ایسے شخص کے خلاف نفرت کا اظہار ہونا چاہیئے۔

اہلِ سنّت کے ہاں نماز وتر میں جو دعائے قنوت پڑھی جاتی ہے اس میں بھی ونخلع ونترک من یفجرک (اور ہم قطع تعلق اور ترک روابط کرتے ہیں ہر اس شخص سے جو تیری معصیت اور فسق وفجور میں مبتلا ہے۔)

قرآن مقدس نے" الالعنة الله على الظالمين (سنو ظالموں پر خدا کی پھٹکار ہے) کے اعلان کے لیے "اذان،، کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی ظالموں پر لعنت اذان کے لب ولہجہ میں یعنی آواز کی پوری بلندی کے ساتھ کی جائے۔ چنانچہ اگر اذان میں ان الفاظ کا اضافہ کر لیا جاتا تو "الصلوٰۃ خیر من النوم،، کے اضافے سے تو زیادہ بہتر بھی رہتا اور زیادہ مستند بھی کہ اس کا جواز بلکہ استحباب قرآن سے ثابت ہے، جبکہ "الصلوٰۃ خیر من النوم،، کا نہ کوئی تک ہے نہ کوئی آہنگ اور یہ حضرت عمر کے کسی زرخرید کی طرف سے اضافہ ہے۔

کاش ہمارے شیعہ علماء ومجتہدین عصر نے اذان میں ان الفاظ کے اضافہ کرنے کا حکم دیا ہوتا تو قرآن کے منشاء کی تکمیل ہو جاتی۔ باقی رہا سب وشتم اور لعن طعن کا معاملہ تو یہ تو دراصل ع یہ ہے گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے۔

تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے انہیں یہ بتانے کی چنداں حاجت نہیں کہ تبرا کی رسم بد کا آغاز معاویہ بن ابی سفیان کے عہدِ حکومت میں اس کی دنائت طبع سے ہوا۔ تاریخ اسلامی کا یہ وہ بدترین حکمران ہے جس نے اپنے دور کے امام مظلوم امیر المومنین سیدنا علی بن ابو طالب کرم اللہ وجہہ کی ذات والاصفات پر سب وشتم کا سلسلہ آغاز کیا۔ اس

بدنہاد شخص نے اپنی قلمرو سلطنت میں تمام عمال وحکام کو ہدایت کی کہ وہ خطبۂ جمعہ کے اختتام پر امیرالمومنین علیؑ کی ذات اقدس پر لعنت بھیجیں۔ (والعیاذ باللہ) اور یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا تاآنکہ بنی اُمیہ ہی کے ایک نیک دل خلیفہ امیرالمومنین عمر ابن عبدالعزیز نے اس رسم بد کا خاتمہ کیا اور اس کی جگہ چودھویں پارہ کی وہ آیت مقدسہ پڑھنے کا حکم دیا جو آج تک اہلِ سنّت کے خطبہ ہائے جمعہ میں پڑھی جاتی ہے۔

"ان اللہ یامر بالعدل الخ"

معاویہ بن ابی سفیان کے اشارۂ ابرو پر امیرالمومنین علیہ السلام کے خلاف لعن طعن کا یہ انداز اس قدر گھناؤنا اور اتنا مکروہ ہوتا تھا کہ تہذیب وشرافت کے کسی بھی زاویے سے اس کے لیے جواز کی ادنیٰ سی گنجائش بھی باقی نہیں رہتی۔ امیرالمومنینؑ کے تشخصات خارجی کے ساتھ ان پر لعنت بھیجی جاتی تھی۔ ایک شخص اٹھتا تھا اور منبر پر چڑھ کر کہتا تھا (نقل کفر کفر نہ باشد، عیاذ باللہ)

"میں ---------- پر لعنت بھیجتا ہوں کون علیؑ؟ رسول اللہ کا داماد، فاطمہ کا شوہر حسنؑ حسینؑ کا باپ اور ابو طالب کا فرزند۔"

اس معاویہ کو اپنا پیشوا اور خلیفۂ برحق اور اسلامی تاریخ کا ایک ہیرو ماننے والوں کو یہ کہاں زیب دیتا ہے کہ وہ شیعوں پر یہ اعتراض کریں کہ وہ تبرّا کرتے ہیں۔

معاویہ بن ابی سفیان کی علیؑ ابنِ ابی طالبؑ سے وہ نسبت بھی نہیں ہے جو ذرّے کو آفتاب سے ہوتی ہے۔ ایک ایسا شخص جو فتح مکہ کے دن مسلمان ہوا یعنی مارے باندھے کا مسلمان، وہ اس عظمۃ العظمات علیؑ کا حریف بنے اور اسے خود بھی گالیاں دے اور اپنے پالتو اور زرخرید لوگوں سے بھی گالیاں دلوائے۔ ایسے بدنہاد، بدبخت اور دوں فطرت شخص کو اگر شیعان مستحق لعنت قرار دیں اور اسے ابدی اور دائمی پھٹکار کا مستوجب سمجھیں تو یہ تبرّا نہیں امر واقعہ کا اظہار ہے۔ وسیعلم الذین

ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

دنیا کا کوئی انصاف پسند شخص معاویہ کو سیدنا علیؑ کا ہمسر تسلیم نہیں کرسکتا، نہ اخلاق میں نہ ایمان میں، نہ مکارم میں نہ محاسن میں، نہ علم و فضل میں، نہ شجاعت و بہادری میں، نہ تقویٰ و پارسائی میں، نہ زہد و ورع میں، نہ جود و سخا میں، نہ نیکی و پرہیزگاری میں، نہ عظمت کردار میں، نہ سبقتِ اسلام میں۔ یہ بدبختی اہلسنت کے حصے میں آئی ہے کہ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کہ معاویہ کو علیؑ سے کوئی نسبت نہیں۔ معاویہ کے گن گاتے ہیں، اس کی عظمت کے قصیدے پڑھتے ہیں، اس کی شخصیت و کردار کی مدح سرائی کرتے ہیں اور انہیں یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ رسول اللہ کی سب سے محبوب شخصیت سے برسرِ پیکار رہنے والے شخص کی عزت افزائی سے خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل پر کیا گزرتی ہوگی ؟[1]

---

[1] حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری شرح بخاری میں ابن جوزی محدث کے کے حوالے سے احمد بن حنبل کے صاحبزادے عبداللہ بن احمد کی روایت نقل کی ہے۔ عبداللہ ابن احمد ابن حنبل کہتے ہیں۔ میں نے اپنے والد سے دریافت کیا حضرت علیؑ اور معاویہ کے بارے میں آپ کا خیال ہے۔ میرا سوال سن کر انہوں نے سر جھکالیا۔ پھر کچھ وقفے کے بعد بولے۔ یہ بات ذہن میں رکھو کہ حضرت علیؑ کے دشمن بہت زیادہ تھے اور یہ دشمنان علیؑ ہر وقت اس جستجو میں رہتے تھے کہ حضرت علی کا کوئی عیب ان کے ہاتھ لگے۔ اس کوشش میں تو وہ کامیاب ہو نہ سکے البتہ اس کا متبادل انہوں نے یہ سوچا کہ اس شخص کی تعریف میں قصیدے لکھیں اور چھاپیں۔ جو حضرت علیؑ سے برسرِ پیکار رہا ہو۔ یہ ان کا اشارہ معاویہ کی طرف تھا جس کی فضیلت میں بے بنیاد روایتیں پیش کی گئیں۔

معاویہ کے فضائل مناقب میں ایسی بہت سی حدیثیں (بقیہ حاشیہ ص ۱۵۹ پر)

"دوست کا دشمن، دشمن ہوتا ہے اور دشمن کا دوست دشمن ہوتا ہے۔" ایک بدیہی اور منطقی بات ہے جو عقل کی اس بداہت سے بھی باخبر نہ ہو اس کی جہالت کا ماتم نہ کیا جائے تو اور کیا کیا جائے۔

شیعان علیؑ ماتم کرتے ہیں اسی جہالت کا، اسی تضاد بیانی کا اور وہ صدائے احتجاج بلند کرتے اسی بوالعجبی کے خلاف کہ ظالم اور مظلوم دونوں کو ایک ہی سطح پر لا کھڑا کیا جاتا ہے۔ مظلوم بھی خلیفہ برحق اور ظالم بھی خلیفہ برحق، منطق کا ایک کلیہ ہے:- Two things contradictory to each other cannot be true at one and the same time.

"دو چیزیں جو ایک دوسرے کی ضد ہوں بیک وقت دونوں سچائی پر مبنی نہیں ہو سکتیں۔"

لیکن ان عقل کے اندھوں اور گانٹھ کے پوروں کو اتنی موٹی سی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر سیدنا علیؑ اور معاویہ دونوں حق پر تھے تو دونوں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کیسے ہوگئے اور دونوں کے درمیان جنگ و نزاع کا یہ ہنگامہ کیوں گرم ہوا؟

امیر المومنین سیدنا علی علیہ السلام نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا تھا:-

"انزلني الدهر ثم انزلني حتى قالوا معاوية وعلى (زمانے نے مجھے اتنا گرایا اور پست کیا کہ اب میرے نام کے ساتھ معاویہ کا نام

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۸) گھڑی گئیں کہ جو سند کے اعتبار سے نا قابلِ اعتبار ہیں۔ بخاری کے ایک استاد اسحاق بن راہویہ نے بھی ان تمام حدیثوں کو از روئے سند غیر معتبر اور موضوع قرار دیا ہے اور مشہور محدث نسائی نے بھی۔ (فتح الباری ج ۷ صفحہ ۸۳)

لیا جانے لگا ہے۔) وہ مقدس اور برگزیدہ انسان جس کے نام نامی واسم گرامی کے ساتھ معاویہ کا نام لینا بھی سوئے ادب ہے۔ آج پاکستان میں اس معاویہ کو علیؑ پر افضل ثابت کرنے کے لیے کتابیں لکھی جارہی ہیں۔

علمائے اہلِ سنّت گردنیں ٹیڑھی کرکے مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آخر تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ اصحابِ رسولؐ کی دشمنی پر اتر آئے ہو۔ میں ان سے ایک ہی بات کہتا ہوں کہ تم نے کبھی میری طرح قرآن وحدیث اور تاریخ وسیر کا بے لاگ مطالعہ کیا ہوتا اور تمہارے سروں پر مغز ہوتا اور علم کے ساتھ ساتھ تم عقل کا بدرقہ بھی استعمال کرتے کہ بزرگوں نے کہا ہے "یک من علم را دہ من عقل باید" تو تم بھی وہی راہ اپناتے جس پر چلنا میں نے پسند کیا ہے اور دنیا جہاں کی ناراضگی مول لی ہے۔

میرا جرم صرف اتنا ہے کہ میں صرف رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معیارِ حق اور مرکزِ عقیدت مانتا ہوں اور اسی کے حوالے سے شخصیتوں کو تولتا ہوں۔ میرے ہاں میزان صرف محبت خدا اور رسولؐ ہے لیکن تم نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صرف نظر کرکے بعض دوسری شخصیتوں کو معیار حق سمجھ رکھا ہے۔ تمہاری نظر اس منتہائے نظر تک نہیں پہونچتی جسے اسلام نے ہمارے لیے دین وایمان کا مدار و محور قرار دیا ہے ؎

بہ مصطفےٰ برساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

معیار حق محمد رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے اور پھر جس شخص کو حضورؐ نے اپنی محبتوں، چاہتوں اور شفقتوں سے نوازا ہو اس کی ذات معیارِ حق ہے اور تاریخ اسلام میں صرف ایک نام ملتا ہے جسے حضورؐ نے اپنے معیار حق قرار دیا اور وہ نام ہے امیر المؤمنین مولائے کائنات علی علیہ السلام کا جن کے بارے میں حضورؐ نے ارشاد

فرمایا تھا۔

"لا یحبك الا مومن، ولا یبغضك الّا منافق"

"علیؑ سے محبت وہی کرے گا جس کے دل میں ایمان کا نور ہوگا اور علیؑ سے دشمنی وہی کرے گا جو نفاق کا روگی ہوگا۔"

جن لوگوں نے علیؑ ابن ابی طالبؑ سے دشمنی مول لی لسان نبوت و وحی انہیں منافق قرار دے رہی ہے مگر نبی کا کلمہ پڑھنے والے انہیں واجب الاحترام کہہ رہے ہیں۔ مشہور سُنی عالم مولوی اشرف علی تھانوی نے جنھیں ان کے معتقدین "حکیم الامتہ" کہتے ہیں اپنے مواعظ میں لکھا ہے کہ اہل سنّت والجماعت وہی شخص ہو سکتا ہے جو دل سے معاویہؓ کا احترام کرتا ہو۔

سو شیعانِ علیؑ اگر معاویہ اور اس کے سرپرستوں اور اس کے نام لیواؤں کی مذمّت کرتے ہیں، علی سے محبت ہے تو رسول اللہ کی ذات کے سبب سے ہے کہ محبوب کا محبوب بھی محبوب ہوتا ہے اور معاویہ سے بغض و نفرت ہے تو اس بناء پر کہ محبوب کا دشمن کبھی دوست نہیں ہو سکتا ورنہ دعوائے محبت ایک فریب کے سوا کچھ نہیں۔

سیدنا علیؑ ابن ابی طالبؑ بالاتفاق رسول اللہ کی محبوب شخصیت ہی نہیں تھے خود اہلِ سنّت کے مطابق اپنے دور کے خلیفہ راشد بھی تھے۔ خلیفۂ راشد سے علانیہ بغاوت کرنے والا شخص بھی اگر لائق مدح و ستائش ہے تو ایسی خلافت راشدہ کی حیثیت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے۔

اگر خلافت راشدہ کے خلاف خروج و بغاوت کوئی جرم نہیں ہے تو جو لوگ ابوبکر و عمر و عثمان کی خلافت کو ناجائز سمجھتے ہیں اور اس کے خلاف اظہار نفرت کرتے ہیں وہ کیوں مستحق ملامت ہوں۔ ع ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

یہاں ایک اور بوالعجبی کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ جن بڑے بڑے صحابہ

نے حضرت علیؑ کے خلاف خروج کیا ان سب کا متفقہ موقف امیرالمومنینؑ کے بارے میں یہ تھا کہ قتل عثمان کے بارے میں امیرالمومنین کا ہاتھ ہے۔ ادھر ہمارے اہلسنت والجماعت حضرات کا موقف یہ ہے کہ قتل عثمان میں حضرت علی کا ہاتھ نہیں تھا لیکن طلحہ وزبیر اور عائشہ و معاویہ کا شمار بھی باغیوں میں نہیں ہوتا۔ اگر حضرت علیؑ قتلِ عثمان سے بری الذمہ تھے تو یہ سب لوگ ان کے خلاف صف آرا کیوں ہوئے۔ اور اگر حضرت علیؑ کا کوئی قصور نہیں تھا تو ان سے آمادۂ پیکار اور برسرِ جنگ صحابہ کو باغی کیوں نہ شمار کیا جائے جب حضرت علیؑ کے معاصر صحابہ کہہ رہے تھے کہ قتل عثمان کے ذمہ دار وہی ہیں تو آپ ان کی بات کو مانیئے کہ ان میں دو عشرہ مبشرہ کے افراد ہیں۔ اور ایک ام المومنین عائشہ ہیں آپ کس دلیل سے ان حضرات کی بات کو رد کرتے ہیں اور اگر آپ کے نزدیک ان کا موقف غلط تھا تو ان پر غدّاری کے الزام میں مقدمہ دائر کیجیئے اور انہیں صاف صاف باغی قرار دیجیئے۔ آخر آپ کس بنیاد پر حضرت علی کو قتلِ عثمان کا ذمہ دار قرار نہیں دیتے۔ جبکہ ان کے دور کے بعض نامور صحابہ ان کو اس قتل کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں آپ کے نزدیک نہ وہ صحابہ غلط کار ہیں نہ حضرت علی کا قصور[1]

---

[1] قاضی ابوبکر بن العربی کی رو شیعیت پر مشہور کتاب "العواصم من القواصم" کے حاشیہ نگار محب الدین خطیب نے لکھا ہے کہ:

"اہلِ سنت میں ایک بھی شخص ایسا نہیں ہے جس نے حضرت علیؑ پر قتل عثمان کی تہمت دھری، نہ حضرت علی کے زمانے میں ایسا کوئی شخص تھا نہ ہمارے زمانے میں ہے۔"

بجا فرمایا آپ نے مگر طلحہ، زبیر، عائشہ، عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہ، معاویہ اور دیگر تمام باغی صحابہ اہلِ سنت سے خارج ہیں۔ اگر حضرت علی قتل عثمان کی تہمت سے مبرّا تھے تو ان بزرگانِ دین نے دو ہولناک جنگیں ان کے خلاف کس بنیاد پر (باقی ص ۱۶۳ پر)

معاویہ اور اسلام

معاویہ بن ابی سفیان کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے کتنا تعلق تھا اس کے لیے سر دست صرف تین واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ کسی شخصیت کو پرکھنے اور اس کے معیار دینداری و شرافت کو جانچنے کے لیے صرف ایک واقعہ ہی کافی ہوتا ہے۔

(۱) پہلا واقعہ تو خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد ہمایوں کا ہے جب حضورؐ نے معاویہ کو تین بار بلوایا اور ہر بار اس نے جواب میں یہ کہلوایا کہ کھانا کھا رہا ہوں اس پر حضورؐ نے فرمایا: لا اشبع اللہ بطن معاویہ (اللہ کرے معاویہ کا پیٹ کبھی نہ بھرے۔ ترمذی۔ نسائی)

(۲) دوسرا واقعہ متعصب سنّی عالم ابن تیمیہ نے جو اصحابہ ظواہر کا امام سمجھا جاتا ہے اپنی کتاب "الصارم المسلول" میں لکھا ہے کہ معاویہ کے سامنے مشہور یہودی کعب بن اشرف کے قتل کا ذکر چھڑا اس پر معاویہ کے ایک

(باقی حاشیہ صـ۱۶۲) لڑیں؟ اور قرآن کی یہ آیت جو ان جنگوں کے جواز کے لیے بہ طور استشہاد پڑھی جاتی رہی اس کا یہ کون سا موقع و محل تھا۔ وہ آیت کریمہ یہ ہے:۔

ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لولیہ سلطانا فلا یُسرف فی القتل

(بنی اسرائیل پ۱۵) جو کوئی شخص مظلومانہ طور پر قتل کر دیا جائے تو اس کو ہم نے یہ اتھارٹی دی ہے کہ وہ اس کا بدلہ لے مگر قتل میں حد سے تجاوز نہ کرے"۔ یہی آیت پڑھ پڑھ کر تو لوگوں کو حضرت علیؑ کے خلاف جنگ پر ابھارا جاتا رہا ہے اور اب آپ کہتے ہیں کہ اہلسنت میں سے کوئی شخص حضرت علیؑ پر قتل عثمان کی ذمہ داری نہیں ڈالتا۔ یا ان جنگاوری صحابہ کے نام فہرست اہل سنت سے کاٹ دیجیے یا خود اہل سنّت کہلوانا چھوڑ دیے۔

عیسائی مصاحب بنیا آمین نصری نے کہا کہ یہ تو سراسر بدعہدی تھی اس پر محمد بن سلمہ انصاری سے نہ رہا گیا انہوں نے کہا معاویہ تمہارے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بدعہد ہونے کا بہتان باندھ رہا ہے اور تم خاموش ہو۔ خدا کی قسم آئندہ ہم دونوں کبھی ایک جگہ اکٹھے نہیں ہوں گے۔ اور مجھے جب بھی موقع ملا میں اس بدزبان شخص کو قتل کیئے بغیر دم نہیں لوں گا۔،، مگر معاویہ ٹس سے مس نہیں ہوا بلکہ بعد میں اس نے محمد بن سلمہ ہی کو قتل کروا دیا۔

(۳) تیسرا واقعہ کا راوی خود معاویہ کی ناک کا بال مغیرہ بن شعبہ ہے جسے سیدنا علیؑ سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ یہ وہی مغیرہ بن شعبہ ہے جو عمر ابن خطاب کے دورِ خلافت میں کوفہ کا گورنر تھا اور اپنے گورنری کے زمانے میں زنا کا مرتکب ہوا۔ تین گواہیاں اس کے خلاف پڑیں۔ چوتھا گواہ زیاد بن ابیہ حضرت عمر کے تیور دیکھ کر اپنی گواہی سے منحرف ہوگیا اور یوں مغیرہ بن شعبہ کی جان بچی۔ یہی وہ بدباطن شخص تھا جس نے اپنی گورنری بچانے کی خاطر از راہ تملق معاویہ کے سامنے یزید کی ولی عہدی کی تجویز رکھی اور یزید جیسے ملعون اور بدبخت انسان کو امت محمدیہ پر مسلط کر دیا۔ اسی مغیرہ بن شعبہ کا لڑکا مطرف بن مغیرہ کہتا ہے کہ میرا باپ ہر روز معاویہ کے ہاں جایا کرتا تھا اور اس سے راز و نیاز کی باتیں کر کے دیر سے گھر لوٹتا تھا۔ ایک روز وہ جب معاویہ کے ہاں سے واپس پلٹا تو میں نے دیکھا کہ میرا باپ بہت افسردہ خاطر ہے۔ اس نے اس روز کچھ کھانا بھی نہ کھایا۔ اس پر میں نے پوچھا۔ آپ آج کچھ پریشان نظر آرہے ہیں۔ کیا بات ہے جس کی وجہ سے آپ کی طبیعت اس درجہ مکدر ہے۔ اس پر مغیرہ بولا میں ایک ایسے شخص کے یہاں سے اٹھ کر آیا ہوں جو بہت بڑا کافر اور نہایت خبیث انسان ہے یعنی معاویہ بن ابی سفیان۔ اس پر میں نے واقعہ کی نوعیت دریافت کی۔ میرا باپ کہنے لگا۔

"میں نے معاویہ سے کہا تھا کہ اب جبکہ تم بوڑھے ہو چکے ہو تو بہتر یہی ہے کہ بنو ہاشم کے ساتھ نسبتاً بہتر سلوک کرو کہ اب تمھیں ان کی جانب سے کوئی خطرہ بھی نہیں رہا۔ یوں بھی صلہ رحمی کا تقاضا یہ ہے کہ اب بنو ہاشم سے انتقام لینے کا جذبہ دل سے نکال دو اس سے تمہارا نام نیک بھی باقی رہے گا اور تمہیں اسکا اجرو ثواب بھی ملے گا۔" یہ سن کر معاویہ بولا۔

"کہاں کا اجر و ثواب اور کیسی نیک نامی۔ قبیلہ بنو تیم کا ایک شخص حکمراں ہوا۔ یعنی ابوبکر۔ اس نے انصاف سے حکومت کی اور بہت کچھ کارہائے نمایاں انجام دیئے لیکن جب مرا تو اب اس کا کوئی نام لیوا باقی نہ رہا۔ ہاں کبھی کبھار کسی کے لب پر اس کا نام ضمناً آجاتا ہے اور بس یہی حال قبیلہ بنو عدی کے اس شخص کا ہوا جس نے دن رات ایک کر دیا اور دس برس تک داد حکومت دی۔ وہ بھی مرا تو اب اس کا کوئی نام لیوا باقی نہیں رہا الا یہ کہ کبھی کبھی بھولے سے کسی کی زبان پر اس کا نام آجاتا ہے اور (بس) "لیکن ابو کبشہ کا فرزند (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کا نام دن میں پانچ مرتبہ چیخ چیخ کر لیا جاتا ہے اور اشھد ان محمداً رسول اللہ کی آواز بلند ہوتی ہے۔ اس کے بعد اب کون سا عمل ہے جس کے باقی رہنے کی امید ہو اور کون سا تذکرہ ہے جو قائم رہ سکے گا بجز اس کے کہ آج مرے کل دوسرا دن۔"

(اموفقیات لزبیر ابن بکار قاضی مکہ دھو مشہور فی المحدثین)

یہاں طرہ اللباب، بس کی گانٹھ کا تھوڑا سا تذکرہ ہو جائے جو آج معاویہ کو اخبث (سب سے زیادہ خبیث) اور اکفر (سب سے بڑا کافر) کہہ رہا ہے۔ معاویہ کی ساری بدعنوانیوں، خباثتوں، کفر طرازیوں اور شر انگیزیوں میں اس کا سب سے بڑا ممد و معاون یہی شخص رہا ہے۔ اسی بدنہاد شخص نے یزید کو معاویہ کا جانشین بنانے کی طرح ڈالی، اسی نے معاویہ کی خوشنودی مزاج کی خاطر شیعانِ علیؑ پر جہاں تہار

عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ مغیرہ بن شعبہ، عمرو بن العاص تاریخ اسلامی کی وہ دو بدکردار اور ملعون شخصیتیں ہیں جنہوں نے امیرالمومنین سیدنا علی علیہ السلام کے خلاف دسیسہ کاریوں میں ہر قدم پر ساتھ دیا اور یوں ایک ایسے گھناؤنے جرم کے مرتکب ہوئے جو ان دونوں کو معاویہ کی خباثت نفس اور اس کے کفر باطن میں برابر کا شریک ٹھہرانے کے لیے کافی ہیں۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ امیرالمومنین سیدنا علیؑ ابن ابی طالبؑ کی مخالفت میں جتنے لوگ پیش تھے وہ سب خلیفۂ دوم کے پروردہ اور ساختہ و پرداختہ لوگ تھے۔

استبداد

اٹلی کے ایک مشہور مدبر نے استبداد کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا ترجمہ اردو میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے کیا ہے۔ بہت عرصہ گزرا جب یہ کتاب میری نظر سے گزری تھی۔ اس کتاب میں بڑی وضاحت سے یہ بات لکھی گئی ہے کہ مستبد حکمراں ہمیشہ رذیلوں ظلم پیشہ لوگوں ستمگاروں اور کمینے افراد کو چن چن کر رعایا پر مسلط کرتا ہے اور اس طرح اپنے اقتدار کو استحکام بخشنے کے لیے لوگوں پر مسلسل دہشت طاری کیے رہتا ہے۔ لوگوں کی عزت و آبرو سے کھیلنا اس کا دل پسند مشغلہ ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کام میں اس کے مددگار وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو خود آبرو باختہ ہوں تاکہ شرفا کی بے آبروئی کرنے میں انہیں کوئی جھجک محسوس نہ ہو۔

خلیفۂ اوّل کی نظرِ انتخاب نے جب خلیفہ دوم کو اپنی جانشینی کے لیے چنا تو ان کے پیش نظر بھی موخرالذکر کے اخلاقی فضائل و محاسن نہیں تھے بلکہ وہ رذائل تھے جنہیں استبداد پسند کرتا ہے۔ ان کی واحد خوبی یہ تھی کہ وہ ایک سنگ دل شخص تھے اور انہوں نے ابوبکر کو خلیفہ بنانے کے سلسلے میں غنڈہ گردی کے وہ جوہر دکھائے تھے کہ کسی کو ان کے سامنے یارائے دم زدن نہ رہا اور شریف لوگ سہم کر رہ گئے۔ اس معاملے میں

انھیں در پردہ بنی امیہ کی حمایت حاصل تھی۔ غنڈہ کبھی خود بہادر نہیں ہوتا، وہ انتہائی بزدل ہوتا ہے، البتہ وہ جس کھونٹے پر چلتا ہے اور جس شہ پر بہادری کے جوہر دکھاتا ہے اس کا مضبوط ہونا شرط ہے۔

حضرت عمر کی خلافت کے لیے نامزدگی جہاں ابوبکر کی جانب سے اظہار تشکر کی ایک صورت تھی وہاں اس امر کا اہتمام بھی ان کے پیش نظر تھا کہ استبداد کی جس رسم کو انہوں نے قائم کیا ہے اس کا سلسلہ ان کے بعد بھی جاری رہے۔

اسلام میں جو لوگ سابق العہد تھے اور پورے معاشرے میں اپنی امتیازی خصوصیات کی بناء پر منفرد و ممتاز تھے وہ سب نامور شخصیتیں ابوبکر کے دور خلافت میں ان کی نظروں کے سامنے تھیں لیکن انھوں نے اس کے مقابلے میں ایک ایسے شخص کو جانشین مقرر کیا جو کچھ بھی تھا لیکن سبقت فی الاسلام کے شرف سے یقیناً محروم تھا، خاندانی اعتبار، اسلامی خدمات کے لحاظ سے، ظاہری کی رو سے، علم و فضل کے زاویے سے، شجاعت و جوانمردی کے نقطۂ نگاہ سے، غرضیکہ کسی بھی صورت سے عمر ابن خطابؓ کا نام کسی بھی درجہ میں نمایاں نہیں تھا۔

پھر جب اپنی سابقہ کارگزاریوں کی بناء پر عمر ابن خطاب مسند خلافت پر براجمان ہوئے تو انہوں نے بھی ایسے ایسے نایاب گوہر اپنی جھولی میں بھرے اور عوام پر لٹائے جن کی اصل و نسل اور جن کا حسب و نسب مشکوک تھا، اسلام سے جن کی نسبت کی کیفیت ڈانواں ڈول تھی، جو انتہائی گھٹیا ذہنیت کے حامل تھے، جن کی اخلاقی اور روحانی حالت قابلِ اعتماد نہ تھی اور جنھیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس سے خاندانی پرخاش تھی۔ ابوعبیدہ ابن جراح، عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہ، معاویہ بن ابی سفیان وہ چند نام ہیں جنھیں خلیفۂ دوم نے اہم عہدوں پر فائز کیا۔ ان میں سے ہر ایک کا دامن مختلف بدعنوانیوں سے داغدار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ابوبکر

کے نامۂ اعمال میں کوئی برائی بجز اس کے نہ ہوتی کہ انہوں نے عمر ابن خطاب جیسے جابر و ظالم شخص کو امت پر مسلط کیا اور اپنے ہم چشموں کی رائے کی بھی پروا نہ کی تو ابوبکر کی اسلام دشمنی کے لیے یہی ایک بات کافی تھی۔

یہ ابوبکر تھے جنہوں نے صدر اسلام یعنی اسلام کے بالکل ابتدائی عہد میں ایسی روایات قائم کیں جن سے قوموں کا مزاج تشکیل پاتا ہے، مسلمان قوم کا مزاج سستی جذباتیت، احسان فراموشی، بے ادبی، گستاخی، غنڈہ گردی اور محسن کشی کا مزاج رہا ہے۔

میں نے جب صلاح الدین ایوبی کے حالات میں پڑھا کہ اس نے اپنے محسن و مربی نور الدین زنگی کو قتل کر کے خود اس کی جگہ تختِ اقتدار پر متمکن ہونے کی کوشش کی تھی حالانکہ وہ نور الدین کے ایک معمولی قلعہ دار کا لڑکا تھا جسے نور الدین زنگی نے اپنے اعتماد کا شرف بخشا تھا تو مجھے خیال آیا کہ ابوبکر و عمر اپنے مقتداء و پیشوا کے خاندان سے بدسلوکی کی جرأت کر سکتے ہیں تو اس قوم کا کوئی دوسرا فرد اس راہ پر گامزن ہو تو اس میں تعجب کیا ہے۔

قائد اعظم جناح کے ساتھ لیاقت علی خاں کی ان کی زندگی کے آخری لمحوں میں بدسلوکی و بے اعتنائی [1]، انڈونیشیا کے بطل حریت احمد عبدالرحیم سوئیکارنو کی اس کے

---

[1] اب یہ بات دستاویزی شہادتوں کے ساتھ ثابت ہو گئی ہے کہ قائد اعظم محمد علی جناح کے مرض الموت میں جب انہیں ایک تفریحی مقام زیارت (بلوچستان) سے کراچی لایا گیا تو ہوائی اڈے پر ان کے استقبال کے لیے کابینہ کا کوئی وزیر موجود نہیں تھا۔ ان کے لیے جو ایمبولنس گاڑی بھیجی گئی وہ ماری پور سے آتے ہوئے راستے میں خراب ہو گئی اور دو گھنٹے تک ایک ویران سڑک پر رُکی رہی۔ یہ اس جاں بلب مریض کے ساتھ سلوک کیا جا رہا ہے جو ملک کا گورنر جنرل ہی نہیں اس ملک کا بانی اور موسس بھی ہے۔ دو گھنٹہ تک (بقیہ حاشیہ صـ ۱۶۹ پر)

ایک فوجی جرنیل سوہارتو کے ہاتھوں ذلّت وخواری، بنگلہ دیش کے باباپ نہیں کیا؟
شیخ مجیب الرحمٰن کا خود ان کی قوم کے چند سرپھرے جوانوں کے ہاتھوں عبرتناک انجام نہیں کیا
یہ سب انہی روایات کی ایک جھلک ہے۔ ایک

واقعہ یہ ہے کہ مسلمان قوم کے اخلاقی انحطاط وزوال اور اس کی شورہ پشت سے دبد قماشی کی تمام تر ذمہ داری انہی جانشینانِ رسول پر عائد ہوتی ہے، جنہوں نے اقتدار کی چھینا جھپٹی کے وقت تمام اخلاقی حدود کو پامال کیا اور اپنے جارحانہ طرز عمل سے دنیا کو یہ تاثر دیا کہ اسلام تہذیب وشرافت کا مذہب نہیں غنڈہ گردی اور "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا مذہب ہے۔

کہہ مکرنی

آج کے دور میں کامیاب سیاست داں وہ ہے جس نے اپنی سیاست کی بنیاد جھوٹ اور فریب پر رکھی ہو، جو پینترے بدلنے میں ماہر ہو اور جسے اپنی کہی ہوئی بات سے پھرنے میں کوئی عار محسوس نہ ہو۔ بدعہدی جھوٹ، فریب کاری اور وعدہ خلافی میں

(بقیہ حاشیہ صــــ) ایک جاں بلب مریض کا بند گاڑی میں پڑا رہنا جس میں تازہ ہوا کا گزر نہ ہو کس قدر ہلاک ثابت ہوسکتا ہے اور یہی ہوا جب گاڑی گورنمنٹ ہاؤس پہونچی تو یہ مریض دم توڑ چکا تھا۔

دراصل لیاقت علی جانتے تھے کہ جب تک بابائے قوم محمد علی جناح بقید حیات ہیں ان کے ہم مقتدر ہونے کا خواب تشنہ تعبیر رہے گا اور وہ جلد سے جلد اس "پیر تسمہ پا" سے چھٹکارا پانا چاہتے تھے۔ سابق وزیر خارجہ اور موجودہ وزیر قانون شریف الدین پیرزادہ نے اپنی تازہ تصنیف میں اس سنگدل رویہ کا پردہ چاک کیا ہے جو لیاقت علی خاں نے اپنی قوم کے محسن سے روا رکھا پھر صرف ابوبکر وعمر ہی کو کیوں موردِ الزام قرار دیا جائے۔

میں بھی طاق ہو۔

اس باب میں خلافت راشدہ کے تینوں بزرگوں کا ریکارڈ شاندار ہے۔ سیاست میں ان کے پینترے اور ان کی "کہہ مکرنی" خاص دلچسپی کی چیز ہیں، سیاست علی منہاج النبوہ میں تو اس کی سرے سے گنجائش ہی نہیں رکھی گئی۔ البتہ دنیاداری کی سیاست میں یہ "ناشدنی" اکثر و بیشتر ہوتی ہے۔

جب فدک کا معاملہ خلیفہ اوّل کے روبرو پیش ہوا تو انہوں نے سیّدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کے دعوائے فدک کے ثبوت میں دو گواہ طلب کئے۔ سیدہ فاطمہؑ نے حضرت علیؑ اور حضرت ام ایمنؓ کو گواہ کے طور پر پیش کیا مگر خلیفہ صاحب نے اسے نامکمل گواہی قرار دے کر مسترد کر دیا کیونکہ دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی شرعی گواہی ہے جبکہ یہاں حضرت ام ایمن صرف ایک عورت تھیں۔ اس واقعہ سے بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ خلیفہ صاحب احکام شریعت کی پابندی کا بڑا خیال رکھتے تھے اور اس معاملہ میں کسی رو رعایت کے قائل نہ تھے لیکن ایک دوسرے شخص کے معاملہ میں ان کا طرزِ عمل اس سے بالکل مختلف ہے۔ مشہور صحابی جابر ابن عبداللہ نے یہ دعویٰ پیش کیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بحرین کے مال کے بارے میں ان سے وعدہ فرمایا تھا کہ اس میں سے اتنا حصہ انھیں دیا جائے گا۔ اس پر بغیر کسی شہادت کے اس صحابی کی بات تسلیم کر لی اور اسے اس کا مطلوبہ مال مل گیا۔ یہ واقعہ بخاری میں مذکور ہے اور ابنِ حجر عسقلانی نے فتح الباری شرح بخاری میں اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے حسب ذیل نوٹ دیا ہے۔ "هذا الخبر فيه دلالة على قبول الخبر العدل من الصحابة ولو جر ذلك نفعا لنفسه لان ابا بكر لم يلتمس من جابر شاهدا على صحة دعواه" اس حدیث سے یہ وضاحت ہوئی ہے کہ کسی عادل صحابی کے دعوی کو خواہ وہ اس کے اپنے مفاد سے متعلق ہو یا بلا

دلیل قبول کیا جا سکتا ہے کیونکہ ابوبکر نے جابر سے ثبوت دعوی کیلئے کوئی گواہ طلب نہیں کیا۔" اسے کہتے ہیں "یک بام و دو ہوا"، جابر ابن عبداللہ سے کوئی گواہ طلب نہیں کیا جانا جبکہ سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا سے حضرت علیؑ اور حضرت ام ایمن کے علاوہ بھی ایک اور گواہ کا تقاضا ہو رہا ہے۔ کیا سیدہ فاطمہؑ تقویٰ و دیانت میں جابر بن عبداللہ سے بھی گئی گزری تھیں کہ ان سے گواہ پر گواہ طلب کئے جا رہے ہیں۔

سیدہ فاطمہؑ کے دعویٰ کی تردید میں بر محل اور بر موقع حضرت ابوبکر نے جو حدیث وضع کی اور اسے حضورؐ کی طرف منسوب کیا یہ نکتہ بعد الوقوع والی بات ہے۔ اگر وہ حدیث ان صاحب کے ذہن میں پہلے سے تھی تو گواہ طلب کرنے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی صاف صاف انکار کر دیا جاتا کہ شریعت میں وراثت پیغمبرؐ کی کوئی گنجائش نہیں ہے نامکمل گواہی کے بعد فوراً ایک حدیث گھڑی گئی تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ کیا خود ابوبکر قانون سے بالاتر چیز تھے کہ وہ اس حدیث کی صحت کے بارے میں ادھوری گواہی بھی پیش نہ کر سکے۔ محدثین نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ حضورؐ کی میراث کے بارے میں ابوبکر کی اس خود ساختہ روایت کا کسی دوسرے صحابی کو علم تک نہیں تھا۔ (سیوطی تاریخ الخلفاء)

کیا مسند خلافت پر بیٹھنے سے خلیفہ اسلام کے قانون شہادت سے مستثنیٰ ہو جاتا ہے اور کیا وہ قانون سے بالاتر ہے؟ جب انصار کو ان کے دعوائے خلافت سے باز رکھنے کا مرحلہ پیش آیا تو اس موقع پر خلیفۂ دوم نے الائمۃ من قریش (لیڈر شپ قریش کے ہاتھ میں ہی چاہیئے) کی دلیل پیش کر کے ان کے دعویٰ کو رد کر دیا اور جب اپنے بعد کسی دوسرے کی نامزدگی کا موقع آیا تو ارشاد ہوا۔ "آج اگر سالم حذیفہ کا غلام زندہ ہوتا تو میں یہ خلافت اس کے سپرد کر دیتا۔"

حالانکہ سالم قریش میں سے نہیں تھے۔

اسی طرح خلیفۂ دوم نے جن چھ آدمیوں کو خلافت کے لیے نامزد کیا ان میں سے

کسی ایک کے سر پر خلافت کا روار کھ دیا جائے تو ان چھ کے بارے میں یہ اعلان بھی کیا کہ "یہ چھ وہ افراد ہیں کہ جب حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا سے رخصت ہوئے تو وہ ان سے خوش تھے"۔

لیکن فرداً فرداً جب ان کو بلا کر ان پر جرح کی تو یہ تاثر دیا کہ ان سے زیادہ رسولؐ اللہ کی نظر میں بُرا اور کوئی تھا ہی نہیں۔ خاص طور پر طلحہ اور زبیر سے ان کا مکالمہ تاریخ کے اوراق پر محفوظ ہے۔ حضرت عمر نے حضرت طلحہ سے کہا تھا:

"تم وہی تو ہو جن سے حضورؐ دنیا سے ناراض رخصت ہوئے کیوں کہ تم نے حضور کی بیویوں کے بارے میں ایک ایسا جملہ کہہ دیا تھا جو حضورؐ کو سخت ناگوار گزرا تھا۔"

واقعہ یہ ہوا کہ جب ازواج پیغمبرؐ کو گھروں میں بیٹھے رہنے کا حکم دیا گیا تو طلحہ کی زبان سے یہ بات نکل گئی تھی کہ:

"آج ان کو گھروں میں بیٹھنے کا حکم دیا جا رہا ہے کل جب حضورؐ دنیا میں نہیں ہوں گے تو ان عورتوں سے ہمیں نکاح کرنا ہوگا۔"

طلحہ کے اس گستاخانہ فقرہ کو سُن کر حضورؐ برہم ہوئے اور طلحہ سے ناراض ہو گئے اور طلحہ کی اس ناروا جسارت کا جب عمر ابن خطاب کو پہلے سے علم تھا تو ان کو اس چھ رکنی کمیٹی میں کیوں شامل کیا گیا جس کے ہر فرد سے حضورؐ خوش اس دنیا سے تشریف لے گئے تھے اور اگر واقعی طلحہ نے یہ بات کہی تھی تو وہ عشرہ بشرہ[1] کے زمرہ میں کیسے محسوب ہو گئے۔ جس شخص کی گستاخی سے پیغمبرؐ کبیدہ خاطر ہوا ہو۔

---

[1] عشرہ بشرہ سے اہلِ سنّت کے عقیدے کے مطابق وہ دس صحابی مراد ہیں جنہیں دنیا ہی میں جنّت کا ٹکٹ مل گیا ہے۔ یہ ہیں۔ (۱) ابو بکر (۲) عمر (۳) عثمان (۴) علیؑ (۵) طلحہ (۶) زبیر (۷) سعد بن ابی وقاص (۸) سعید بن زید (۹) ابو عبیدہ ابن جراح (۱۰) عبدالرحمٰن ابن عوف

اس کے "جلنتی"، ہونے کا کیا امکان باقی رہ جاتا ہے۔

اسی طرح زبیر بن العوام سے اس موقع پر جو گفتگو ہوئی وہ دو جنتیوں کی خوش کلامی کا نادر شاہکار ہے۔ خلیفہ دوم نے زبیر سے کہا:

"تم، نہایت بیہودہ اور مغلوب الغضب شخص ہو ایک دن شیطان ہوتے ہو اور ایک دن انسان، کبھی کافر ہوتے ہو کبھی مسلمان"۔

گھڑی میں تولہ، گھڑی میں ماشہ،، قسم کے شخص سے حضورؐ کا خوش ہونا چہ معنی دار؟ جس شخص کے کفر و ایمان کی حالت ہر روز تغیر پذیر ہو وہ "عشرہ مبشرہ،، میں بھی شامل ہے۔ اور عمر ابن خطاب کی کہہ مکرنیوں کا نشانہ بھی۔

فقرہ کسنے والا بھی جلنتی اور گالیاں کھا کے بد مزہ ہونے والے بھی جلنتی، وہ بھی عشرہ مبشرہ میں شامل اور یہ بھی اور جنت ہے کہ دونوں کے قدموں میں لوٹ رہی ہے۔

دس جنتی یا آٹھ جہنمی

اور یہ عشرہ مبشرہ والی کہانی بھی ان بہت سی خود ساختہ روایتوں میں سے ایک ہے جس کا مقصد بعض جرائم پیشہ لوگوں کو قانونی تحفظ دینا ہے اور ایسے لوگوں کو تنقید سے بچا کر نکالنا ہے جن کا دامن بد عنوانیوں اور بد اعمالیوں سے تار تار ہے۔

عشرۂ مبشرہ میں حضرت علیؑ کی شمولیت تو محض اس داستان کو معتبر قرار دینے کی ایک کوشش ہے کہ اس فرضی داستان کے مصنف بخوبی جانتے تھے کہ اگر اس داستان سرائی میں سیدنا علیؑ کا نام شامل نہیں کیا گیا تو ساری کہانی ہی دفتر بے معنی ہو کر رہ جائیگی۔ کون نہیں جانتا کہ سیدنا علیؑ کی شخصیت گرامی کو چھوڑ کر باقی حضرات نے اسلام کے ساتھ کیسی کیسی خوش فعلیاں روا رکھیں۔ ابو بکر نے جس طرح خلافت پر غاصبانہ قبضہ کیا اس کے بعد ان کے جنت میں داخلے کا کیا امکان رہ جاتا ہے۔ عمر ابن خطاب نے جس طرح

اپنی خلافت کی راہ ہموار کی اور اپنے پیش رو کے عہد میں اور خود اپنے دورِ اقتدار میں جو دھاندلیاں فرمائیں اس کے بعد جنّت ان کے لیے کیونکر چشم براہ ہوسکتی ہے۔ طلحہ و زبیر نے حضرت عائشہ کے ساتھ مل کر عذر عہد کا جو بھونڈا مظاہرہ کیا اس کے بعد جنّت کی حوریں ان کے استقبال کے لیے کیسے آگے بڑھ سکتی ہیں۔ عثمان ابن عفان نے خویش پروری، اقربانوازی اور اپنے قبیلہ بنوامیہ کی سرپرستی کا جو دھندا کیا اس کے بعد جنّت کے دروازے ان کے لیے کیسے وا ہوسکتے ہیں۔ عبدالرحمٰن ابن عوف خود اس من گھڑت داستان کے راویوں میں سے ایک ہیں انھوں نے اپنے قریبی رشتہ دار عثمان بن عفان کو خلیفہ بنوانے کے لیے جو دسیسہ کاری فرمائی اس کے بعد جنّت میں جانے کا ان کا کیا استحقاق رہ جاتا ہے۔

یہاں ایک لطیفے کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس فرضی داستان کے راوی بھی عبدالرحمٰن بن عوف بنفس نفیس خود ہی بس ہیں۔ ان سے چوک ہوگئی۔ وہ خود کروڑپتی سرمایہ دار تھے چاہتے تو بڑی آسانی سے اس مقصد کے لیے ابوہریرہ یا اسی قبیل کے کرایہ کے کسی اور راوی سے یہ کام لے سکتے ہیں لیکن "جنتی" بننے کی خوشی میں "اپنے منہ میاں مٹھو" بننے کی غلطی کر بیٹھے اور یوں عشرۂ مبشرہ کی ساری روایات ہی کو بے وقعت بنا گئے۔

میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ دینی اقدار کے اس دور انحطاط میں احترام صحابہ کی یہ مہم جو اس زوروں پر چلائی جارہی ہے اور جگہ جگہ نعرے لکھے گئے ہیں کہ

حق ہیں، حق ہیں، صحابہ معیار حق ہیں

تو اس شوراشوری کا باعث کیا ہے۔ عقل و خرد سے بے بہرہ لوگ پہلے بھی رہے ہیں مگر ان کے زمانے میں صحابہ کی فضیلت و عظمت کے وہ چرچے کبھی نہیں رہے جو اس دورِ زوال میں مسلمانوں کے اندر کیے جارہے ہیں۔ گو ہمارے محدثین و مفسرین نے

بڑے اہتمام اور بڑی پلاننگ کے ساتھ صحابہ کی شخصیتوں کو فرضی واقعات اور موضوع حدیثوں کے ذریعے چمکانے اور ابھارنے کی خاصی کوشش کی ہے اور بے اثر شخصیتوں کو با اثر ثابت کرنے، حقیر لوگوں کو باعظمت بنانے اور نفاق پیشہ افراد کو ایمان کی بلند چوٹی پر پہونچانے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا ہے اور یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا اور جھوٹے پروپیگنڈے کے بل پر صحابہ کی عظمت کا نقش دلوں پر ثبت کرنے میں انہوں نے کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہیں کیا اور اسی جھوٹ اور فریب کاری کا نتیجہ ہے کہ گروہ صحابہ کا بدباطن سے بدباطن اور پرلے درجے کا بدقماش شخص بھی مسلمانوں کے نزدیک مقدس و محترم قرار پایا اگرچہ ایسے لوگوں کی خباثتوں کے تذکرے بھی انہی اوراق میں موجود ہیں جن میں ان کے مناقب بیان کیے گئے ہیں۔

لیکن جو پروپیگنڈا مہم ان دنوں فضائل صحابہ کے بارے میں چلائی جا رہی ہے اس کا اصل محرک یہ جذبہ نہیں کہ ہمارے ان پیشہ ور ملاؤں کے نزدیک واقعی صحابہ معیار حق ہیں یا وہ غلطیوں سے مبرّا ہیں یا انہیں عصمت انبیاء کا سا تحفظ حاصل ہے بلکہ اس ساری ہنگامہ آرائی کا اصل سبب کچھ اور ہے۔ بقول اقبال ؂

بہت باریک ہیں واعظ کی چالیں — لرز اٹھتا ہے آواز اذاں سے

اور وہ سبب یہ ہے کہ اگر کہیں پناہ ملی ہے اور خباثت کو اگر کسی جگہ سند جواز مہیا ہوئی ہے اور ہر بدعملی کو اگر کہیں دین کا روپ دیا گیا ہے تو وہ صرف اور صرف صحابہ کے حوالے سے۔

اگر بات نظام سرمایہ داری کی ہو تو ظاہر ہے کہ اس کا جواز تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ سے مل سکتا ہے۔ نہ آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی پاکیزہ زندگوں سے البتہ وہ کروڑ پتی سرمایہ دار صحابہ ہیں جو اس ملعون نظام کے لیے وجہ جواز بن سکتے ہیں جن کی سرمایہ دارانہ روش نے اسلام کے مقدس مشن کو جادۂ مستقیم سے منحرف کر

دیا اس لیے نظام سرمایہ داری کے تحفظ کیلئے صحابہ کا نام لیا جا رہا ہے۔

اگر علتہ مشائخ اور علت ابنہ کے رسیا ہمارے علمائے کرام کی اکثریت کو اپنی خفت اور رسوائی کے ازالہ کے لیے کوئی سہارا مل سکتا ہے تو وہ بھی انہی صحابہ کے ذریعے جو اس مرض میں مبتلا تھے۔ ان میں حکم بن العاص بھی ہے اور کچھ اور بھی۔ ع

ان میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

اگر نسب میں تبدیلی کا معاملہ ہو تو معاویہ نے زیاد ابن ابیہ جیسے حرامی بچے کا نسب تبدیل کر کے اس فعل بد کے لیے بھی سند جواز پیدا کر دی۔ نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے "بنو اللقیط" ٹائپ کے لوگوں نے اپنے نسب تبدیل کیے اور اپنا شجرہ نسب بدل کر رکھ دیا۔

شیخ عبدالقادر جیلانی عجمی النسل تھے مگر انہیں سادات بنو ہاشم کے گھرانے میں شامل کر لیا گیا۔ اب وہ سکہ بند حسنی حسینی سید ہیں حالانکہ انساب کی تمام کتابیں اس پر متفق ہیں کہ وہ اصلاً عجمی تھے۔ دیکھئے حوالہ کے لیے عمدۃ المطالب فی انساب آلِ ابی طالب لاحمد بن علی بن الحسین ص ۱۱۳ اور شجرۃ الاولیاء، لاحمد بن محمد النسابہ۔ اور یہ تو دور کی بات ہے۔ دیکھتی آنکھوں شاہی مسجد لاہور کا موجودہ خطیب عبدالقادر آزاد جو میراثی قوم سے تعلق رکھتا تھا سید بن گیا اور ریڈیو، اخبارات، ٹیلی ویژن اور دیگر ذرائع ابلاغ کی رو سے مستند سید ٹھہرا۔

تحفظ حقوق اہل سنّت پاکستان میں شیعوں کے خلاف ایک تنظیم ہے جسے مفتی محمود نے قائم کیا ہے اس کا سیکریٹری جنرل عبدالمجید ندیم ڈیرہ غازی خاں کی کھٹک برادری سے تعلق رکھتا ہے جو چمڑا رنگنے (دباغت) کا کام کرتی ہے۔ مگر ادھر لیڈری چمکی ادھر کھٹ سے سید ہونے کا اعلان کر دیا حالانکہ اس کے گاؤں برادری اور علاقے کے لوگ سب اس کی حقیقت سے واقف ہیں ؎ غلہ چوں ارزاں شود امسال سیدی شوم

دینی مدارس کے مہتمم حضرات اگر مال وغیرہ پر تصرف بیجا کریں اور قومی دولت کو شیر مادر سمجھ کر چٹ کر جائیں تو اس بد معاملگی اور بد دیانتی کا سوتا بھی صحابہ ہی کی ہوسِ زر سے پھوٹتا ہے۔ عثمان بن عفان اور معاویہ بن ابی سفیان اور ان کے جانشینوں نے بیت المال میں جو غبن، خیانت مجرمانہ اور بے ایمانی کا دھندا کیا اس کے پیش نظر صحابہ کے ان گماشتوں کو کون روک سکتا ہے کہ وہ چندے کی رقوم کو باپ دادا کی کمائی نہ سمجھیں۔ کتنے ہی دینی مدارس ہیں جو خالصتہً تجارتی بنیادوں پر اور کمرشیل انداز میں قائم کئے گئے اور اب ان کے مہتمم حضرات قوم کے اس سرمائے پر دادِ عیش دے رہے ہیں۔

ہمارے ایک ملاقاتی مجاہد الحسینی ہیں۔ انہوں نے "مدرسہ سیرۃ النبی" کا بورڈ ایک عمارت پر نصب کیا اور حضورؐ کے مقدس نام کو استعمال کرتے ہوئے اس فرضی اور برائے نام مدرسہ کے ذریعے اپنے لیے آذوقہ، عیش فراہم کیا اور کر رہے ہیں۔

راولپنڈی کے مولوی غلام خاں نے اپنے بعد وارثوں کے لیے بہت بڑی جائیداد چھوڑی۔ ظاہر ہے کہ یہ سب مدرسہ تعلیم القرآن کے نام کی کمائی تھی جو ان کی اولاد کے کام آئی اور آتی رہے گی۔

جامعہ اشرفیہ کے بانی مفتی محمد حسن امرتسری نے اس ادارے کے قیام سے اپنی اولاد کے لیے جو وسیع سرمایہ کاری کی اس سے کون ہے جو واقف نہ ہوگا۔ مولوی احمد علی لاہوری نے اپنے دونوں بیٹوں عبید اللہ انور اور حمید اللہ میں مساجد و مدارس کی جو بندر بانٹ کی وہ بھی سب پر عیاں ہے۔ مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے بانی و مہتمم نے جس طرح مدرسہ کے ذریعے دولت کمائی اور قوم کا روپیہ کپڑے کے ذاتی کاروبار میں استعمال کیا وہ بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ اس مدرسے کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس مفتی محمود نے تین سو روپے کی ملازمت کے باوجود جو ٹھاٹھ جمایا بجائے خود مدح صحابہ کیلئے بہت بڑے محرکات ہیں۔

اس موضوع پر راقم الحروف نے مستقلاً ایک کتاب "روپ بہروپ" کے نام سے علیحدہ ترتیب دی ہے اور اس میں بلا استثناء ان تمام علماء کے خواہ سُنی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہوں یا شیعہ فرقے سے، تفصیلی ذکر کیا ہے جنھوں نے قومی سرمایہ کا استحصال کیا اور اس سے اپنی بساطِ عیش سجائی۔

دارالعلوم جامعہ نعیمیہ کے مفتی محمد حسین نعیمی کے ناجائز مراسم ایک بھنگن کے ساتھ پروان چڑھ سکتے ہیں تو کیا مشہور صحابی رسول مغیرہ بن شعبہ نے ایک ہزار عورتوں سے زنا نہیں کیا۔ اس حوالے سے مفتی صاحب موصوف کو سندِ جواز نہیں بخشی جاسکتی۔

جمعیۃ اتحاد العلماء کے سیکرٹری جنرل اور علماء اکیڈیمی لاہور کے رئیس اجامعہ گلزار احمد مظاہری اگر صرافوں کے لونڈے عظیم کے ساتھ ناجائز تعلقات استوار کر سکتا ہے تو کیا اسلامی تاریخ میں افلح نامی نوجوان کا قصہ مشہور و مذکور نہیں ہے جو ایک مشہور صحابی کے مصرف میں تھا۔

سو یہ لوگ بھی سچے ہیں کہ اگر یہ صحابہ کا دامن چھوڑ دیں یا صحابہ کی ہوا باندھنا ترک کر دیں تو مسلمان قوم کو کیا منہ دکھائیں۔ ان کی سب سے بڑی پناہ گاہ اسی قبیل کے صحابہ ہیں کہ وہاں سے ہر جرم اور ہر غلط کاری اور ہر مکر و فریب کا اثبات ہو سکتا ہے۔ اگر بھٹو کابینہ کے ایک وزیر مولانا کوثر نیازی جنھیں لوگ ازراہ بے تکلفی "مولانا وسکی" کہتے ہیں شغل بادہ نوشی سے ریگستان تقویٰ کو گل و گلزار بناتے ہیں تو کیا آپ نے کتبِ حدیث میں یہ روایتیں مطالعہ نہیں کیں کہ حضرت عمر ایسی تند و تیز شراب کے نشہ کے عادی تھے کہ عام آدمی پی لے تو لڑھک جائے۔ دیوبندی مکتبِ فکر کے بہت بڑے عالم مولانا حسین علی واں بچھروی نے اپنی مشہور کتاب "تحریرات الحدیث" میں "شرب الخمر (النبیذ)" کے عنوان کے تحت یہ حدیث بھی تحریر کی ہے کہ "عن عمر انہ کان لیشرب النبیذ الذی اذا شربہ رجل آخر ذھب عقلہ

(تحریرات الحدیث علی الرسول محقق صفحہ ۱۷۳-۷۴ مصنفہ مولوی حسین علی واں بھچراں ضلع میانوالی۔ مطبوعہ پرنٹنگ پریس بوہڑ دروازہ ملتان بہ اہتمام محبوب احمد اویس ۹؍ شعبان ۱۳۹۲ھ مطابق ۹؍ اگست ۱۹۷۲ء)

خلیفۂ دوم کی شراب نوشی کا تذکرہ تقریباً تمام کتب حدیث میں دستیاب ہے۔ جب ابولولوئے فیروز نے اپنے جائز مطالبے کے مسترد کئے جانے کے بعد انہیں اپنے خوں آشام خنجر کا نشانہ بنایا اس وقت بھی جو آخری مشروب انہیں پیش کیا گیا وہ ان کی وہی دل پسند "نبیذ" تھی جسے ان کے علاوہ کوئی اور پیتا تو اندھا ہو جاتا۔ تقریباً ان کے تمام ہی تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ جب ان کو پلائے جانے والی نبیذ ان کے زخم کے راستے سے بہہ نکلی تو سب کو یقین ہو گیا کہ شراب کا رسیا یہ خلیفہ اب مزید زندہ نہیں رہ سکے گا۔

اس موقع پر سیرت عمر کے دو تین مزید واقعات کا تذکرہ کر کے ہم اس کتاب کو ختم کر دیں گے۔ یہ واقعات حضرت عمر کی مزاجی خصوصیات کی عکاسی کرتے ہیں۔

خلیفہ دوم کے عہد حکومت کا یہ واقعہ درشتی مزاج اور ان کی تنگ مائیگی کا آئینہ دار ہے۔ نصر بن حجاج نامی ایک خوبصورت نوجوان سے کہا گیا کہ تم اپنے سر کے بال منڈوا دو۔ اس بے چارے نوجوان نے جس کا جرم بے گناہی یہ تھا کہ اسے صناع قدرت نے حسن و دلکشی اور جمال و رعنائی سے نوازا تھا۔ "حکم حاکم مرگ مفاجات" کے تحت سر کے بال منڈوا دیے اس سے اس کی دلکشی میں اور اضافہ ہو گیا اور وہ زیادہ SEXY نظر آنے لگا۔ تب حکم صادر ہوا کہ اسے مدینہ سے فی الفور نکال باہر کیا جائے کہ اس کا وجود مستورات کے لیے فتنہ سے کم نہیں۔

ذوق جمالیات ایک فطری جذبہ ہے اور بقول کسے "حسن چہرے میں ہو یا تاج محل

میں اپنے اندر ایک بے ساختہ کشش رکھتا ہے۔ قرآن مقدس نے تو پیغمبرؐ تک کے حُسن و جمال کی دلکشی سے متاثر ہونے کا ذکر کیا ہے۔ بائیسویں پارے کی آیت ولو عجد حُسینین اس کی شاہد ہے لیکن مسلمانوں کا خلیفہ اپنے شہر میں ایک خوبصورت جوان کو دیکھنے تک کا روادار نہیں ہے اور اسے اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک وہ اسے شہر سے باہر نہیں نکال دیتا پتہ نہیں یہ ذوقِ جمالیات سے محرومی تھی یا احساس محرومی کی خلش؟

عورت کو صنفِ لطیف کہا جاتا ہے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو عورتوں کو "قواریر" (آبگینے) سے تعبیر کیا ہے۔ ع

انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

حضورؐ نے دنیا کی جن تین چیزوں کو اپنی محبوبیت کا شرف بخشا ہے ان میں خوشبو اور نماز کے ساتھ ساتھ تیسرا نام عورت کا بھی ہے۔ ع

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

لیکن حضرت عمر کے بارے میں تاریخ بتاتی ہے کہ وہ عورت کے معاملہ میں سخت دل واقع ہوئے تھے۔ جب حضرت عمر نے ام کلثوم بنت ابی بکر کو شادی کا پیغام بھجوایا اور حضرت عائشہ نے اس رشتہ کی سفارش بھی کی مگر چھوٹی بہن نے بڑی بہن کا یہ کہہ کر منہ بند کر دیا کہ: فانہ خشن العیش شدید علی النساء" وہ نہایت کٹھور اور سخت مزاج واقع ہوئے ہیں، اور عورتوں پر سختی کرتے ہیں۔ [1] اس طرح جب انہوں نے عتبہ بن ربیعہ

---

[1] ایک افسانہ جو غض ناموس پیغمبر کو مجروح کرنے اور خانوادۂ نبوت کو رسوا کرنے کے لیے تراشا گیا وہ عمر ابن خطاب کے داماد علیؑ ہونے کا فرضی قصہ ہے۔ بدیہی طور پر اس جھوٹی کہانی کو سوچی سمجھی سازش کے تحت وضع کیا گیا تاکہ اس سے حضرت علیؑ اور ان کے خاندان کو رسوا کیا جا سکے۔

اس واقعہ کو تقریباً سبھی مورخین نے ایک شرمناک کہانی کی (بقیہ حاشیہ صــــ۱۸۱ـــ پر)

کی بیٹی امام ابان کو نکاح کا پیغام بھیجا تو اس عورت نے بھی جو ہندہ کی بہن اور معاویہ

(بقیہ حاشیہ صـــ۱۸۰) کی تمہید کے ساتھ اپنی اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے۔ یہ کہانی بجائے خود اتنی حیا سوز اور شرمناک ہے کہ کسی مہذب مجلس میں بیان کرتے ہوئے خود حیا کے ماتھے پر پسینہ آجائے۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی شخص نے اسے کوک شاستر کے انداز میں ڈھالا اور بیان کر دیا اور ہمارے بے شرم مورخین اور محدثین نے اسے اٹھایا اور نقل کر دیا۔ بلا شبہ ہم خلیفہ دوم کی اخلاقی عظمت کے قائل نہیں ہیں۔ وہ جو کچھ بھی کر گزریں کم ہے لیکن اخلاق سے اس درجہ گرا ہوا اتنا مبتذل اور فرو مایہ انسان بھی وہ ہو سکتا ہے یہ ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ لیکن طبری، اصابہ، اسد الغابہ اور الاستیعاب کی اس مشترکہ روایت کو جس میں کہیں کہیں لفظوں کا تھوڑا بہت فرق ملتا ہے پڑھ کر تو ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہم اسے سو فی صد اور سراسر جھوٹا قصہ سمجھتے ہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس واقعہ کے بعض کرداروں کے نام بدل دیے گئے ہیں۔

ام کلثوم نام کی جس لڑکی کا رشتہ خلیفہ دوم نے اپنی عمر کے اکسٹھویں سال میں مانگا وہ خلیفہ اول کی بیٹی تھی چونکہ اس نام کی ایک بیٹی حضرت علیؑ کی بھی تھی اس لیے اسے ام کلثوم بنت ابوبکر کے بجائے ام کلثوم بنت علی بنا دیا گیا۔ اب اصل قصہ سنئے جسے مورخین نے اپنی معتبر کتابوں میں بڑی بے حیائی اور ڈھٹائی سے نقل کیا ہے:۔

"ام کلثوم بنت علی بن ابی طالب رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے قبل پیدا ہوئیں سیدہ فاطمہ زہرہ بنت پیغمبرؐ ان کی والدہ ہیں۔ ان سے شادی کا پیغام حضرت عمر نے حضرت علیؑ کو دیا۔ حضرت علی نے فرمایا وہ ابھی بہت کم عمر ہے۔ اس پر عمر بولے آپ مجھ سے اس کی شادی کر دیجئے میں اس کا اتنا خیال رکھوں گا کہ دوسرا کوئی نہیں رکھ سکے گا۔ اس پر حضرت علیؑ نے فرمایا۔ میں اسے آپ کے پاس بھیجوں گا اگر وہ مان گئی تو میں اس کی شادی تم سے کر دوں گا۔ چنانچہ حضرت علیؑ نے ایک چادر دے کر اس کو عمر ابن خطاب کے پاس بھیجا اور کہا کہ میرے والد نے یہ چادر (بقیہ حاشیہ صـــ۱۸۲)

کی خالہ تھی۔ اس رشتہ کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ "بغلق بابه و بمنع خيره يدخل عابسا ويخرج عابسا خیر کے لیے اس کا دروازہ بند رہتا ہے۔ گھر میں گھستا ہے تو تیوری چڑھی رہتی ہے۔ گھر سے نکلتا ہے تو تیور بگڑے ہوئے۔" (طبری ج ۳ ص ۲۷۰)

اور اب آخر میں ایک اور واقعہ جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کے علمی وفکری مزاج کو پامال کرنے میں ان حضرات نے کیا کیا کارنامے سر انجام دیے۔ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا۔

کلمة الحكمة ضالة المومن حيث اخذ ها وهواحق بها"

"حکمت و دانائی کی ہر بات مسلمان کی متاع گم گشتہ ہے جہاں سے یہ دولت ملے اسے قبول کرو کہ سب سے زیادہ اس پر حق ایک مسلمان ہی کا ہے۔"

حضورؐ کے اس علم پرور اور ایمان افروز اعلان کے بعد اب ذرا دورِ فاروقی کے اس کارنامے پر نظر ڈالیے۔ مشہور مؤرخ ابن خلدون لکھتا ہے۔

"ظہور اسلام کے بعد جب فارس فتح ہوا اور اس میں کتب خانے دستیاب ہوئے تو سعد بن ابی وقاص نے حضرت عمر کو لکھا کہ ان کے بارے میں کیا کیا جائے۔ اگر اجازت

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۱) میرے باپ تمہارے لیے بھیجی ہے۔ حضرت عمر نے بچی سے کہا اپنے والد سے کہنا کہ مجھے یہ چادر پسند ہے اللہ آپ کو راضی رکھے۔ اس کے بعد عمر نے اپنا ہاتھ لڑکی کی ٹانگ پر پھیرا اور اس کی ٹانگ سے کپڑا ہٹا دیا۔ وہ بچی بولی یہ تم کیا کر رہے ہو۔ اگر تم امیر المومنین نہ ہوتے تو میں تمہاری ناک توڑ دیتی۔ (یہاں راویوں میں اختلاف ہے کسی میں ہے کہ میں تمہاری آنکھ پھوڑ دیتی اور کسی میں ہے کہ میں تمہارے منہ پر تھپڑ مارتی۔) اس کے بعد ام کلثوم اپنے باپ کے پاس آئیں اور انہیں سارا واقعہ بتا کر کہا کہ آپ نے مجھے ایک بدکردار بڈھے کے پاس بھیجا۔ اس پر حضرت علیؑ بولے۔ نہیں بیٹی وہ تمہارا ہونے والا شوہر ہے۔ (الاستیعاب ج ۴ ص ۴۶۸) شرم تم کو مگر نہیں آتی۔

ہو تو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ آپ نے فرمان صادر فرمایا کہ ان کو دریا برد کر دو کیونکہ اگر ان میں ہدایت ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم سب کو بالاتر ہدایت مل چکی ہے اور اگر ان میں گمراہی ہے تو اس کے ہم حاجت مند نہیں ہیں۔ ہٰذا تعمیل حکم میں کچھ کتابوں کو دریا برد کیا گیا اور کچھ کو نذر آتش اور یوں علوم وفنون پارسی کا ذخیرہ مٹ گیا اور ہم تک نہ پہونچ سکا۔ (مقدمہ ابن خلدون)

شبلی نعمانی نے اپنے مقالات میں اسکندریہ کا کتب خانہ جلائے جانے کا انکار کیا ہے اور ممدوح نے حضرت عمر کی صفائی پیش کی ہے کہ انھوں نے اس کے جلانے کا حکم نہیں دیا تھا لیکن دنیا کی قدیم ترین تہذیب "ایران" کے علمی سرمایے کو نذرِ آتش کرنے کے حکم پر ان کو سانپ سونگھ گیا۔ جرم کی نوعیت اگر ایک سی ہو تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ جرم کہاں سرزد ہوا۔ جگہ کی تبدیلی سے مجرم کے جرم میں کمی واقع نہیں ہو جاتی۔ اسکندریہ کا کتب خانہ چلیے ہم نے مان لیا کہ حضرت عمر کے حکم سے نہیں جلایا گیا مگر ایران کے بیش بہا علمی ذخیرہ کی تباہی ان کے حکم سے ہوئی۔ نوعیت جرم کے اعتبار سے یہ کیا کچھ کم جرم ہے۔

حضرت عمر کی اس "سنت سیئہ" کو بعد میں آنے والے حکمرانوں نے بھی زندہ رکھا مخصوص مخالف مکاتیب فکر کے عظیم الشان کتب خانے اسی جاہلانہ عصبیت کی نذر ہو گئے اور کمال کی بات یہ ہے کہ جن حکمرانوں نے یہ غلط روش اپنائی اسلامی تاریخ میں ان کی بھی اسی طرح دھوم مچی ہوئی ہے جیسی ان کے پیش رو کی دھوم ہے۔ فاطمین مصر کا عظیم الشان کتب خانہ جس کا تذکرہ ابن خلدون نے بھی کیا ہے۔ اسے محض اس بنا پر صلاح الدین ایوبی نے تباہ و برباد کر دیا کہ اس میں شیعہ کتب کا کافی بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ اس سے پہلے محمود غزنوی نے جب رے کا شہر فتح کیا تو اس نے وہاں کی تمام شیعی کتب خانوں کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا۔ ان میں مشہور شیعی وزیر صاحب بن عباد کا کتب خانہ بھی تھا۔

بہار الدولہ شیعی نے ۳۸۱ھ میں بغداد کے محلہ کرخ میں ایک بہت بڑا کتب خانہ قائم کیا جس میں دس ہزار مخطوطے نامور خطاطوں کے موئے قلم کا شاہکار تھے۔ یاقوت حموینی نے معجم الادبا میں لکھا ہے کہ اس سے بہتر کتب خانہ روئے زمین پر کہیں نہیں تھا۔ مشہور مورخ ابن خلکان نے اسے "دار العلم" کے نام سے یاد کیا ہے۔ ۴۵۱ھ میں سنی کمانڈر طغرل بیگ نے اس کتب خانے کو نذرِ آتش کر دیا۔ شیخ الطائفہ ابو جعفر محمد بن حسن طوسی کا کتب خانہ بھی بغداد میں سنیوں کے ہاتھوں تباہ ہوا۔ حدیث میں ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

من سن فی الاسلام سنته سئیة فعلیه وزرها ووزر من عمل بها۔

(جس نے اسلام میں کوئی رسمِ بد جاری کی تو اس رسمِ بد کے اپنانے والوں کے جرم کی پھٹکار بھی پڑتی رہے گی۔)

چنانچہ دنیا میں جب بھی کبھی کوئی علمی سرمایہ برباد ہوا اور تعصب و تنگ نظری کی بناء پر ذخیرہ کتب کو آگ لگائی گئی۔ "خلافت راشدہ" کے خلیفہ دوم کی گردن پر اس کا وبال پڑتا رہے گا کہ پہل انہوں نے کی۔ والفضل للمتقدم۔

تعجب ہے کہ مسلمان قوم نے اپنے بالکل ابتدائی دور ہی میں اپنے سروں پر ایک ایسے شخص کو بہ طور حکمراں کیوں کر مسلط کر لیا جسے نہ علم سے شغف تھا، نہ اخلاق فاضلہ سے بہرہ تھا، نہ اس میں جمالیات تھا، نہ نزاکت احساس ؎

خشت اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

ریت کی دیواریں

سوچتا ہوں بات کا آغاز کہاں سے کروں اور کس شخصیت کو سب سے پہلے زیر لاؤں ایک طرف "الصحابۃ کلھم عدول (تمام صحابہ نیکو کار یا قابل اعتماد ہیں) کا نوٹس چسپاں ہے دوسری جانب "اصحابی کالنجوم بایہم اقتدیتم اھتدیتم" (میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں جس کی پیروی کروگے ہدایت پا جاؤ گے) کا حصار کھنچا ہوا ہے۔ تیسری جانب "لاتسبّوا اصحابی" (میرے صحابہ کو برا بھلا مت کہو) کی ہدایت آویزاں ہے چوتھی سمت "اللہ اللہ فی اصحابی" (میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو) کا انتباہ راہ روکے کھڑا ہے۔

لیکن ریت کی یہ دیواریں یہ کچے گھروندے، یہ شکستہ دیوار و در ان مخدرات عصمت کی بے چادری کو نگاہوں کی چیرہ دستیوں سے کیوں کر بچا سکتے ہیں مبروص چہروں کو آخر کب تک مصنوعی نقابوں سے چھپایا جاتا رہے گا۔ کب تک چند من گھڑت اصطلاحات کا سہارا لے کر عظمتوں کے جھوٹے محل استوار کیے جاتے رہیں گے؟ حقائق پر پردہ ڈالنے کی سعیٔ مذموم کب تک جاری رہے گی؟ کہاں تک صداقتوں کا منہ چڑایا جاتا رہے گا؟ کب تک قرار واقعی عظمتوں کا انکار ہوگا؟ جھوٹ کو سچ

بنا کر اور سچائی کو جھوٹ کا روپ دے کر لوگ کب تک خود فریبی کا شکار ہوتے رہیں گے اور کب تک خلقِ خدا کو فریب دیتے رہیں گے۔

اگر کسی کے ذہن میں خود ساختہ نظریات اور بے سروپا روایات کا جھاڑ جھنکاڑ اس حد تک راسخ ہو چکا ہے کہ اب کسی معقول بات کے لیے اس میں کوئی گنجائش نہیں رہی تو ایسا شخص ہمارا مخاطب نہیں کہ "میں نہ مانوں" کی دلیل کا کوئی توڑ آج تک پیش نہیں کیا جا سکا۔

البتہ اگر دل میں خدا اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کا نقش مرتسم ہو، اگر محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے غیر مشروط وفاداری کا عہد مستحکم ہو۔ اگر تمام بڑی چھوٹی شخصیتوں سے صرف نظر کر کے صرف ایک حضور اقدس محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی پر نگاہ مرتکز ہو تو مجھے یقین ہے کہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں اہل دل اور اہل نظر کے لیے اسے قبول کیے بنا چارہ نہیں ہدایت کا نامہ بر اگر کسی صاحب ضمیر انسان کے درِ دل پر دستک دے تو پھر مجال انکار ممکن نہیں ہے اور وہاں سرتابی اور روگردانی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ میں نے اس کتاب میں جو تلخ و ترش باتیں لکھی ہیں یہ خیر و فلاح کی ایک پرزور دستک ہے ہر اس دروازۂ دل پر جسے شخصیتوں سے زیادہ اصول عزیز ہیں جسے افراد کی بجائے نظریات سے محبت ہے جسے اپنے ذاتی اور شخصی رجحانات سے زیادہ حقائق سے لگاؤ ہے جو دین کو پیغمبر کے حوالے سے سمجھنا چاہتا ہے کسی ایرے غیرے کی اختراع ذہنی کے ذریعے نہیں جو سرچشمۂ ہدایت صرف محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس کو سمجھتا ہے اور اپنے دل و دماغ کی تمام تر توانائیوں کے ساتھ اس سرچشمۂ زلال جہانی سے اپنی روحانی تشنگی کا ازالہ چاہتا ہے بقول اقبال ؎

بہ مصطفےؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

یہ حریفانہ کشمکش کی کوئی داستان نہیں ہے یہ مناظرانہ اسلوب بیان بھی نہیں ہے نہ یہ مجادلہ ومکابرہ کی شکل ہے سخن سازی اور عبادت آرائی بھی مقصود نہیں ہے ایک طالب علمانہ سعیٔ ناتمام ہے احقاق حق اور ابطال باطل کی خاطر

شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

میں نے بارہا اس امر کے بارے میں غور و فکر کیا ہے کہ اسلام کے اعلیٰ نظریات کی اصل ناکامی کا باعث کیا ہے ایک ایسا نظام حیات جو جامع بھی تھا اور فکر و عمل کے ہر شائستہ معیار پر پورا بھی اترتا تھا عملاً وہ دنیا میں کیوں قائم نہ رہ سکا. کیا یہ اس نظام کا نقص تھا جسے ہم منشور خداوندی قرار دیتے ہیں یا اس نظام کے علمبرداروں میں خامی تھی جس نے ایک بہترین نظام کو ناکامی سے دوچار کر دیا۔

اب یہاں اس امر کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اسلام جس حیرت انگیز اور عظیم الشان انقلاب کا پیام بر بن کر آیا تھا وہ ایک ہمہ جہتی انقلاب تھا ایک ایسا عالم گیر انقلاب جس نے صدیوں کی فرسودہ روایات کو مٹا کر رکھ دیا جس نے اخلاقی اور سماجی قدروں کو شائستگی اور تہذیب کا نیا تصور عطا کیا اور جس کی آفاق گیری نے قوموں اور ملکوں کے نظام ہائے سیاست و تمدن کو تہ و بالا کر کے ایک نظام زندگی کی طرح ڈالی جو ہمہ گیر تھا جس میں عدل و مساوات کے اصول کی پاسداری تھی، اعتدال و توازن کی ہم آہنگی تھی، انسانیت و شرافت کی... نگہداری تھی اور اعلیٰ اقدار حیات کی فرماں روائی تھی۔

بطحائے عرب کی سنگلاخ چٹانوں سے رشد و ہدایت کا جو آفتاب نبوّت آج سے چودہ سو برس پہلے طلوع ہوا تھا اس کی ضیا باریوں سے جبر و ظلم کی تیرہ و تار فضا میں عدل و انصاف کا نور جگمگا اٹھا۔

انقلاب فرانس سے کم و بیش ایک ہزار برس قبل جو انقلاب مدینۂ منورہ کی سرزمین سے اُبھرا اس نے اسود و احمر کی تمیز ختم کر دی کالے اور گورے کا فرق مٹا دیا، عربی و عجمی کا امتیاز مٹا دیا۔ رنگ و نسل کی تفریق اور امیر و غریب کا تفاوت یکسر محو کر دیا۔ ایوان شہنشاہیت کے در و دیوار اس انقلاب کی صدائے بازگشت سے لرز اٹھے، ملوکیت کا قصر فلک پیما اس انقلاب کی زلزلہ افگنی سے زمین بوس ہو گیا۔ قبائلی نخوت و رعونت کا سر کچل دیا گیا گروہی عصبیت پر کاری ضرب لگائی گئی قیصرو کسریٰ کی سطوت و جبروت داستان پارینہ بن کر رہ گئی۔ پاپائیت اور پروہت ازم کی مذہبی اجارہ داری کا قلع قمع کر دیا گیا۔

لیکن کیا کبھی ارباب علم و دانش نے اس سوال پر بھی غور کیا کہ یہ عظیم الشان اور آفاق گیر انقلاب جس تیزی سے آیا تھا اتنی ہی تیزی سے مٹ کیوں گیا آخر یہ کیا ہوا کہ ادھر انقلاب آفریں پیغمبرؐ کی آنکھیں بند ہوئیں اور وہ اس دنیائے آب و گل سے رخصت ہوئے اور اُدھر اس انقلاب کے اثرات اس طرح غائب ہوئے کہ دو چار برسوں کے اندر اندر وہ ساری قباحتیں جنھیں اسلام دنیا سے مٹا دینے کے عزم کے ساتھ اٹھا تھا مسلمان معاشرہ میں پوری شدت کے ساتھ پھیل گئیں اور اس کا اعتراف خود خلیفہ اول نے اپنے ایک بیان میں کیا انھوں نے اپنے نامزد کردہ جانشین سے کہا تھا۔

" احذرک ہولاء النفر من اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الذین قد انتفخت

ابوانہم دعمت البصارم (ازالۃ الخفا از شاہ ولی اللہ محدث دہلوی)

"میں تمہیں اس گروہ صحابہ کے بارے میں خبردار کرتا ہوں جن کے پیٹ پھول چکے ہیں اور جن کی آنکھیں اندھی ہو چکی ہیں۔

حضرت ابوبکر کا دور خلافت افراتفری کا دور تھا اس دور میں انتشار و فساد کی ایسی گرم بازاری ہوئی کہ کسی منظم، بااصول اور انقلابی تحریک کے عین دور عروج میں اس سے پہلے اور اس کے بعد اس انداز کی ہنگامہ آرائی کبھی سننے یا پڑھنے میں نہیں آئی۔ تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی اس امر سے بخوبی آگاہ ہے کہ خالصتاً مادیت کی بنیاد پر اٹھنے والی سیاسی اور سماجی اصلاح کی تحریک بھی اگر مخلص ہاتھوں میں ہو تو وہ کم و بیش چوتھائی صدی بلکہ اس سے زیادہ عرصہ تک اندرونی اختلافات اور بیرونی خلفشار سے محفوظ و مصئون رہی۔

اس سلسلے میں ہمسایہ ملک ہندوستان کی حکمراں پارٹی کانگریس کی مثال پیش کی جا سکتی ہے[1]

جنگ آزادیٔ ہند کی علمبردار اس جماعت نے اپنی تحریک کا آغاز آج سے تقریباً ساٹھ برس قبل کیا تھا اس کے شرکار و اراکین مختلف نظریات اور متعدد مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے ان میں علما بھی تھے حکماً بھی، ادیب بھی تھے، خطیب بھی، فلسفی بھی تھے دانشور بھی، اساتذہ بھی تھے معلم بھی، گنہ گار بھی تھے اور مہاتما بھی، ان میں ہندو بھی تھے مسلمان بھی تھے، سکھ بھی تھے، عیسائی اور پارسی بھی۔

اس تنوع کے باوجود ایک مقصد یعنی آزادیٔ ہند کی خاطر یہ لوگ ایک ہی کنبہ کے افراد اور ایک ہی خاندان کے اشخاص کی

نوٹ: یہ کتاب اصل میں پاکستان میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی افادیت کی خاطر ہم نے ہندوستان میں شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

مانند برطانوی استعمار کے خلاف صف آرا رہوئے ان کے درمیان اختلاف کے ہزار پہلو تھے مگر انھوں نے کبھی ان اختلافات کو حصول مقصد کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ اس کے صف اول کے رہنما مزاجی صیانت کے حامل رنگ ونسل و مذہب کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے بون لعیہ رکھتے تھے مگر نہ ان میں قیادت کے لیے کبھی کوئی جھگڑا ہوا نہ انھوں نے کبھی اپنے ساتھیوں کو سرِعام رُسوا کیا نہ ایک دوسرے کی پگڑی اچھالی نہ خویش پروری اور اقربا نوازی کا کھیل کھیلا۔

گاندھی جی کی مہاتمائیت اور مولانا ابوالکلام آزاد کی دینی اور علمی عظمت کے باوصف کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ کانگریس کی تحریک ایک روحانی تحریک تھی تاہم اس کے صف اول کے قائدین کے اخلاق، ان کے کردار، ان کے چال چلن، ان کی دیانت وامانت ان کی شرافت و نجابت کے بارے میں کبھی کوئی اسکینڈل نہ بن سکا۔ یہ لوگ دنیا کی سب سے بڑی استعماری قوت کے خلاف برسرِپیکار تھے جس کی پروپیگنڈہ مشینری اور دُنیا بھر میں پھیلے ہوئے ذرائع ابلاغ پر اس کی مکمل اجارہ داری کے باوجود ان حضرات کے دامن پر کوئی بدنما داغ نہ لگ سکا اور ان کی سیاسی عظمت ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر رہی اقتدار پر آنے سے قبل اور اقتدار پر قابض ہونے کے بعد اس جماعت کی صفِ اول کی قیادت کسی ایسی بدعنوانی میں ملوث نہیں ہوئی جس قسم کی بدعنوانیوں کے تذکرے بعض جلیل القدر صحابہ کی مقدس شخصیتوں کے حالات میں بہ کثرت ملتے ہیں۔

خویش پروری، اقربا نوازی، جبر و استبداد، بیت المال میں تصرف بے جا، قومی خزانہ کا استحصال، جنسی بے راہ روی، عیش وعشرت، جوڑ توڑ، سازش، وسیہ کاری، اخلاقی حدود کی پامالی غرض کہ ہر وہ برائی جسے کسی مہذب معاشرے میں برداشت نہیں کیا جاسکتا خلافت راشدہ کے اس دور میں اس کا چلن عام تھا۔

حالانکہ اسلام نظامِ زندگی میں جس ہمہ گیر انقلاب کا علمبردار بن کر اٹھا تھا وہ سراسر روحانیت پر مبنی تھا اس نظام کے ایک ایک شعبہ میں روحانیت اور تعلق باللہ کی کیفیت کچھ اس طرح رچی بسی ہوئی تھی کہ ایک کو دوسرے سے جُدا کرنا ممکن نہیں تھا کوئی بڑے سے بڑا بدباطن بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسلام کا تصوّرِ حیات مادیّت کا پرتو لیے ہوئے تھا، اقتصاد کا شعبہ ہو یا معیشت کا کوئی پہلو سیاست ہو یا تجارت، راعی ہو یا رعایا، حاکم ہو یا محکوم، صنعت وحرفت ہو یا زراعت و کاشت کاری، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر معاملہ زندگی اور ہر کاروبارِ حیات میں خدا کی ہدایات اور خوف خدا کی پاسداری کا حکم دیا۔ اور یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اسلام نے زندگی کو بحیثیتِ مجموعی تابع وفرمانِ خداوندی بنانے پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔

لیکن حالات کی یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ اس سراسر روحانی تحریک کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں آئی اور جنھیں

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصال کے فوراً بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جانشینی کا شرف حاصل ہوا ان کا کردار کیا تھا۔ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد جس طرزِ عمل کو اپنایا اور جس قسم کے اخلاق واوصاف کا مظاہرہ کیا کیا وہ ایک روحانی تحریک کے شایانِ شان تھا۔

گستاخِ رسولؐ

سقیفۂ بنو ساعدہ میں جو کچھ ہوا وہ تو ہوا لیکن اس سے پہلے جس قسم کے واقعات رونما ہوئے وہ کچھ کم تعجب خیز نہیں ہیں اور کیا کسی بھی شریف النفس معاشرہ میں اس قسم کی صورتِ حالات کی توقع کی جا سکتی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ جو بات دل و دماغ کو حیران و مضطرب کرتی ہے وہ ان لوگوں کی سرد مہری اور بے مروتی کا انداز ہے جو انھوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی ذاتِ اقدس کے ساتھ روا رکھا۔

خلیفۂ دوم عمر ابن خطاب نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے مرض وفات میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں جو گستاخانہ روش اختیار کی کیا اس کی کوئی اخلاقی توجیہ ممکن ہے۔ غزالی جیسے متعصّب سُنّی عالم نے جو شہادت امام حسین علیہ السلام کے تذکرے کو محض اس لیے حرام گردانتا ہے اور اس سے لوگوں کو صرف اس بنا پر روکتا ہے کہ اس سے بعض تیسرے درجہ کے صحابہ کی عظمت مجروح ہوتی ہے۔ اس نے اپنی

کتاب "سر العالمین" میں اس روایت کو درج کیا ہے کہ

وملامات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم قال قبل وفاتہ ایتونی دوات وبیاض لازیل عنکم اشکال الامر واذکر لکم من المتحق بعدی قال عمر دعوا الرجل فانہ یھجر وقیل یھذر۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے وصال سے قبل ارشاد فرمایا کاغذ اور دوات وقلم لاؤ تاکہ میں معاملہ کی الجھن اور اپنے اور مستحق خلافت کی وضاحت کردوں اس پر عمر ابن خطاب بولے اس شخص کی بات کو چھوڑو کہ یہ تو اس وقت بے سروپا باتیں کر رہا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ انھوں نے یہ کہا یہ شخص تو ہذیان بک رہا ہے۔

(العیاذ اللہ ثم العیاذ باللہ)

ذرا انداز بیان ملاحظہ ہو شائستگی اور تہذیب سے اس انداز گفتگو کا دور کا بھی کوئی تعلق ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے قدرت کو "النبی" یا "الرسول" کہنا بھی گوارا نہیں ہوا اسکی بجائے آپ کی شان میں "الرجل" (یہ شخص) کا گستاخانہ لفظ استعمال کیا جارہا ہے۔ اور پھر اس پر مستزاد "یھجر" یا "یھذو" (بہ اختلافات روایت) کی شرمناک جسارت جس کا بامحاورہ اور سلیس ترجمہ "یاوہ گوئی کر رہا ہے" یا "ہذیان بک رہا ہے" کے سوا اور کچھ نہیں۔

بخاری اور مسلم میں بھی عبداللہ ابن عباس کے حوالہ سے اسی مضمون کی ایک روایت ملتی ہے جس میں عمر ابن خطاب کی جانب مزید یہ الفاظ منسوب کیے گئے کہ وعندکم القرآن حسبکم کتاب اللہ" (تمہارے پاس قرآن موجود ہے اور اللہ کی کتاب تمہارے لیے کافی ہے) اسے کہتے ہیں "لقمان را حکمت آموختن"

سوال یہ ہے کہ آیا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو علم نہیں تھا کہ اللہ کی کتاب قرآن لوگوں کی ہدایت کے لیے کافی ہے۔ اب مزید کسی تحریر کی ضرورت نہیں ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ " ھلموا اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعدی (آؤ میں تمہیں ایک دستاویز لکھ دوں کہ اس کے بعد تم کسی گمراہی کا شکار نہ ہوسکو) تو اس حکم کی مخالفت کیوں کی گئی اور عمر ابن خطاب اس حکم کی تعمیل میں رکاوٹ کیوں بنے وہ کونسی اغراض مشؤمہ تھیں جن کی تکمیل کی راہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا گیا کہ " ہمارے لیے قرآن کافی ہے" صاحب شریعت اور صاحب امر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی تھی یا عمر ابن خطاب کی انھیں یہ کیسے جرأت ہوئی کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے ان کی بیماری کی آڑ لے کر سرتابی کی جرأت کریں۔

کہاں ہیں وہ لوگ جو محبتِ رسولؐ کا دم بھرتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام پر انگوٹھے چومتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلاۃ وسلام کی محفلیں برپا کرتے ہیں اور خود کو "عشاق رسولؐ" کہتے ہیں۔ انھوں نے کبھی سوچا کہ ان کی محبت وعشق رسولؐ کا تقاضا کیا ہے اور اس شخص کے بارے میں ان کی رائے کیا ہے جو " لقمان را حکمت آموختن" کی ناروا جسارت کا مرتکب ہو رہا ہے جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک واضح اور صریح حکم کو یہ کہہ کر مسترد کر رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عیاذاً باللہ، ہذیان بک رہے ہیں والعیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ اس سے قبل صلح حدیبیہ کے موقع پر ان حضرت نے سوءِ ادب کا ایسا ہی وطیرہ

اپنایا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس گستاخ شخص سے یہ کہنا پڑا تھا کہ " انی شک انت یا ابن الخطاب ؟ " (اے ابن الخطاب! کیا تمہیں میری نبوت و رسالت میں کوئی شک ہے ؟)

میں ان محبانِ رسولؐ سے پوچھتا ہوں کہ ان کا مرکز عقیدت و محبت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے یا کوئی دوسرا شخص ؟ اور اگر مقصود صرف حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس ہے تو ایسے گستاخ اور بے ادب شخص کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے جو یہ دیکھ کر کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بسترِ مرگ پر ہیں کہ ان کے فرمان کی یہ بیہودہ توجیہ کر رہا ہے کہ یہ حکم نہیں ہے بلکہ ہذیان اور بکواس ہے (معاذ اللہ)

اور یہ تو چھوٹے میاں کا قصہ ہے اب ذرا بڑے میاں کا قصہ سن لیں لیکن " بڑے میاں سو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ " کے اس تذکرے سے قبل ایک دلچسپ حدیث پر نظر ڈال لیں جسے " من ترا ملا بگویم تو مرا حاجی بگو " کے ضابطے کا بہترین شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے اور " انجمن تحسین باہمی " کا اشتہار بھی۔

وعن جابر قال قال عمر لابی بکر یا خیر الناس بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقال ابوبکر اما انک ان قلت ذلک فلقد سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم یقول ما طلعت الشمس علی رجل خیر من عمر (ترمذی)

جابر کہتے ہیں عمر ابن خطاب نے ابوبکر کو یہ کہہ کر مخاطب کیا " اے رسول اللہؐ کے بعد سب سے بہتر انسان "

اس پر ابوبکر بولے " تم اگر یہ کہتے ہو تو میں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے وہ فرماتے تھے "عمر سے بہتر شخص پر آفتاب کبھی طلوع نہیں ہوا۔"

اس "تحسین ناشناس" اور داد کے اس ڈونگرے سے تو عمر ابن خطاب کا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی افضل ہونا ثابت ہوا بلکہ تمام انبیا ورسل پر ان کی فوقیت ثابت ہوگئی۔

"انجمن تحسین باہمی" کی اس داد و دہش کے بعد اب بڑے میں۔ اں کا واقعہ سنیے اور سر دھنیے یعنی اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی۔

جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوگیا اور لوگوں پر یاس وحرمان کی کیفیت طاری ہوگئی تو اس موقعے پر پہلے سے سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت چھوٹے میاں تو تلوار سونت کر کھڑے ہوگئے اور چلّانے لگے کہ جو شخص یہ کہے گا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا انتقال ہوگیا ہے۔ میری تلوار اس کا سر قلم کردے گی۔ اور بڑے میاں نے چھوٹے میاں کی اس للکار کو سن کر ایک تقریر جھاڑ دی اور کہا الامن کان یعبد محمدًا فان محمدًا قد مات ومن کان یعبد اللہ فان اللہ حی لا یموت۔" "سنو! جو شخص محمدؐ کی پوجا کرتا تھا تو محمدؐ تو مرگئے ہیں اور جو شخص اللہ کی پوجا کرتا تھا تو اللہ زندہ ہے کبھی نہیں مرے گا۔"

اہل سنت والجماعت ابوبکر کی اس تقریر کو ان کی عظمت کا شاہکار قرار دیتے ہیں اور اس تقریر کے حوالے سے ان کی فہم و فراست اور دور اندیشی اور تدبر و ذہانت کا چرچا کرتے ہیں انھوں نے کبھی یہ بھی سوچا کہ اس تقریر میں

کیسا زہر چھپا ہوا ہے ان چند الفاظ میں بے مروتی اور شوخ چشمی اور سرد مہری کی کیسی کج ادائی پنہاں ہے اور گستاخی اور بے ادبی کا کیسا مرقع ہے یہ تقریر بھلا ایک ایسے معاشرہ میں جسے خود حضور نبی اقدس واطہر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تشکیل دیا جس کی بنیاد توحید پر رکھی ہو جسے برسہا برس کی جان لیوا اور صبر آزما محنت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شرک وبت پرستی کی آلائشوں سے پاک کیا ہو اس میں ایسا کون بدبخت تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پرستش کرتا ہو؟ کیا عمر ابن خطاب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوجا کرتے تھے جنھوں نے بیماری میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ حکم نہیں ہے ہذیان ہے پھر آخر ابوبکر کو یہ کہنے کی جرأت کیوں کر ہوئی اور ان کا روئے سخن کس طرف ہے؟ آج اس چودھویں صدی کے اواخر میں مسئلہ حیات النبیؐ دیوبندی اور بریلوی دونوں گروہوں کے نزدیک ایک متفق علیہ مسئلہ ہے اور اس باب میں گنتی کے چند افراد کو چھوڑ کر سب مسلمان یک زبان ہیں کہ حیات النبیؐ کا عقیدہ نہ رکھنے والا شخص ملحد وزندیق ہے۔

ملتان میں اہل سنت کی مشہور دینی درس گاہ خیر المدارس کے سالانہ جلسہ میں گجرات (پنجاب) کے ایک پیشہ ور اور بدزبان مقرر عنایت اللہ شاہ بخاری نے آج سے دس پندرہ برس پہلے مسئلہ حیات النبیؐ کی تردید کرتے ہوئے جب یہ کہا

"اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مرا نہیں تھا تو صحابہ نے اس کو گڑھے میں کیوں گاڑا۔"

اس بدنہاد اور بدزبان شخص کی یہ تقریر سن کر مدرسہ خیر المدارس ملتان کے مہتمم مولانا خیر محمد نے اس مجلس میں یہ اعلان کیا کہ آئندہ کسی شخص کو جو عقیدہ حیات النبیؐ

پر یقین نہ رکھتا ہو مدرسے کے سالانہ جلسوں میں تقریر کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

لیکن عنایت اللہ شاہ بخاری کی تقریر سے بدمزہ ہونے والوں نے خلیفہ اوّل کی اس تقریر دلپذیر کو انکی خطابت کا شاہکار قرار دیا ہے۔ حالانکہ الفاظ و معانی کے اعتبار سے خلیفۂ اوّل کی تقریر کچھ کم اہانت آمیز نہیں ہے۔

جیسے عنایت اللہ شاہ بخاری کے بارے میں ان کے مرید بن معتقدین یہ "عذر گناہ بدتر از گناہ" پیش کرتے ہیں کہ اس شخص کے مزاج پر توحید کا اثر غالب ہے۔

معذرت کا ایسا ہی انداز خلیفۂ اول کی اس تقریر کے بارے میں اختیار کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ "سبحان اللہ" کیا توحید بیان کی ہے ابوبکر نے۔ کوئی ان احمقوں سے پوچھے کہ توحید بیان کرنے کا یہی ایک موقعہ رہ گیا ہے کیا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توحید کے اعلان و تبلیغ میں کوئی کمی تھی جواب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد اس کے بے موقعہ و بے محل اظہار کی ابوبکر کو ضرورت پیش آئی۔ توحید کے اس بے جا اظہار سے خلیفۂ اول کا مقصد لوگوں کو شرک کی آمیزش سے بچانا نہیں تھا بلکہ ان لوگوں کو خوف زدہ کرنا مقصود تھا جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد یہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کا سرپرست و مربی دنیا سے اٹھ گیا ہے جنھیں یہ صدمہ تھا کہ وہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سایۂ دامان رحمت و شفقت سے محروم ہو کر تنہا رہ گئے ہیں۔ یہ دراصل دھمکی تھی خانوادۂ نبوت

کے ان افراد کو جنھیں خلیفۂ اوّل و دوم و سوم اور ان کے اعزا و اقارب اور ان کے حلیف قبائل ان کی دینی خدمات اور مجاہدانہ اقدامات کے سبب ناپسند کرتے تھے پھر یہ دھمکی تھی اس گروہ انصار کو جن کی خاطر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ عزیز رہی اور جن کا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بطور خاص خیال رکھتے تھے اور جن کے بارے میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُمّت کو خصوصی ہدایت جاری فرمائی تھی کہ اوصیکم بالانصار فانھم کرشی وعیبتی (بخاری عن انس) (میں تمہیں انصار کے بارے میں حسنِ سلوک کی وصیّت کرتا ہوں کہ وہ میرے جسم و جان اور محرم اسرار ہیں) اور جن کے متعلق حضور اقدس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑی صراحت کے ساتھ یہ اعلان فرمایا تھا اور پیش گوئی کی تھی کہ لولا الھجرۃ لکنت امرأمن الانصار ولو سلک الناس وادیا وسلکت الانصار وادیا شعبا سلکت وادی الانصار وشعبھا الانصار شعار والناس دثار انکم سترون بعدی اثرۃ فاصبروا حتی تلقونی علی الحوض (اگر ہجرت کا مرحلہ پیش نہ آیا ہوتا تو میں بجائے خود انصار کا ایک فرد ہوتا اور اگر لوگ کسی ایک وادی اور گھاٹی کا رخ کریں اور انصار کسی دوسری جانب چلیں تو میں انصار کی سنگت نہیں چھوڑوں گا انصار جان کے ساتھ ہیں. دوسرے لوگوں کا نمبر ان کے بعد آتا ہے. اے گروہ انصار تم میرے بعد شاید کسی ناروا سلوک سے دوچار ہو تو صبر کا شیوہ اختیار کرنا تا آنکہ حوض کوثر پر مجھ سے تمہاری ملاقات ہو.

یہ ہے وہ خلافت راشدہ جو پیغمبر کی آنکھیں بند ہوتے ہی پیغمبر کے قریبی اور محبوب اشخاص کو آنکھیں دکھاتی انھیں گھورتی اور ان پر غرانے لگی

ہے اور انہیں دھمکاتی ہے کہ اگر تم نے ہماری غیر مشروط اطاعت نہ کی تو تمہیں کچل دیا جائے گا کیونکہ اب تمہارے ناز اٹھانے والا دنیا سے رخصت ہو چکا ہے اور بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ خلیفۂ اول نے اپنی اس دھمکی کو عملی جامہ پہنا کر چھوڑا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نامزد کردہ خلیفہ امام سیدنا علیؑ ابن ابی طالبؑ کو ان کے حق خلافت سے محروم کر دیا۔

دار العلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دبے لفظوں میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ حضور نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رجحان طبع خلافت و نیابت کے باب میں حضرت سیدنا علی علیہ السلام کی جانب تھا جیسا انھوں نے اپنے رسالہ "انتباہ المومنین" میں اس کی تصریح کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"القصہ عجب نیست کہ دریں واقعہ ہم کم وبیش بمقتضائے طبیعت بشری ومحبت نسبی میلان خاطر افور بجانب حضرت امیر رضی اللہ عنہ باشد[1]"

تعجب ہے کہ جس میلان طبع کا علم مولانا قاسم نانوتوی کو چودھویں صدی ہجری میں ہو گیا اس سے خلیفہ اول بالکل بے خبر رہے۔ بے خبر نہیں تھے لیکن وہ جن لوگوں کے آلۂ کار بنے ہوئے تھے ان کی مرضی اور خواہش یہ تھی کہ سیدنا ابن علیؑ ابن ابی طالبؑ کرم اللہ وجہہ کسی طور بھی مسند خلافت پر متمکن نہ ہو سکیں اور خلیفۂ اول نے صحیح معنوں میں ایک SHOW BOY یا ڈمی خلیفہ کا کردار

---

[1] رسالہ انتباہ المومنین ص۶ از قاسم نانوتوی مطبوعہ ماہ شعبان ۱۳۵۲ھ باہتمام محمد عتیق صدیقی مہتمم کتب خانہ قاسمی دیوبند

ادا کیا۔

حضرت سیدنا علیؓ کو خلافت سے محروم کرنے کے بعد دوسری بے مروّتی اور گستاخ چشمی کا مظاہرہ انھوں نے یہ کیا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لختِ جگر سیدہ فاطمہؓ کو ان کے آبائی ورثہ سے محروم کرکے رکھ دیا یعنی خاندانِ نبوّت کو صرف سیاسی طور پر ہی نہیں اقتصادی طور پر بھی ذلیل و خوار کرنے کی سعیٔ مذموم کی۔

پتہ نہیں محبّت کی یہ کونسی ادا ہے اور عشقِ رسولؐ کا یہ کونسا نرالا دستور ہے کہ نہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواہش کا احترام کیا گیا نہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اکلوتی اور چہیتی بیٹیؓ کے جذبات کی پاسداری کی گئی بلکہ الٹا انھیں رسوا کرنے کی شعوری کوششیں کیں اور خلیفہ اول و دوم دونوں نے اس معرکہ میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام پر گلچھرے اڑانے والے ان دونوں "اکابر مجرمین" کو اسلام کے نامور ہیرو قرار دیتے ہوئے ذرّہ بھر نہیں شرماتے۔

مرکزِ محبت کون ہے

علمائے اہلِ سنّت گردنیں ٹیڑھی کر کے اور آنکھیں گھما گھما کر مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آخر تمہیں کیا ہوگیا ہے تم کیوں اصحابِ رسولؐ کی دشمنی پر اتر آئے ہو۔

میرا ایک ہی جواب ہے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ اگر تم نے تاریخ و حدیث و سیر کا مطالعہ غیر جانب دارانہ طریق پر کیا ہوتا اگر تمہارے سروں میں مغز ہوتا اور عقل کے ساتھ عقل کا بدرقہ بھی استعمال کرتے اور اگر تمہیں دنیا کی ہر شخصیت سے زیادہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت گرامی سے محبت کا تعلق ہوتا تو یقیناً تمہارا ردعمل بھی وہی ہوتا جو میرا ہے۔ تمہارے سامنے شخصیتوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے ایک لاکھ سے زیادہ تو صحابہ ہی کی شخصیتیں ہیں جن میں سے ہر ایک کو تم نے نبی کا سا تقدس اور پیغمبر کی سی معصومیت عطا کر رکھا ہے پھر اس کے علاوہ تمہاری محبوب و مقدس شخصیتوں کا ایک جم غفیر ہے جو چودہ صدیوں کے ہر شب و روز اور ہر ماہ و سال پر محیط ہے تم ان میں سے ہر ایک کی بات کو فرمودۂ خدا اور رسولؐ کی مانند حرفِ آخر سمجھتے ہو۔

صحابہ کے اس جم غفیر کے بعد تابعین کی لاکھوں سے متجاوز تعداد ہے پھر تبع تابعین حد شمار سے فزوں ہیں اور اس کے بعد علماء و مشائخ اور فقہاء و آئمہ حدیث کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے پھر صوفیا اور ارباب خانقاہ کے سیکڑوں سے متجاوز لوگ ہیں کہیں پہ شیخ عبدالقادر جیلانی ہے جنھیں تم نے "غوث اعظم" اور "پیر دستگیر" بنا رکھا ہے، کہیں کوئی قطب الاقطاب ہے جو اپنی لن ترانیوں کا ڈنکا بجا رہا ہے کہیں کوئی شیخ وقت اور مجدد عصر ہے کہیں کوئی امام زماں اور محدث دوراں ہے تمہاری جبین نیاز میں ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں اور ہزاروں آستانوں پر تمہارے سر خم ہو رہے ہیں۔

بہ ذرہ ذرہ سجودے تو شدہ است

لیکن میرا جرم صرف اتنا ہے کہ میرے نزدیک مرکز محبت صرف رسول اقدس محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی ہے یا پھر ان کے اہل بیتؑ اطہار ہیں جن کی محبت کا حکم بھی اسی ایک آستانہ نبوتؐ سے ملا ہے میں ان کی محبت کے پیمانہ سے انسانوں اور شخصیتوں کو ناپتا ہوں میرے نزدیک انسانوں کو تولنے کی میزان صرف محبت خدا اور رسولؐ ہے لیکن تم نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہٹ کر دوسری بے شمار اور ان گنت شخصیتوں کو معیار بنا رکھا ہے۔ تم درحقیقت اس کیفیت سے دوچار ہو جسے شاعر نے اپنے الفاظ میں ؎

"شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا"

کا عجوبہ قرار دیا ہے۔

میں نے اکتساب ہدایت براہ راست اس سرچشمۂ ہدایت سے کیا ہے

جس کا ہر لفظ شریعتِ اسلامیہ میں قانون کا درجہ رکھتا ہے میں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس سے والہانہ اور غیر مشروط محبت کو حاصلِ دین وایمان سمجھا ہے اور اس محبت ہی نے مجھے یہ راہ سجھائی کہ محبّت کا اولین تقاضا یہ ہے کہ جس سے محبّت ہو اس کے محبوب افراد سے بھی محبت کا معاملہ کیا جائے اب اس بات کو سمجھنے کے لیے بقراط ہونا شرط نہیں ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبوب ترین شخصیتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ افراد تھے جنھیں لسان نبوت و وحی نے "آلِ محمدؐ" سے تعبیر کیا ہے جن پر "عترت" کے لفظ کا اطلاق فرمایا ہے اور جنھیں "اہلِ بیت" کہا گیا ہے۔ یہ بالکل بدیہی عقل کی بات ہے اور معمولی سوجھ بوجھ کا آدمی بھی بڑی آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ اولاد کی محبت ایک طبعی ور فطری تقاضا ہے ایک ایسا تقاضائے جبلّت جو صرف انسانوں میں نہیں جانوروں میں بھی ودیعت کیا گیا ہے، پیغمبر فطرت کے تقاضوں کی تکمیل کا مظہر اتم ہوتا ہے۔ فطرت کے مقاصد کی جیسی کچھ نگہ داری پیغمبر کر سکتا ہے دوسرا کوئی نہیں کر سکتا۔

حدیث وسیر کی مستند کتابوں میں اس بے پایاں محبّت کی جھلکیاں ملتی ہیں جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی اولاد سے اور اپنے نواسوں سے تھی یہاں "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر چند ایک واقعات پیش کیے جاتے ہیں تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت بشری کا وہ پہلو دنیا کی نظروں کے سامنے آسکے جو فطرتِ انسانی سے پوری طرح ہم آہنگ ہے اور جسے "اسوہ حسنہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

سیدہ فاطمہ صدیقہ سلام اللہ علیہا سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ی محبت کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی حضورؐ سفر پر تشریف لے جاتے تو سب سے آخر میں سیدہ فاطمہؑ سے رخصت ہوتے اور جب کسی سفر سے واپس تشریف لاتے تو سب سے پہلے سیدہ فاطمہؑ سے جاکر ملتے حدیث میں آتا ہے کہ حضرت سیدہ فاطمہؑ اپنے والد گرامی سے ملنے آتیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محبت میں استقبال کے لیے کھڑے ہو جاتے

فلما دخلت علیہ قام الیہا وقبلہا واجلسہا فی مکانہ

سیدہ فاطمہؑ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آتیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرتے ان کا ماتھا چومتے اور انھیں اپنی جگہ بٹھاتے۔

ایک مرتبہ ابوجہلؑ کے خاندان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو محض پریشان کرنے کی خاطر یہ شوشہ چھوڑا کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آکر اجازت طلب کی کہ وہ اپنی لڑکی کا رشتہ حضرت علی سے کرنا چاہتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سخت برہم ہوئے اور ارشاد فرمایا۔

فاطمۃ بضعۃ جسدی یریبنی ما ارابہا و یؤذینی ما آذاہا

(متفق علیہ)

فاطمہؑ میرا لخت جگر ہے اس کی پریشانی میری پریشانی ہے اور اس کا دکھ میرا دکھ ہے۔

ایک اور روایت میں ہے۔

فاطمۃ بضعۃ منی فمن اغضبہا اغضبنی (متفق علیہ)

فاطمہؑ میرا لخت جگر ہے جس نے اسے ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا۔

سیّدہ فاطمہؑ کی اولاد سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو تعلق خاطر تھا وہ بھی مثالی نوعیت کا تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے حضرت حسن علیہ السلام کے رونے کی آواز سنی آپؐ سیّدہ فاطمہؑ کے ہاں پہنچے اور ان سے فرمایا: "اَوَمَا علمت ان بکاءہ یوذینی"

"کیا تم نہیں جانتیں کہ اس کے رونے سے مجھے تکلیف پہنچتی ہے؟"

براءؓ کہتے ہیں میں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس حال میں دیکھا کہ حضرت حسنؑ بن علیؑ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کاندھے پر سوار ہیں اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے ہیں۔ "خدایا میں اس سے محبت کرتا ہوں تو بھی اسے اپنی محبت سے نواز (متفق علیہ)

ابوہریرہ کہتے ہیں دن کے کسی حصّہ میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیّدہ فاطمہؑ کے مکان پر تشریف لائے میں بھی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ تھا وہاں پہنچ کر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا چھوٹا کہاں ہے کیا چھوٹا بچّہ یہیں ہے؟ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت حسنؑ کے بارے میں دریافت فرما رہے تھے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ حضرت حسنؑ بھاگتے ہوئے آئے اور دونوں ایک دوسرے کے گلے سے لپٹ گئے اس عالم میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اللہم انی احبہ فاحبہ واحب، من یحبہ (متفق علیہ)

اے اللہ! میں اس سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت فرما اور جو اس سے محبت رکھے اسے بھی اپنی محبت سے نواز۔ ایک روز حضور

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطاب فرما رہے تھے اسی دوران حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دونوں نواسے حضرت حسنؑ وحضرت حسینؑ آئے انھوں نے سرخ رنگ کی قمیض پہن رکھی تھی اور وہ چلتے چلتے لڑکھڑا رہے تھے حضور نبی اکرمؐ نے انھیں دیکھا تو منبر سے نیچے اتر کر ان کی طرف لپکے اور انھیں اٹھا کر اپنی گود میں لیا اور پھر اس حالت میں دوبارہ خطاب شروع فرمایا اس موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

صدق اللہ انما اموالکم واولادکم فتنۃ نظرت الی ھذین الصبیین یمشیان وتعثران فلم اصبر حتی قطعت حدیثی ورفعتھما (ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

اللہ نے سچ فرمایا ہے کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد ایک آزمائش ہیں۔ میں نے ان بچوں کو دیکھا کہ وہ چلتے ہوئے لڑکھڑا رہے ہیں تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا میں نے تقریر ادھوری چھوڑی اور انھیں اٹھالیا۔ پھر انسانیت نے محبت پدری کا ایک اور بےمثال مظاہرہ بھی دیکھا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سیدنا حسین علیہ السلام کو شانوں سے پکڑا ہوا ہے ان کے پاؤں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاؤں پر ہیں حضور نبی اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم انھیں جھولا جھلا رہے ہیں اور فرما رہے ہیں " اوپر اٹھو اور اوپر اٹھو " حضرت حسین علیہ السلام بڑھتے بڑھتے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینۂ اطہر پر اپنے پاؤں ٹکا دیتے ہیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے فرماتے ہیں " اپنا منہ کھولو " وہ اپنا دہن مبارک کھولتے ہیں حضور نبی اکرمؐ ان کے ہونٹوں کو چومتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں " خدایا میں اس سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کا معاملہ فرما "

ایک اور موقعہ پر جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک گلی میں سے گذر رہے تھے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حسینؑ کو اپنے ہم عمر بچوں سے کھیلتے دیکھا تو انھیں پکڑنے کے لیے لپکے حضرت حسینؑ کبھی ادھر بھاگتے کبھی اُدھر بھاگتے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کا پیچھا کر رہے ہیں تا آنکہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انھیں پکڑ لیتے ہیں انھیں گدگداتے ہیں پھر اپنا ایک دست مبارک ان کی گردن کے پیچھے اور دوسرا ان کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر انھیں چومتے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں۔

حسین منی وانا من حسین احب اللہ من احب حسینا۔

حسینؑ مجھ سے ہیں اور میں حسینؑ سے ہوں، اللہ محبت رکھے اس شخص سے جو حسینؑ سے محبت رکھے۔"

محبت کے اس بے اختیار مظاہرہ کو دیکھ کر ایک شخص کہتا ہے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے نواسے سے اس قدر پیار کرتے ہیں میں نے تو کبھی اپنے لڑکے کو بھی اس طرح نہیں چاہا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی اس بات کو پسند نہیں فرماتے اور ارشاد فرماتے ہیں " جو شفقت نہیں کرتا رحمتِ خداوندی سے محروم رہتا ہے"!

اسی نوع کی ایک روایت میں یعلی بن مرہ کہتے ہیں کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

حسینؑ منی وانا من الحسین احب اللہ من احب حسینا حسین سبط من الاسباط ہ۔

حسینؑ میرے وجود کا حصّہ ہے اور میں حسینؑ کے وجود کا حصّہ ہوں

اللہ محبت کرے اس شخص سے جو شخص محبت رکھے حسینؑ سبط پیغمبر ہے۔"

ان احادیث سے اس محبت وشفقت کا اندازہ ہوتا ہے جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی اولاد سے اور اپنے نواسوں سے تھی یہ محبت ایک جذبۂ بے اختیار ہے جسے اللہ رب العزت نے اپنے بندوں کے دلوں میں پیوست کر دیا ہے اور چونکہ پیغمبر ایک مکمل انسان اور ایک کامل و اکمل بشر ہوتا ہے اس لیے اس کے ہاں محبت کا یہ رنگ اور زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔

ان احادیث سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی آل سے صرف اپنی اور ان کی ذات کی حد تک ہی محبت نہیں نہیں تھی بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ بھی چاہتے تھے کہ دوسرے لوگ بھی ان سے محبت کا برتاؤ کریں۔

سیدہ فاطمہؑ، سیدنا علیؑ ابن ابی طالبؑ اور حضرات حسنین علیہم السلام سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے پایاں محبت کا ادراک اس پسِ منظر سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اولادِ نرینہ سے محروم رہے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمنوں کو سب سے زیادہ خوشی اسی بات کی تھی کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ان کی نسل منقطع ہو جائے گی لیکن حضورؐ کی لختِ جگر سیدہ فاطمہؑ کی شادی آغوشِ نبوت کے پروردہ علیؑ ابن ابی طالبؑ سے ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اس مقدس جوڑے کو دو نونہال عطا فرمائے اور یوں حضور نبی اکرمؐ کی ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل ہو گئی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ اور فاطمہؑ سلام

اللہ علیہا) کی اولاد کو اپنی اولاد قرار دیا انھیں اپنا بیٹا کہا اور اس سلسلۂ نسب کو اپنی ذات کی طرف منتہی فرمایا اور حقیقت یہ ہے کہ انھیں وہی پیار دیا جو ایک باپ اپنے بیٹوں کو دیتا ہے حتیٰ کہ تمام امت محمدیہ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ پوری نسلِ انسانی میں یہ اعزاز سیدہ فاطمہؑ کو حاصل ہے کہ ہر بچّہ کا نسب اس کے باپ کی طرف منسوب ہوتا ہے مگر علیؑ اور فاطمہؑ کی اولاد کا شجرۂ نسب ماں کی طرف سے شروع ہوتا ہے۔

اولاد فاطمہؑ سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی بے پناہ محبت کا اندازہ حسب ذیل واقعات سے بھی بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ایک نواسے کو اٹھائے ہوئے بازار میں سے گذرے تا آنکہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں پہنچ گئے جب حضورؐ نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو بچّہ کو اپنے قریب بٹھالیا صحابہ کو دوران نماز بڑا تعجب ہوا کہ خلاف معمول حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سجدہ بہت طویل ہوگیا جب نماز ختم ہوئی تو صحابہ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! آپؐ نے سجدہ میں اتنی دیر لگائی کہ ہم نے یہ سمجھا کہ کوئی حادثہ پیش آگیا ہے یا پھر دوران سجدہ نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے!

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا

کل ذالک لم یکن ولکن ابنی ارتحلنی فکرھت ان اعجلہ حتی یقضی حاجتہ۔

"ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی بلکہ میرا بیٹا میرے ساتھ چمٹ گیا تھا تو میں نے گوارا نہ کیا کہ میں اس کو اس کی مرضی کے بغیر ہٹانے میں جلد بازی کروں بس اس وجہ سے دیر ہوگئی۔"

آلِ عباء

حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک روز صبح سویرے اس حال میں تشریف لائے کہ آپؐ نے منقش اونی چادر سیاہ رنگ کی اوڑھ رکھی تھی اتنے میں حضرت حسنؑ آ گئے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں چادر کے اندر چھپا لیا پھر حضرت حسینؑ آئے وہ بھی چادر کے اندر چلے گئے پھر سیدہ فاطمہؑ آئیں اور وہ بھی اس چادر کو اوڑھ کر بیٹھ گئیں پھر سیدنا علیؑ آئے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں بھی اپنی چادر کے اندر بٹھا لیا اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن مقدس کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا

"اللہ تعالیٰ نے یہ طے فرما لیا ہے کہ اے اہلِ بیتؑ تمھیں ہر قسم کی آلودگی اور آلائش سے محفوظ رکھے اور طہارت و پاکیزگی سے آراستہ فرمائے۔" سعد ابن ابی وقاص بیان کرتے ہیں کہ جب آیت مباہلہ

تعالوا ندع ابنائنا وابنائکم ونسائنا ونسائکم وانفسنا وانفسکم ثم فنجعل لعنۃ اللہ علی الکذبین "

آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ ہم اپنی عورتوں کو بلاتے ہیں تم اپنی عورتوں کو بلاؤ ہم اپنے جی بلا لیتے ہیں تم اپنے جی بلا لو پھر ہم خدا سے حق و باطل کے درمیان فرق کرنے کی درخواست کرتے ہیں تاکہ جھوٹوں پر خدا کی پھٹکار ڈالیں) نازل ہوئی تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ، سیدہ فاطمہؑ اور حضرات حسنؑ و حسینؑ کو طلب کیا اور پھر بارگاہ خداوندی میں یوں دست بدعا ہوئے۔

اللھم ھولاء اھل بیتی (خدایا یہی لوگ میرے اہل بیتؑ ہیں)

(مسلم)

آلِ رسولؐ سے بغض

دُشمنانِ آلِ رسولؐ کا بغض اس درجہ متجاوز ہو چکا ہے کہ اب وہ خاندانِ نبوّت کے ان افراد کو اہلبیتؑ تسلیم کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں اور اس لفظ کا اطلاق صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں تک محدود کرنے پر اپنا سارا زورِ بیان صرف کر رہے ہیں اور اس طرح خود اپنے ہی اسلاف کی تکذیب کر رہے ہیں۔

دُور جانے کی ضرورت نہیں حدیث کا مشہور مجموعہ مشکوٰۃ المصابیح تو اہلِ سنت کے درسِ نظامی کی اہم کتاب ہے اسی کے ابواب کی ترتیب پر اگر ایک نظر ڈال لیتے تو انھیں پتہ چل جاتا کہ محدثین کا رویہ اس باب میں کیا ہے۔ صاحب مشکوٰۃ المصابیح نے جہاں "مناقب" کا باب باندھا ہے وہاں مناقب اہلِ بیتؑ" کا الگ عنوان مقرر کیا ہے اور "مناقب ازواج النبیؐ" کا علیحدہ ذکر کیا ہے۔ گویا محدثین کو بھی اس امر کا احساس تھا کہ جب لفظ "اہلِ بیت" بولا جائے تو اس سے خانوادۂ علیؑ ابن ابی طالبؑ" مراد ہے۔

خیر یہ تو ضمناً ایک بات نوکِ قلم پہ آگئی کہہ یہ رہا تھا کہ سیدہ فاطمہؑ کی اولاد سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسی والہانہ محبّت تھی کہ اگر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقیقی اولاد ہوتی تو شاید اس سے بھی اس سے زیادہ محبّت نہ ہوتی اور جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں یہ صرف ایک بشری تقاضا ہی نہ تھا بلکہ بحیثیت ایک پیغمبرؐ کے آپؐ کو ان بچوں سے جو توقعات تھیں کہ وہ آپؐ کے مشن کو دنیا میں زندہ رکھنے کے لیے ایسی معرکہ آرا خدمات سرانجام دینے والے ہیں کہ اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے احسانات کے ہمیشہ ممنون رہیں گے اور دنیائے اسلام میں ان کی خدماتِ جلیلہ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبوب شخصیتیں

اب اس سلسلہ کی بعض دوسری حدیثیں سنیے. حضرت ابوایوب انصاریؓ فرماتے ہیں.

دخلت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم والحسن والحسین یلعبان علی صدرہ فقلت یارسول اللہ اتحبھما قال کیف لا احبھما وھما ریحانتای فی الدنیا (سیرالاعلام ج ۳ ص ۱۸۹-۱۹۰)

"میں بارگاہ نبوت میں حاضر ہوا حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینہ پر چڑھ کر کھیل رہے تھے میں نے عرض کیا یارسول اللہ! آپؐ کو ان سے بہت محبت ہے؟ فرمایا ان سے محبت کیسے نہ ہو دنیا میں یہی تو میرے پھول ہیں.

حضرت عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس حال میں دیکھا کہ آپؐ نے حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کو پکڑ رکھا ہے اور فرما رہے ہیں.

هذان ابنای فمن احبهما فقد احبنی ومن ابغضهما فقد ابغضنی

(سیرالاعلام ج ۳ ص ۹-۱۸۹)

"یہ دونوں میرے بیٹے ہیں جس نے ان سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے ان سے دشمنی کی اس نے مجھ سے دشمنی کی۔

محبت کی آخری حد یہی ہے کہ محبوب کا محبوب بھی اسی طرح مرکز محبت بن جائے جس طرح خود محبوب ہے اور اس کا دشمن اپنا دشمن نظر آئے اولادِ فاطمۂ کے معاملہ میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امت سے ایسی ہی محبت کے طلب گار ہیں۔ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ ارشاد فرماتی ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کو سیدہ فاطمۂ کو اور ان کے دونوں بچوں کو اپنی چادر میں چھپالیا اور پھر ان کے حق میں یوں دعا فرمائی۔

اللهم هولاء اهلی وخاصتی اللهم اذهب عنهم الرجس وطهرهم تطهیرا۔

خداوندا یہ میرے اہل بیتؑ ہیں اور خاصۂ خاصگان ہیں، الہٰ العالمین! انھیں ہر قسم کی آلائش سے دور رکھ اور انھیں طہارت ظاہری و باطنی سے خوب آراستہ فرمادے۔ (سیرالنبلاء ج ۳ ص ۱۹۰)

یزید بن حیان کہتے ہیں، میں اور حصین بن سبرۃ اور عمرو بن مسلم تینوں مل کر حضرت زید بن ارقم کے پاس گئے جب ہم ان کی خدمت میں بیٹھ گئے تو ہم میں سے حصین بن سبرہ نے عرض کیا، جناب زید! آپ کو خیر سے حصّہ وافر عطا ہوا ہے آپ نے ان آنکھوں سے حضور سرور کائنات محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رخِ انور کی زیارت کی ہے۔ آپ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات عالیہ اپنے ان کانوں سے سنے ہیں آپ نے غزوات میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شرکت کی ہے اور آپ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ آپ نے حضور نبی اکرم کی اقتدا میں نماز ادا کی ہے. غرضیکہ آپ نے خیر کثیر سے بہرہ وافر حاصل کیا ہے اس لیے ہم حاضر ہوئے ہیں کہ آپ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات عالیہ سے ہمیں بھی محظوظ فرمائیں. حضرت زید بن ارقم نے فرمایا۔

بھتیجے! میری عمر بھی زیادہ ہوگئی ہے وقت بھی بہت بیت چکا ہے اور اب مجھے بہت سی باتیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کی ٹھیک سے یاد بھی نہیں رہی ہیں پھر بھی جو کچھ یاد ہیں وہ سنائے دیتا ہوں جو یاد نہیں رہیں ان کے بارے میں مجھے معذور سمجھو اس کے بعد حضرت زید بن ارقم گویا ہوئے۔

ایک روز حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ اور مدینہ کے مقام کے درمیان اس چشمہ کے مقام پر جسے "خم" کہتے ہیں ہمیں خطاب فرمایا. خدا کی حمد و ثنا کے بعد حضور نبی اکرم نے ہمیں پند و نصیحت کی بہت سی باتیں بتائیں اس کے بعد حضور نبی اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا.

الا ایہا الناس فانما انا بشر یوشک ان یاتی رسول ربی فاجیب وانا تارک فیکم ثقلین اولہما کتاب اللہ فیہ الہدیٰ والنور فخذوا بکتاب اللہ واستمسکوا بہ (فحث علی کتاب اللہ ورغب فیہ) ثم قال. واھل بیتی اذکرکم اللہ فی اھل بیتی اذکرکم اللہ فی اھل بیتی۔

ترجمہ: لوگو سنو! میں ایک انسان ہوں قریب ہے کہ میرے پروردگار کا نامہ بر موت کا سندیسہ لے کر آ جائے اور میں اس دعوت کو قبول کر لوں میں تمہارے اندر دو چیزیں جو نہایت بھاری بھرکم ہیں چھوڑے جا رہا ہوں پہلی چیز تو اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور اسی سے تمسک کرو۔

(حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن مقدس کی اہمیت پر بطور خاص توجہ دلائی اور اس کی اتباع پر ابھارا) پھر حضور نبی اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسری بات کا ذکر فرمایا۔ دوسری چیز، میرے اہلِ بیتؑ ہیں میں تمہیں اپنے اہلِ بیت کے معاملہ میں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں، میں تمہیں اپنے اہلِ بیت کے بارے میں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں (یہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو مرتبہ ارشاد فرمایا)

حصین بن سبرۃ نے جناب زید بن ارقم سے پوچھا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہلبیتؑ کون ہیں کیا حضور نبی اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیگمات آپؐ کے اہل بیتؑ میں شامل نہیں ہیں؟ زید بن ارقم نے فرمایا آپؐ کی بیگمات بھی آپؐ کی اہلِ بیتؑ ہیں لیکن یہاں اہلِ بیتؑ سے مراد خاندان کے وہ افراد ہیں جن پر صدقہ حرام ہے۔ حصین نے پوچھا وہ کون لوگ ہیں؟ زید بن ارقم نے کہا اہل بیتؑ سے مراد حضرت علیؑ کی اولاد حضرت جعفرؑ اور عقیلؑ بن ابی طالبؑ کی اولاد اور حضرت عباسؑ کی اولاد ہے پھر انھوں نے کہا۔ یہ سب وہ اہلِ بیتؑ ہیں جن پر صدقہ حرام ہے۔ (مسلم)

ایک اعتراض اور اس کا جواب

اس حدیث میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اہل بیتؑ کے بارے میں دو مرتبہ بطور خاص تنبیہہ فرمائی ہے اس پر ناسمجھ لوگ یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اپنے اہل بیتؑ کی پاسداری اور ان کی رعایت ملحوظ رکھنے کی یہ تاکید پیغمبرانہ مقام کی عظمت کے منافی ہے اور ایسی تمام روایتیں موضوع ہیں کیونکہ ان روایات سے پیغمبرؐ پر خویش پروری اور اقربا نوازی کا الزام عاید ہوتا ہے۔

لیکن حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس پس منظر میں اس قسم کی ہدایت فرمائی ہے اگر اسے پیش نظر رکھا جائے تو ایسے تمام اعتراضات لایعنی اور مہمل قرار پاتے ہیں۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ایک ایسے ماحول میں ہوئی جہاں قبائلی نظام اپنی پوری عصبیتوں کے ساتھ تھا نبوت و رسالت ایک موہبت خداوندی اور ایک عطیۂ الٰہی ہے یہ کسی فرد کی ذاتی کاوش یا خاندانی جدوجہد کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ نہ یہ کسی انسان کے پہلے سے سوچے

ہونے منصوبہ کا کوئی حصہ ہوتی ہے۔ اللہ رب العزت کو یہی منظور تھا کہ خانوادۂ بنو ہاشم کے ایک فرد فرید کو نبوت و رسالت کا یہ لازوال اعزاز نصیب ہو حکمت خداوندی کے اس اقتضاء میں نہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارادے کو دخل تھا نہ آپؐ کی خواہش کو ارشاد ربانی ہے

اللہ یصطفی من الملائکۃ رسلا ومن الناس ان اللہ سمیع بصیر۔

اللہ تعالےٰ ملائکہ میں سے اور انسانوں میں سے پیغمبروں کا انتخاب فرماتا ہے۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوا۔

اللہ یعلم حیث یجعل رسالتہ (اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کے لیے کسے منتخب فرمارہا ہے)

قبائلی زندگی میں کسی ایک قبیلہ کا کسی خاص اعزاز سے متصف ہونا یقینا حسد و رشک کا باعث بنتا ہے۔ قرآن مقدس کے چھٹے پارے میں آدمؑ کے دو بیٹوں کے درمیان رقابت کا تذکرہ کیا گیا ہے دونوں نے خدا کے حضور اپنی اپنی قربانیاں پیش کیں ایک کی قربانی قبول کرلی گئی اور دوسرے کی مسترد، جس کی قربانی آسمانی فیصلہ کے تحت رد کردی گئی تھی اس نے اپنے بھائی کو صرف اس ناکردہ گناہی میں قتل کردیا کہ خدا کی بارگاہ میں اس کا نذرانۂ عقیدت شرف قبول سے کیوں نوازا گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاملہ میں بھی یہی صورت حال رونما ہوئی اور عرب کے دوسرے قبیلے خانوادۂ بنو ہاشم سے جلنے لگے سیاسی غلبہ سے قبل بھی قبائل عرب کو خاندان بنو ہاشم سے شدید رقابت تھی لیکن جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سیاسی غلبہ حاصل ہو گیا

تو یہ رقابت قبائلی عصبیت سے بڑھ کر کھلی دشمنی کی صورت اختیار کر گئی اس دشمنی میں جو قبیلے پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف پیش پیش تھے ان میں بنو امیہ، بنی مغیرہ اور بنی مخزوم کے قبائل کے نام برخاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اور اس کا اظہار خود زبان نبوتؐ سے بھی ہوا یہ تینوں قبیلے اور ان کے زیرِ اثر حلیف قبائل بربنائے حسد خاندانِ نبوتؐ سے خار کھاتے اور انھیں مبغوض سمجھتے تھے اس کی شکایت ایک مرتبہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا محترم عباسؓ نے بھی ذیل کی حدیث سے اس کی توثیق ہوئی ہے۔

عن عبد المطلب بن ربیعہ ان العباس دخل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مغضبا وانا عندہ فقال ما اغضبک؟ قال یارسول اللہ: ما لنا وا لقریش اذا تلاقوا بینھم تلاقوا بوجوہ مبشرۃ واذا لقونا لقونا بغیر ذلک فغضب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حتی احمر وجھہٗ ثم قال والذی نفس بیدہ لا یدخل قلب رجل الایمان حتی یحبکم للہ ولرسولہ ثم قال ایھا الناس من آذی عمی فقد آذانی فانما عم الرجل صنو ابیہ (ترمذی)

عبد المطلب بن ربیعہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عباسؓ بن عبد المطلبؓ غصہ کے عالم میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ میں اس وقت وہاں موجود تھا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا برہمیٔ مزاج کا سبب کیا ہے! حضرت عباسؓ کہنے لگے۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ قریش ہمارے ساتھ کیسا برتاؤ کر رہے ہیں۔ جب آپس میں ملتے ہیں تو ہنستے مسکراتے چہروں کے ساتھ

اور جب ہمیں دیکھتے ہیں اور ہم سے ملتے ہیں تو نہایت روکھے پھیکے انداز میں سن کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غضبناک ہو گئے اور خود غضب سے آپؐ کا چہرہ سرخ ہو گیا پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ ایمان کسی شخص کے دل میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ تم سے اللہ کے لیے اور اللہ کے رسولؐ کی خوشنودی کی خاطر محبت نہ رکھے پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ لوگو! جس نے میرے چچا کو تکلیف پہونچائی اس نے مجھے دکھ دیا کیونکہ آدمی کا چچا اس کے باپ کی جگہ ہوتا ہے۔" حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کو بھی اس کا شکوہ تھا جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے وہ فرماتے ہیں۔

شکوت الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حسد الناس لی فقال اما ترضیٰ ان تکون رابعۃ اربعۃ اول من یدخل الجنۃ انا وانت والحسن والحسین وازواجنا عن ایماننا وشمائلنا وذریتنا خلف ازواجنا۔

"میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بات کا گلہ کیا کہ لوگ مجھ سے حسد کرتے ہیں اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ کیا تمہیں اس حسد کے مقابلے میں یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ تم ان چار آدمیوں میں سے ایک ہو جو سب سے پہلے جنت میں جائیں گے۔ ایک میں ہوں تم ہو تمہارے بیٹے حسنؑ اور حسینؑ اور ہماری بیویاں اور ان کی اولاد جو ہمارے داہنے بائیں اور پیچھے ہوں گی۔"

قبیلہ بنو ہاشم سے دوسرے قبائل عرب کی برہمی کا ایک بڑا سبب یہ بھی

تھا کہ ظہور اسلام کے ابتدائی دور میں اور عہد نبوت کے آغاز میں یہ قبیلہ بنو ہاشم کے سورماؤں کا دبدبہ تھا کہ سرداران قریش حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے راستے سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔

حضرت سیدنا ابوطالبؑ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عم محترم جن کے بارے میں ٹکے ٹکے کے ضمیر فروش ملّا کفر کے فتوے لگاتے ہیں۔ اور جنھیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسا کرتے ہوئے ذرہ بھر شرم محسوس نہیں ہوتی ان کا واقعہ تو مشہور ہے کہ جب زعمار قریش نے ان سے آکر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شکایت کی اور مطالبہ کیا کہ اپنے اس بھتیجے کو روکیں جو ایک نئے دین کی تبلیغ کے نام پر ہمارے آبار واجداد کو بیوقوف گردانتا اور ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے" تو حضرت ابوطالبؑ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بلایا اور ان سے فرمایا۔

یاابن اخی! ان قومك قد جاؤنی فقالوا کذا وکذا الذی قالوالہ فابق علیّ وعلی نفسك ولا تحملنی من الامر ما لا اطیق قال فظن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہ قد بدا لعمہ فیہ بدوانہ خاذلہ ومسلمہ وانہ قد ضعف عن نصرتہ والقیام معہ قال فقال لہ رسول اللہ صلی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، یا عم! واللہ لو وضعوا الشمس فی یمینی والقمر فی یساری علی ان اترک ھذا الامر حتی یظھرہ اللہ او اھلك فیہ ما ترکتہ"

قال ثم استعبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فبکی ثم قام فلما ولی ناداہ ابوطالب فقال اقبل یا ابن اخی فاقبل

علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و الہ وسلم فقال اذھب یا ابن اخی فقل ما احبت فو اللہ لا اسلمنک لشیٔ ابدا (البدایۃ والمنھاج ص۴۵)

"بھتیجے! تیری قوم کے لوگ میرے پاس آئے تھے اور انھوں نے مجھ سے یہ کچھ کہا اور وہ ساری بات دہرائی جو ان لوگوں نے آپ کے بارے میں ان سے کی تھی) اس لیے تم مجھ پر بھی رحم کرو اور اپنی جان پر بھی اور مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جس کا اٹھانا میرے بس سے باہر ہو۔ راوی کہتا ہے حضرت ابوطالبؑ کی اس بات سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ گمان گزرا کہ اب ان کے چچا کا یہ ارادہ ہوا ہے کہ وہ انھیں تنہا چھوڑ دیں اور دشمنوں کے حوالے کردیں اور اب وہ ان کی حمایت میں ڈھیلے پڑ گئے ہیں اور ان کی پشت پناہی سے گریز کر رہے ہیں۔ راوی کہتا ہے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عم گرامی سے مخاطب ہو کر عرض کیا

عم محترم! اللہ قسم! اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج رکھ دیں اور بائیں ہاتھ میں چاند کہ میں اس دعوتِ اسلام کو ترک کردوں تو یہ ممکن نہیں دو ہی صورتیں ہیں یا اللہ اس مشن کو غالب فرمادے یا پھر میں اس راہ میں ہلاک ہوجاؤں لیکن میں اس مشن کو ترک نہیں کروں گا۔ راوی بیان فرماتا ہے یہ کہہ کر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جی بھر آیا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جی بھر آیا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رو پڑے اور اٹھ کھڑے ہوئے جب وہاں سے چلنے لگے تو حضرت ابو طالبؑ نے فرمایا۔ بھتیجے! ادھر سنو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی طرف متوجہ ہوئے تب ابو طالبؑ نے فرمایا۔ بھتیجے! جاؤ جو کچھ تم کہنا چاہتے ہو بے دریغ اور بلا جھجک کہو اللہ کی قسم تمہیں ذرہ بھر گزند بھی نہیں پہنچنے دوں گا۔"

قبیلۂ بنو ہاشم کے وہ افراد بھی جو اسلام نہیں لائے تھے بربنائے...
عصبیت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت ونصرت کو اپنا فرض سمجھتے تھے سوائے ایک ابولہبؑ کے جس نے اپنی بیوی کے دباؤ میں آکر جو ابو سفیان کی بہن تھی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا باقی سب ہاشمی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے لڑتے مرنے کے لیے تیار رہتے تھے حضرت حمزہؓ کا قبول اسلام بھی اسی قسم کے ایک واقعہ کا ردّعمل تھا جب ابوجہلؑ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں بدزبانی کی تو حضرت حمزہؓ جو ابھی تک مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے ابوجہلؑ کی اس زیادتی کو برداشت نہ کرسکے اور بھری مجلس میں ابوجہلؑ کی پٹائی کردی اور آکر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا کہ بھتیجے! میں نے ابوجہلؑ سے تمہارا انتقام لے لیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا" مجھے اس کی کوئی خوشی نہیں ہوئی ہاں البتہ اگر تم مسلمان ہوجاؤ تو یہ ایک خوش کن اور خوش آیند بات ہوگی۔"

اس واقعہ سے بہ خوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی ذات کے لیے کسی انتقام کے خواہش مند نہ تھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صرف یہی ایک لگن تھی کہ ان کے قبیلے کے لوگ بھی اور دوسرے قبائل سے تعلق رکھنے والے بھی توحید الٰہی کی اس دعوت کو قبول کریں جسے وہ لے کر اٹھے ہیں۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس غیر متعصبانہ روش کے سراسر برعکس قبائل قریش تعصب کی جس روش پر گامزن تھے اس کا ایک ادنیٰ مظاہرہ شعب ابوطالبؑ میں تین برس تک مسلمانوں کا محصور رہنا تھا اس پورے عرصہ میں قبائل قریش نے مسلمانوں بالخصوص قبیلۂ بنو ہاشم کا مکمل

سوشل بائی کاٹ کئے رکھا حضرت ابوطالبؑ بھی آزمائش کی اس سخت گھڑی میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے۔

بہر حال قبیلۂ بنو ہاشم کا ہر فرد ابولہب کو چھوڑ کر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہر مشکل وقت میں آپؐ کا ساتھ دیتا رہا اور اس طرح اسلام دشمن قبیلوں کو اپنے مقاصد میں ناکامی ہوتی رہی اور اسی لیے قبائل قریش بنو ہاشم کے در پے آزار رہتے تھے۔ بنو ہاشم کی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غیر مشروط نصرت وحمایت حاصل تھی اس کا ایک واضح ثبوت بیعت عقبۂ ثانیہ کے موقعہ پر حضرت عباسؓ بن عبدالمطلبؑ کی انصار مدینہ سے ملاقات تھی۔ حضرت عباسؓ اس وقت تک اگرچہ مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن انھوں نے انصار مدینہ سے اِمر کی ضمانت طلب کی تھی کہ مدینہ میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی۔

مدینہ منورہ میں بھی دیگر قبائل قریش کے مسلمان افراد سے کہیں زیادہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست وبازو بننے کا شرف یا تو بنو ہاشم کو حاصل تھا یا پھر گروہ انصار کے جیالے جوان تھے۔

حضرت حمزہؓ، حضرت علیؑ اور حضرت عبیدہؓ ابن حارث جنھوں نے جنگِ بدر میں مبارزت کے پہلے معرکہ میں دادِ شجاعت دی حضور ہی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

جنگِ بدر میں حضرت حمزہؓ کی تیغ خارا شگاف نے عرب کے ایک نامور سردار عتبہؔ ابن ربیعہ کو کیفر کردار تک پہونچایا حضرت علیؑ نے عتبہؔ کے بھائی اور بیٹے کو جہنم واصل کیا یہ عتبہؔ معاویہ کا نانا یعنی اس کی ماں ہندہؔ کا باپ تھا ولیدؔ ہندہ

کا بھائی اور شیبہ اس کا چچا تھا۔

ہندہ نے اپنے باپ کا انتقام جنگِ اُحد میں اس وحشیانہ طریق پر لیا کہ حضرت حمزہؑ کی شہادت کے بعد ان کے مقدس جسم کا مثلہ کیا، ان کا خون پیا، ان کا کلیجہ چبایا اُن کے اعضائے رئیسہ کا ہار بنا کر گلے میں ڈالا۔

لعنہا اللہ وبعلہا وبنیہا۔

ڈھول کا پول

آج جن صحابہ کی نام نہاد عظمت کا ڈنکا بجایا جا رہا ہے، جن کی فضیلت کی داستانیں منبر و محراب سے دنیا کو سنائی جا رہی ہیں اور جنھیں افضل البشر بعد الانبیاء (پیغمبروں کے بعد انسانوں سے افضل) کے خود ساختہ خطابات دیے جا رہے ہیں اور لو کان بعدی نبیا لکان عمر (میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتا) کے من گھڑت افسانے بیان کئے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کسی کا نام بھی کسی جنگ میں نبرد آزما کی حیثیت سے تاریخ میں مذکور نہیں ہے نہ ابو بکر کا نہ عمر کا نہ عثمان کا بلکہ خلیفۂ دوم اور خلیفۂ سوم کے متعلق تو تاریخ کی صریح شہادت ہے کہ غزوۂ احد میں فرار ہو جانے والوں میں اور میدانِ جنگ سے بھاگنے والوں میں یہ دونوں بزرگ بھی شامل تھے۔

جنگ کا سارا بوجھ تو سیدنا علیؑ کے کاندھوں پر تھا یا پھر گنتی کے چند مہاجر اور بیشتر انصار تھے جو فدا کاری اور جاں نثاری کے جذبہ کے ساتھ

ہر معرکہ میں حصّہ لیتے تھے اہل سنت کی کسی ایک معتبر یا غیر معتبر کتاب میں خلفائے ثلاثہ کی نبرد آزمائی اور جنگ جوئی کا کوئی واقعہ نہیں ملتا غزوہ خندق میں جب عرب کا ایک سورما گھوڑے کو ایڑ لگاکر خندق کے اس پار آگیا اور مسلمانوں کو مقابلہ کے لیے للکارا تو بارگاہِ نبوت میں اس وقت ابوبکر بھی موجود تھے اور عمر بھی لیکن اس للکار کا جواب صرف اور سیدنا علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام نے دیا کسی دوسرے صحابی نے مقابلہ پر آمادگی کا اشارتاً بھی کوئی ذکر کیا ہو تو اس کا نام پیش کیا جائے اور بالآخر ضرب حیدری ہی نے اس دشمنِ خدا اور رسولؐ کا کام تمام کیا کسی اور کو یہ سعادت نہیں ہوئی کہ ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند۔

غزوۂ خیبر کے معرکہ میں ابوبکر و عمر دونوں کا نام آتا ہے مگر اس صراحت کے ساتھ کہ انھیں فتح خیبر کے لیے بھیجا گیا مگر یہ دونوں بزرگ ناکام لوٹے تب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لاعطین الرایۃ غدا رجلا یحب اللہ ورسولہ ویحبہ اللہ ورسولہ کرار غیر فرار لا یرجع حتی یفتح اللہ علی یدیہ

"کل میں جھنڈا ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرنے والا ہے اور اللہ اور رسولؐ کو بھی اس سے محبت ہے۔ جو زوردار حملہ کرنے والا ہے میدان چھوڑ کر بھاگ نکلنے والا نہیں وہ اس وقت تک واپس نہیں لوٹے گا جب تک اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں مسلمانوں کو فتح نصیب نہ کردے۔ چنانچہ قرعۂ فال سیدنا علی ابن ابی طالب علیہما السلام کے نام پڑا اور خیبر کا معرکہ انہی کی دلاوری اور بے مثال شجاعت سے فتح ہوا۔

سوال یہ ہے کہ وہ ساری جنگیں جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قیادت میں لڑی گئیں اور جن میں حضرت علی علیہ السلام نے داد شجاعت دی کیا وہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذاتی اقتدار کے لیے یا خاندان بنو ہاشم کی بالادستی کے لیے لڑی گئیں اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر ساری محبت ہی ختم ہو جاتی ہے اور کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی اس صورت میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان قبیلۂ بنو ہاشم سے قبائل قریش کی دشمنی سمجھ میں آسکتی تھی. لیکن اگر یہ حق و باطل کی جنگ تھی اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے یا اپنے خاندان کے اقتدار کی جنگ نہیں لڑ رہے تھے بلکہ توحید خداوندی کی تبلیغ و اشاعت اور دین اسلام کی سربلندی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مطمع نظر تھی تو وہ قبائل جو طوعاً یا کرہاً حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تھے ان کے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان سے دشمنی کا کیا جواز تھا.

لیکن آج جن لوگوں کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت قریبی اور قابل اعتماد ساتھی ثابت کرنے پر سارا زورِ بیان صرف کیا جا رہا ہے اور جن کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اس امت کی باگ ڈور پر قبضہ کرنے کا موقعہ کیا ملا یہ ان کی اخلاقی ذمہ داری نہیں تھی کہ وہ کم از کم ایسے افراد کو امت پر مسلط نہ کریں جن کی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خاندانی دشمنی ڈھکی چھپی نہیں تھی.

ابوسفیانؓ کا خاندان بنو ہاشم کا زبردست رقیب تھا اور یہ کشمکش بہت پہلے سے چلی آرہی تھی جب اللہ رب العزت نے بنو ہاشم کو نبوت و رسالت کے اعزاز سے نوازا تو اس رقابت نے بڑھ کر عداوت کی شکل اختیار کرلی. حضور نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کو زک پہنچانے میں اس بد باطن شخص نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا جب اسلام ایک غالب قوت بن کر ابھرا اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تو یہ دشمن خدا اور رسولؐ بادلِ ناخواستہ مسلمان ہو گیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ابوسفیانؓ نے اپنے قبول اسلام کا ڈھونگ رچانے کے باوجود اس بات کو کبھی فراموش نہیں کیا کہ اس کو اس کے حریف قبیلہ نے بساط سیاست پر ایسی شکست فاش دی ہے کہ جب تک وہ اس کا بدلہ نہیں لے لیگا اسے کسی کل چین نہیں پڑے گا چنانچہ یہ اسی کی درپردہ سازش کا ایک روپ تھا کہ ابوبکر و عمر دونوں نے پیغمبر علیہ وآلہ والصلوٰۃ والسلام کے بعد خانوادۂ بنو ہاشم کو رسوا کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

اور اس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ پیش گوئی لفظ بہ لفظ پوری ہوئی جو آپؐ نے سیدنا علیؓ کرم اللہ وجہہ سے مخاطب ہو کر فرمائی تھی کہ

ضغائن فی صدور الاقوام لا یبدونہا لک الا من بعدی

(کنز الاعمال ج ۶ ص ۴۰۸۔ ریاض المنظرہ محب الطبری ج ۲ ص ۲۱۰)

"لوگوں کے دلوں میں تمہارے خلاف جو بغض و عناد اور کینہ و پیکار کے جذبات پنہاں ہیں میرے دنیا سے جانے کے بعد وہ لوگ اس کا اظہار کریں گے۔"

حضرت سیدنا علی علیہ السلام کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد جس صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا اور یہ سلسلہ آپؑ کی نسلوں تک ممتد ہوا تو اس کی بڑی وجہ بھی وہی بغض و حسد تھا جو شتر کینہ رکھنے والی عرب قوم کی طینت بن چکا تھا لیکن اس کے ذمہ دار نہ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم تھے نہ آپؐ کے خاندان کا کوئی دوسرا فرد، دینِ اسلام کی نشرواشاعت کے لیے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو جدّوجہد فرمائی اور اس راہ میں سیدنا علیؑ نے جو گراں قدر خدمات سرانجام دیں اس کا مقصد بنو ہاشم کے اقتدار کی راہ ہموار کرنا نہیں تھا بلکہ ایک بگڑے ہوئے معاشرہ کی اصلاح اور ایک زبوں حال قوم کی درستگی مقصود تھی اور اس راہ میں جو قوتیں مزاحم ہو رہی تھیں ان کی سرکوبی ایک قدرتی عمل تھا جس کے بغیر چارۂ کار نہیں تھا۔

بنابریں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے اہل بیت بالخصوص سیدنا علی علیہ السلام کے معاملہ میں حساس ہونا خویش پرور اور اقربا نوازی کا معاملہ نہیں تھا کیونکہ اگر یہ خویش پروری تھی تو تمام انبیاء علیہم السلام کے ہاں اس کا معمول تھا آخر کیا ابراہیم علیہ السلام کے دونوں بیٹے اسمٰعیل اور اسحٰاق علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام کے بیٹے یعقوب علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کے بیٹے یوسف علیہ السلام کی نبوت خویش پروری اور اقربا نوازی پر محمول کی جائے گی؟

اللہ رب العزت کی سنت اور یہ اس کا طریق کار رہا کہ اگر پیغمبر کی اولاد یا اس کا قریبی کوئی رشتہ دار خدا کی مشن کا وفادار اور مقصد نبوت اور رسالت کی امانت کا اہل تھا تو اسے دوسروں پر ترجیح دی گئی۔ سیدنا علی علیہ السلام کی پوری زندگی اس امر کی آئینہ دار ہے کہ اسلام ان کی فطرت کا خمیر بن چکا تھا۔ سیدنا علیؑ نے ایک موقعہ پر اپنی اس کیفیت کا اظہار ان لفظوں میں فرمایا تھا۔

"واللہ لو اعطیت الاقالیم السبعۃ بما تحت افلاکہا علی ان اعصی

اللہ فی نملۃ اسلبہا جلب شعیرۃ ما فعلتہ وان دنیاکم عندی اھون من ورقۃ فی فم جرادۃ تقضمھا ما لعلی ولنعیم یفنی ولذۃ لا تبقی

"بخدا اگر مجھے ہفت اقلیم کی سلطنت آسمانوں کی بادشاہت کے ساتھ پیش کی جائے اور اس کے عوض مجھ سے یہ توقع رکھی جائے کہ میں اللہ تعالیٰ کی اتنی سی نافرمانی کروں کہ چیونٹی کے منہ سے اس کا نوالہ چھین لوں تو میں ایسا نہیں کروں گا اور یہ تمہاری دنیا میرے نزدیک ٹڈی کے منہ کے اس پتہ سے بھی زیادہ حقیر ہے جسے وہ چبا رہی ہو دنیا کی مٹ جانے والی نعمتوں اور ناپائیدار لذتوں سے علی ابن ابی طالبؑ کا کیا واسطہ"

جس شخص کے دل کی یہ کیفیت ہو، جو پروردۂ آغوش نبوت ہو، جو ہر معرکہ حق و باطل میں حق کے لیے نبرد آزما رہا ہو جو اپنے اقران و اماثل میں دین حق کی سربلندی کے لیے ہر جنگ میں اپنی جان ہتھیلی پر لے کر بے دریغ نکل پڑا ہو اسے اگر یہ شرف بھی حاصل ہو کہ وہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ابن عم، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کا فرد فرید اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اکلوتی بیٹی کا شوہر ہو تو کم از کم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کا دم بھرنے والوں پر فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ ہر معاملہ میں اسی کی ذات کو فوقیت دیں اور اس پر کسی ایرے غیرے کو ترجیح نہ دیں۔ لیکن اہل سنت کی منطق نرالی ہے وہ اسے پیغمبرؐ کی خویش پروری اور اقربا نوازی پر محمول کرتے ہوئے ذرا سا خوف خدا اور پیغمبر کی شرم ملحوظ نہیں رکھتے۔

شاہ اسمٰعیل کی شہادت

شاہ اسمٰعیل شہید دہلوی جو خاندان ولی اللّٰہی کے چشم و چراغ تھے انھوں نے "منصب امامت" نامی ایک کتاب تالیف کی ہے۔ شاہ صاحب کی شخصیت اہلِ سُنّت ہی کے دو طبقوں میں سخت متنازعہ فیہ رہی ہے دونوں حضرات انھیں دشمنِ رسولؐ اور وہابی قرار دیتے ہیں جب کہ دیوبندی اور اہلِ حدیث انھیں اپنا ایک حقیقی مذہبی پیشوا مانتے ہیں وہ اپنی توحید کے تجریدی تصور کے باوجود اور کٹر وہابیت کے باوصف یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد منصب امامت پر سیدنا علی ابن ابی طالب فائز ہوئے اور اس کا اظہار انھوں نے اپنی محولہ بالا کتاب میں ایک جگہ نہیں کئی جگہ کیا ہے نبی اور امام کے فرائض منصبی کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ ایک جگہ رقمطراز ہیں۔

نبی اور اس کے (امام کے) درمیان سوائے منصب نبوت اور کوئی فرق نہیں جیسا کہ حضرت علیؑ کے حق میں فرمایا "انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی" (تم میرے لیے وہی حیثیت رکھتے

ہو جو موسیٰ کے لیے ہارون تھے الا یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا)

(منصب امامت صہ ۱۰۳)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں

"اسی طرح امام کو بھی دنیا و آخرت میں اس ریاست کے مانند مبعوث الیہم (یعنی جن کی طرف پیغمبر مبعوث ہوا ہے) سے نسبت ثابت ہے۔ چنانچہ ارشاد نبوی ہے۔

الستم تعلمون انی اولی بالمومنین من انفسھم قالوا بلیٰ فقال اللھم من کنت مولاہ فعلی مولاہ (کیا تم نہیں جانتے کہ اہل ایمان پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتا ہوں؟ صحابہ نے اثبات میں جواب دیا اس پر حضور نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا۔ خداوندا میں جس کا مولا ہوں علیؑ بھی اس کے مولا ہیں (منصب امامت صہ ۱۲۹)

یہ ولایت علیؑ جس کا اس زوردار لہجہ میں پیغمبرؐ اعلان فرما رہا ہے تعجب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ اس کے مفہوم سے آشنا ہی نہ ہو سکے اور اگر وہ اس کے مفہوم سے آشنا تھے تو انھوں نے اس کے مقتضیٰ پر عمل گریز کیوں کیا اس کے جواب کی ذمہ داری اہل سنت پر عاید ہوتی ہے لیکن وہ اس کا جواب دینے کی بجائے کبھی لفظ "مولیٰ" کی لغوی تشریح و تحقیق کا قصہ چھیڑ دیتے ہیں اور کہیں ابوبکر و عمر کی خلافت کے متعلق سراسر وضعی اور جعلی حدیثیں پیش کر کے غلط مبحث کرنے لگتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ یہاں "منصب امامت" میں سے ایک اقتباس پیش کر دیا جائے۔

شاہ اسمٰعیل شہید دہلوی لکھتے ہیں۔ (مناصب امامت صہ ۱۲۵)

"امامت ظل رسالت ہے بنا، اس کی اظہار پر ہے نہ کہ اخفار پر برخلاف

ولایت کے پس جیسا کہ منازل وجاہت اور مقامات کا دعویٰ اور معاملات ربانی وکشف اسرار روحانی کا بیان ارباب ولایت کے حق میں مظنۂ سلب وزوال ہے۔ اسی طرح ان کے حق میں ترقی و کمال کا باعث ہے وہ کلمات جو فخر کے اقسام سے آئمہ ہدیٰ سے ظاہر ہوئے جیسا کہ حضرت امیرالمومنین حضرت علیؑ مرتضیٰ سے منقول ہے۔

"انا الصدیق الاکبر لا یقولہا بعدی الا کذاب وانا القرآن الناطق

(میں صدیق اکبر ہوں میرے بعد کسی اور کا خود کو صدیق اکبر کہنا اس کے کذاب ہونے کی دلیل ہے۔ اور میں قرآن ناطق ہوں)

گویا سیدنا علیؑ ابن ابی طالب کرم اللہ تعالےٰ وجہہ الکریم کی امامت کے بارے میں امت میں کبھی دو رائیں نہیں رہیں اور تمام فرقوں کا اس پر اجماع ہے کہ منصب امامت حضرت علی علیہ السلام کا استحقاق ہے اسے اگر قاسم نانوتوی اور اسمٰعیل شہید دہلوی تسلیم کرتے ہیں تو صحابہ کے گروہ کو بھی اس کا ادراک تھا لیکن برا ہو سیاسی جوڑ اور لادین سیاپے اور ہوس اقتدار کا جس نے دشمنان اسلام کے ساتھ ملی بھگت کر کے حضرت علیؑ کو ان کے اس جائز حق سے محروم کر دیا۔

خدرا اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

میں نے اس سے قبل اپنی کتاب "سیدنا علی ابن ابی طالبؑ اور انکے سیاسی حریف" میں تاریخ کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

"تاریخ کے بارے میں ایک بات خاص طور پر ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ مورّخ ہماری آپ کی طرح کے ہوتے ہیں ان کے بھی اپنے مخصوص رجحانات و میلانات ہوتے ہیں اور کسی خاص واقعہ کے بارے میں ان کا تاثر ایک عام آدمی کے تاثر سے چنداں مختلف نہیں ہوتا اس لیے مورخ کی ہر بات کو نوشتۂ آسمانی سمجھ کر اور اسے حرفِ آخر کی حیثیت دے دینا معقول اور مناسب طریقہ نہیں ہے مصلحت کا تقاضا بھی ایک ناگزیر امر ہے جس کو ہر شخص کسی نہ کسی حد تک ملحوظ رکھتا ہے اور مورخ اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا جان سب کو پیاری ہوتی ہے اور پیٹ ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا ہے۔"

آج جب اسلامی تاریخ کے حسن و قبح پر صورت حال زیادہ واضح نظر آتی ہے اور حقائق زیادہ کھل کر سامنے آرہے ہیں تو میں سوچتا ہوں کہ خلیفہ

اول و دوم و سوم اور ان کے حاشیہ برداروں اور معاویہؓ بن ابی سفیان اور اس کے مشورہ کاروں، عمروؓ بن العاص اور مغیرہؓ بن شعبہ، یزیدؔ اور اس کے بدنہاد ساتھیوں اور اسی قماش کے دوسرے ظلم پیشہ حکمرانوں کو اگر یہ علم ہوتا کہ وہ اپنی ذاتی اغراض کی خاطر جو کچھ کر رہے ہیں وہ تاریخ کا حصّہ بن جائے گا اور انھیں تاریخ کی اس خود کار قوت کا بہ خوبی ادراک ہوتا جو تہ در تہ چھپی ہوئی کارستانیوں کو پاتال سے ڈھونڈ نکالتی ہے تو شاید ان سے وہ حرکتیں سرزد نہ ہوتیں جن سے نہ صرف ان کے اپنے دامن داغدار ہیں بلکہ اسلامی تاریخ کا چہرہ بھی شرمسار ہے۔ شاعر نے سچ کہا ہے ؎

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

یہ فطرت ہی کی تعزیر کا ایک روپ ہے کہ پچھلے چودہ سو برس سے ایک ایسا مستقل فرقہ اسلامی تاریخ کے ہر دور میں موجود رہا ہے جو چودہ سو برس پہلے روا رکھی گئی دھاندلیوں کے خلاف اس شدّت کے ساتھ سراپا احتجاج بنا ہوا ہے کہ جبر کا کوئی ہاتھ اس کو مہر بہ لب کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

چودہ سو برس کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے صدہا بندگانِ حق ہیں جو سراپا نالہ و شیون اور آہ و فغاں بنے ہوئے ہیں اور جب تک یہ دھرتی قائم ہے ان کی صدائے احتجاج بلند ہوتی رہے گی اور آئندہ نسلیں ان اعمال رذیلہ پر جو جانشینانِ رسولؐ سے سرزد ہوئے مواخذہ و احتساب کرتی رہیں گی اور ان عام نام نہاد اصحابِ رسولؐ و تابعین کی اسلام دشمنی اور پیغمبرؐ کی ایذا رسانی کے گھناؤنے جرائم پر نفرت و بیزاری کا اظہار ہوتا رہے گا۔

اس سے بڑھ کر تاریخ کا انتقام اور کیا ہو سکتا ہے کہ "مقدس شخصیتوں" کے دامن تقدس کو چاک کرنے کے لیے کروڑوں کی تعداد میں لوگ موجود ہیں

اور ان کی تعداد میں روز بہ روز اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ انسانوں کا ایک جمِ غفیر ہے جو سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں بالعموم اور ناانصافی کے معین ایام میں بالخصوص ظلم و ناانصافی، بے مروتی، احسان ناشناسی اور حق تلفی کے واقعات پر اپنے رنج و غم کا برملا اظہار کرتا ہے اور جبر و استبداد کی اس واردات پر علانیہ نفرین بھیجتا ہے جو "خیر القرون" میں ایسی مقدس شخصیتوں کے ہاتھوں عمل میں آئی جنھیں ملائکہ و انبیاء کا ہم مرتبہ قرار دیا جاتا ہے۔ دنیا کی کسی بڑی یا چھوٹی، نئی یا پرانی، قوم میں برائی کے خلاف نفرت کا ایسا بھرپور مظاہرہ نہیں ہوا جیسا کہ مسلمان قوم نے اس روایت کو قائم کیا اور برقرار رکھا۔

عاشورہ محرم کے دس دنوں پر ہی منحصر نہیں سال میں کتنے ہی ایسے مواقع بار بار آتے ہیں جب محبان اہل بیتؑ دنیا کے ہر حصہ میں "الا لعنۃ اللہ علی الظالمین" کی آیت قرآنی کا اس کثرت اور شدت کے ساتھ تکرار کرتے ہیں کہ ظالموں کی متعفن لاشیں ان کی قبروں میں تڑپ تڑپ اٹھتی ہیں۔

ظلم کہاں نہیں ہوا، ناانصافی کس قوم نے نہیں کی جرائم کا ارتکاب کس معاشرہ میں ختم ہوا ہے لیکن ظلم، ناانصافی اور ارتکاب جرائم پر لعنت و ملامت کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ مسلمان قوم کی وہ شاندار روایت ہے جس پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔

آج کچھ لوگ سینہ کوبی اور ماتم کی اس رسم خوش آیند پر چیں بہ جبیں ہوتے ہیں لیکن ظلم و استبداد، جور و ستم اور جبر و تشدد کے خلاف نفرت کے اظہار کی ہر صورت اور احتجاج کی ہر حرکت مستحق تحسین ہے۔

کسی اچھی روایت اور کسی خوب صورت رسم کو تمثیل کے رنگ میں زندہ رکھنا شریعت اسلامیہ کی خصوصیات میں سے ہے ـــــ وہ

"تماثیل" کا قائل نہیں ہے مگر "تمثیل" اس کی عبادات و اعمال کا لازمی حصّہ ہے اور اہل علم سے وہ فرق مخفی نہیں ہے جو "تمثال" اور "تمثیل" کے مابین پایا جاتا ہے۔

تمثیل عینِ اسلام ہے

ایک بے آسرا اور تنہا عورت ایک صحرائے بے آب میں اپنی گود کے بچہ کی پیاس بجھانے کی خاطر ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ کی جانب دوڑتی ہوئی جاتی ہے پھر واپس پلٹتی ہے پھر جاتی ہے ممتا کی ماری کو کہیں پانی نظر نہیں آتا صفا اور مروہ دو پہاڑیوں کے درمیان اس کے سات پھیرے ہوتے ہیں۔

خدائے بزرگ و برتر کو جس کے حکم سے اس عورت کو اس بے آب و گیاہ وادی میں ٹھہرایا گیا تھا پانی کی تلاش میں یوں اس کا مارا مارا پھرنا ایسا پسند آیا کہ رہتی دنیا تک ہر مرد و زن کو پابند کر دیا گیا کہ جب وہ فریضۂ حج ادا کرنے اس بے آب و گیاہ وادی میں آئے تو اسی طرح ان دو پہاڑوں کے درمیان سات مرتبہ دوڑے جس طرح ابراہیمؑ کی بیوی اور اسماعیلؑ کی ماں ہاجرہؑ دوڑی تھیں۔ اضطراب کی اس بے ساختہ ادا کو جو ایک ماں سے اپنے بچے کی جان بچانے کے لیے ظہور میں آئی ایک سنتِ ثانیہ کا مقام دے دینا تمثیل نہیں تو اور کیا ہے۔

اور یہ واقعہ بھی اس وادیٔ بے آب و گیاہ میں پیش آیا کہ ایک عمر رسیدہ

بوڑھا اپنے نوخیز بچے کو استارہ غیبی کے تحت ذبح کرنے جا رہا ہے انسانی صورت میں شیطان حکم خداوندی کی تعمیل سے روکنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ سراپا تسلیم و رضا بوڑھا اسے پتھر مارتا ہے اور بجاآوری حکم میں پس و پیش گوارہ نہیں کرتا۔ آج کہ اس واقعہ پر ۵ ہزار برس کی طویل مدّت گزر چکی ہے۔ اُمّتِ محمدیہ کا ہر فرد جب ان مقامات سے گزرتا ہے جہاں شیطان نے خدا کے اس برگزیدہ پیغمبرؑ کی راہ روکنے کی کوشش کی تھی وہ "جمار" ضرور کرتا ہے اور ایک نادیدہ دشمن پر اس جوشِ غضب سے سنگ باری کرتا ہے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں اس عمل کا نام تمثیل نہیں تو اور کیا ہے۔

صفاء مروہ کی ان دو پہاڑیوں کو شعائرِ الٰہیہ میں شمار کیا گیا کہ ان الصفاَ والمروۃ من شعائر اللہ اگر پہاڑ شعائرِ الٰہیہ میں شمار ہو سکتے ہیں اور اگر ناقۂ صالح شعائر خداوندی بن سکتی ہے تو پیغمبر آخر الزماں محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آل اطہار کو شعائر خداوندی کیوں نہ قرار دیا جائے اور ان کے تذکار مقدس کی رسم خوش آئین کو زندہ و پائندہ رکھنے کے لیے تمثیل کا انداز اختیار کرنے میں آخر کیا قباحت ہے جن خواتین کو لسان نبوّت و وحی نے تمام خواتین عالم کا سردار قرار دیا ہے ان میں حضرت ہاجرہؑ کا نام شامل نہیں ہے۔

دو چار مقدس خواتین جنھیں سربراوردہ روزگاراں منتخبہ عالم بتایا گیا ہے ان میں فرعونؔ کی بیوی آسیہؑ، عمران کی بیٹی مریمؑ۔ ام المومنین حضرت خدیجتہ الکبریٰ اور سیدہ فاطمہ بنت محمد سلام اللہ علیہا کے اسمار گرامی ملتے ہیں۔

حضرت ہاجرہؑ جو ایک پیغمبرؑ کیا پیغمبرؑ جسے ابوالانبیاؑ کہا گیا ہے

ہے جس کی ملت کی اتباع کا خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا اس جلیل القدر اور عظیم المرتبت پیغمبر کا حرم ہیں ان کی تو یہ پذیرائی کہ ان کی ایک بے ساختہ ادا کو رہتی دنیا تک کے لیے قابل عمل بنا دیا گیا اور سیدۃ نساء العالمین حضرت سیدہ فاطمہؑ کے لخت جگر سیدنا حسین علیہ السلام کی مظلومانہ شہادت پر رنج وغم اور گریہ وماتم کا اظہار بھی گوارا نہیں ہے [لہ]

لہ حرم کعبہ میں عین ملتزم کے سامنے ایک پتھر نصب ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کے نشانات ثبت ہیں۔ قرآن مقدس میں نشانات کو مقام ابراہیمؑ (ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ) سے تعبیر کیا گیا ہے اور قرآن مقدس نے حکم دیا ہے واتخذوا من مقام ابراہیم مصلی چنانچہ نماز کے اوقات میں امام کعبہ انہی قدموں کے نشانات کے عین سامنے کھڑا ہو کر رکوع و سجود و قیام کے ارکان بجالاتا ہے اور اس سے نہ تو امام اور اس کے مقتدیوں کی توحید میں کوئی خلل پڑتا ہے نہ نماز میں اس سے کوئی کراہیت پیدا ہوتی ہے نہ موجودہ حکمرانوں کو جو حضور کی بارگاہ میں ہدیہ سلام پیش کرتے ہوئے بعض آداب ملحوظ رکھنے پر آتش زیر پا ہو جاتے ہیں، رسم توحید کی اس کھلم کھلا توہین پر کوئی الجھن محسوس ہوتی ہے اگر ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کے نشانات کو یہ اعزاز ومرتبہ ومقام حاصل ہو سکتا ہے کہ اسے سجدہ گاہ بنا دیا گیا اور صدیوں سے وہ پتھر ایک خصوصی تقدس کا حامل چلا آرہا ہے تو اہل بیت نبوت کی تبرکات کے نشانات پر سر نیاز خم کرنا جہاں ان کے اجساد مطہرہ آرام فرما ہیں شرک کیوں ٹھہرے یا ان کے مزارات کے نقشے گھروں میں آویزاں کرنا یا ان مزارات کی نقل بنانا کسی آئین شریعت کی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

فنِ تاریخ پر ستم

میں یہ باتیں کسی ترتیب سے نہیں لکھ رہا ہوں خیالات کا ایک ہجوم ہے جو ذہن کے دریچوں سے اندر گھسا چلا آرہا ہے کوئی ایک حکایت ہو تو اس کا رنج اٹھایئے کوئی ایک شکوہ ہو تو اس کا قصّہ کہیے کوئی ایک سانحہ ہو تو اس کا ماتم کیجئے اور کوئی ایک درد ہو تو اس کا درماں تلاش کیجئے، "تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم" کی کیفیت دل و دماغ پر مستولی ہے۔ ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ دس باتیں اور دامن کش ہوتی ہیں۔

کبھی تاریخ کی بےبسی کا خیال آتا ہے کہ ہمارے ماضی کے مورخ کیا لوگ تھے کہ انھوں نے وقائع نگاری کو تاریخ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کر دیا یہ مورخ ہمارے دور کے ان صحافیوں کی مانند تھے جنھوں نے ضمیر فروشی

رو سے ناجائز قرار پائے گا کیا شریعت کا آئین بھی دستور بھی لغت کی طرح سراسر سماعی ہوتا ہے کہ اس میں قیاس کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

کے بدولے آسودگی کی دولت پائی ان کی بیان کردہ روایتوں کا ان کے دل پسند راویوں کا حال ان سے بھی کیا گزرا ہے کوئی راوی ایسا نہیں جسے "ثقہ" اور "عدول" نہ کہا گیا ہو اور کوئی راوی ایسا نہیں جس کی دیانت پر شک وشبہ کا اظہار نہ ہوا ہو۔ کبھی اسناد کی طرف دھیان جاتا ہے اور "عن عن" کی مہمل تکرار اور "حد ثنا، اخبرنا، قال فلاں" وغیرہ کے لایعنی حوالوں اور لاطائل ذریعوں سے تاریخ کے قدرتی عمل میں جو رکاوٹیں کھڑی کی گئی ہیں ان کی جانب توجہ مبذول ہوتی ہے۔

اسماالرجال کے فن کو مسلمانوں کی ایجاد قرار دے کر اس پر داد کے ڈونگرے برسائے جاتے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا کہ اس فن کو کس طرح حقائق کے احقا اور واقعات کی پردہ پوشی کے لیے استعمال کیا گیا تاریخ کو مسخ کرنے، اس کا حلیہ بگاڑنے اور سیاہ کو سفید بنانے میں اس فن نے جو گل کھلائے ہیں ان پر بھی تو اک نگاہ ڈالنا ضروری ہے تاریخ پر اس سے بڑا سانحہ کبھی نہیں گزرا کہ اسے اسناد کا تابع مہمل بنا کر رکھ دیا گیا اور اس کی زبان سے وہی بات کہلائی گئی جو جبر واستبداد کے حکمراں کہلوانا چاہتے تھے اور اس طرح اسے پابند سلاسل کر دیا گیا بقول شاعر

کیا پابند نے نالہ کو میں نے
یہ طرز خاص ہے ایجاد میری

تاریخ حالانکہ کبھی اسناد کی محتاج نہیں رہی اس کے اندر ایک خود کار تنقیدی قوت ہوتی ہے جو غلط کو صحیح سے اور درست کو نادرست سے ممیز کرتی رہتی ہے۔

سکندر نے پورس سے کہا "بتاؤ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟"

پورس نے جواب دیا "وہی سلوک جو بادشاہوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔"

یہ تاریخی سوال و جواب صدیوں سے زبان زد خاص و عام ہے کبھی کسی مورخ کو لیے کسی سند کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ سلاطین عالم کے تذکرے تاریخوں میں بہ کثرت موجود ہیں مگر کبھی کسی مورخ نے ان میں تضاد محسوس نہیں کیا۔

یہ شرف ہم سوختہ سامان مسلمانوں کے حصّہ میں آیا کہ ایک ہی واقعہ سے متعلق بیانات میں ایسا تضاد اور اختلاف پایا جاتا ہے کہ ایک راوی دن لکھتا ہے تو دوسرا رات، کہیں کہیں تو ایک ہی واقعہ ہے اور ایک ہی راوی لیکن ایک جگہ اس سے کچھ منقول ہے دوسری جگہ اس سے بالکل کوئی دوسری بات

بسوخت عقل حیرت کہ ایں چہ بوالعجمی

کتب حدیث کی افادیت

ہماری تاریخ کا ماخذ اول کتب حدیث ہیں لیکن ان کے راویان حدیث میں شاید ہی کوئی راوی ایسا ہو جو کسی نہ کسی ناقد حدیث کے ہاں متہم ومشکوک نہ ٹھہرا ہو۔

حدیث کی کوئی کتاب ایسی نہیں بچی جس میں رطب ویابس اور ضعیف و موضوع روایتوں کی بھرمار نہ ہو ان کتابوں کے سات سو سے زیادہ راویان حدیث وہ ہیں جن کو کسی نہ کسی ناقد حدیث نے کذاب ووضاع مفتری ودجال اور غیر ثقہ اور ناقابل اعتماد قرار دیا ہے۔ ناقدین فن حدیث اور ماہرین علم اسماء الرجال نے اپنی کتابوں میں بیشتر راویان حدیث کے بارے میں جو ریمارکس دیے ہیں ان کو پڑھ کر آدمی حیران وپریشان وسرگرداں رہ جاتا ہے کہ کس پر اعتماد کرے اور کس پر نہ کرے کسے سچا جانے اور کسے جھوٹا مانے ان میں ایسے ایسے راوی بھی ہیں جو بظاہر بڑے متقی، پرہیزگار اور عبادت گزار تھے لیکن وضع حدیث کا دھندا بڑی شدومد سے جاری رکھے ہوئے تھے۔

فضائل شیخین کے متعلق من گھڑت حدیثیں پھیلانا، عثمان کو "ذوالنورین"

کا خود ساختہ اور جعلی لقب دینا۔ معاویہؓ کی فضیلت میں حدیثیں گھڑنا ان لوگوں کے بائیں ہاتھ کا کرشمہ ہے۔ بھلا جن لوگوں نے ابوحنیفہ اور شافعی جیسے دل پسند اماموں کے مناقب میں حدیثیں وضع کی ہوں اور ایک دو نہیں بیسیوں کی تعداد میں، ان کے لیے ابوبکر و عمر و عثمان کے فضائل و مناقب کے باب میں حدیثیں وضع کر لینا کونسا مشکل کام تھا چنانچہ مجدالدین فیروز آبادی قاموس نے اپنی کتاب "سفرالسعادہ" میں تصریح کی ہے کہ ابوبکر بن ابی قحافہ کے فضائل کے باب میں تمام احادیث موضوع، جعلی اور من گھڑت ہیں[1]

شیعہ کتب حدیث و روایت کو غیر مستند قرار دینے والوں نے کبھی اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھا ہے کہ ان کے راویوں کی دیانت کا کیا عالم ہے کوئی راوی ایسا ہو جس کے بارے میں اس قسم کے تبصرے نہ ملتے ہوں کہ

۱۔ لاتحل الروایۃ عنہ، (اس شخص سے روایت لینا جائز نہیں)

۲۔ احادیثہ کلہا موضوعۃ (اس کی ساری حدیثیں خود ساختہ ہیں)

۳۔ یروی مالا اصل لہ (ایسی روایتیں پیش کرتا ہے جن کی کوئی اصل اور بنیاد نہیں ہوتی۔

---

[1] ایک اور ستم ظریفی جس کا مظاہرہ حدیث کی چھ معتبر کتابوں میں جنھیں اہل سنت "صحاح ستہ" کہتے ہیں بکثرت دیکھنے میں آیا ہے وہ مناقب و فضائل صحابہ کے باب میں ایسی روایتوں کا التزام ہے جو باپ کے حق میں بیٹے یا بیٹی نے بیان کی ہیں۔

مثال کے طور پر ابوبکر ابن ابی قحافہ کے متعلق زیادہ تر روایتیں وہ ہیں جو ان کی بیٹی حضرت عائشہ سے منسوب ہیں یا ان کے لڑکے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۴۔ یروی الموضوعات عن الثقات (ثقہ لوگوں کے حوالہ سے موضوع حدیثیں بیان کرتا ہے۔

۵۔ احادیث مقلوبۃ منکرۃ (اس کی حدیثیں سند کے اعتبار سے الٹ پلٹ اور مضمون کے اعتبار سے لغو ہوتی ہیں)

۶۔ لیس بشیئ فی الحدیث (حدیث کی روایت میں اس راوی کی کوئی حیثیت نہیں ہے)

۷۔ یاتی عن الثقات بالطامات (ثقہ لوگوں کے حوالہ سے جھوٹی کہانیاں پیش کرتا ہے)

۸۔ لا یحل الاحتجاج بہ (اس کی کسی روایت کو بطور حجت پیش کرنا جائز نہیں ہے)

۹۔ یقلب الاسانید و یرفع (اسناد میں الٹ پھیر کر کے ان کی نسبت براہِ راست حضورؐ تک پہونچاتا ہے)

۱۰۔ یرفع الموقوف و یوصل (حدیث موقوف کو مرفوع اور موصول بنا دیا ہے)

۱۱۔ یسرق الحدیث و یقلب۔ حدیث میں سرقہ کا مرتکب ہوتا ہے اور مضمون کو الٹ پلٹ دیتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ) عبدالرحمن ابن ابو بکر سے منقول ہیں اسی طرح عمر ابن خطاب کے بارے میں زیادہ تر روایتیں وہ ہیں جو ان کے فرزند عبداللہ ابن عمر کی بیان کردہ ہیں "گھر سے آیا ہے معتبر نائی" کی طرز کی ان روایتوں کو بجائے اس کے کہ جرح و ثقہ کی چھلنی میں چھان کر ان کا صحت و سقم کا جائزہ لیا جاتا ان پر آنکھیں بند کر کے ایمان لانے کی تاکید کی جاتی ہے شاید ہر سُنی سنائی بات پر یقین کر لینا ہی سُنی ہونے کی دلیل ہے۔

۱۲۔ لیس بثقۃ فی الحدیث (وہ حدیث کی روایت میں قابل اعتبار نہیں ہے۔
۱۳۔ لم یکن ثقۃ ولا ماموناً۔ (نا قابل اعتماد ہے نہ کذب سے مامون۔
۱۴۔ عامتہ ما یرویہ غیر محفوظۃ (اس کی عام روایتیں آمیزش سے محفوظ نہیں ہیں۔
۱۵۔ کل الاصحاب مجمع علی ترکہ (تمام اصحاب حدیث اس کی روایات کو نظر انداز کرنے پر متفق ہیں۔
۱۶۔ لیس لہ حدیث یعتمد علیہ (اس کی روایت کردہ کوئی حدیث بھی قابل اعتماد نہیں۔
۱۷۔ مضطرب الحدیث لیس بشیٔ (اس کی روایتوں میں گڑبڑ گھٹالا ہے اور بے کار محض ہے،
۱۸۔ متفق علی ترکہ (اس کی روایات کے ترک پر سب کا اتفاق ہے۔
۱۹۔ یاتی بالموضوعات (وہ من گھڑت روایتیں بیان کرتا ہے۔
۲۰۔ یاتی بالمقلوبات (الٹ پھیر والی روایتیں پیش کرتا ہے۔
۲۱۔ ینفرد بالمناکیر (ان ہونی اور عجیب وغریب روایتیں پیش کرنے میں منفرد ہے۔
۲۲۔ لیس بحجتہ (وہ راوی مستند نہیں ہے۔
۲۳۔ مدلس عن الکذابین (جھوٹوں کی روایتیں صحیح روایتوں میں ملا کر پیش کرتا ہے۔
۲۴۔ متہم بالکذب (اس پر جھوٹا ہونے کا الزام عائد ہے

ابوہریرہ ضمیر فروش راوی

راویانِ حدیث کی اس بے اعتباری کا یہ سلسلہ نچلی سطح تک ہی محدود نہیں بڑے بڑے نامور صحابہ اس جرم میں ملوث ہیں۔ اور چھوٹی سطح کے راوی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکتے ہیں کہ ایں گنا ہےاست کہ در شہر شما نیز کنند۔ ان جلیل القدر صحابہ میں ایک نام ابوہریرہ کا ہے جنھیں "مکثرین حدیث" میں سرفہرست شمار کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ آٹھ صحابہ میں سے ہیں جن سے حدیث میں بہ کثرت احادیث مروی ہیں اور ابوہریرہ کی روایتوں کی تعداد دوسروں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔

یہ ابوہریرہ جو اپنی کثرتِ روایت کی بنا پر عمر ابن خطاب کے ہاتھوں ایک مرتبہ زدوکوب بھی ہوئے ایسے واقعات کے عینی شاہد بھی بنتے ہیں جن واقعات کے وقت ان کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں ملتا ان کے بارے میں یہ بات تو تمام محدثین و مورخین کے نزدیک طے ہے کہ وہ غزوۂ خیبر کے بعد مسلمان ہوئے جو ۷ھ کا واقعہ ہے لیکن عینی شاہد وہ ان واقعات کے بنتے ہیں جو ان کے مسلمان ہونے سے بہت پہلے کے ہیں۔

بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ" کی کہاوت سنی تو تھی مگر تاریخ اسلامی میں "عبداللہ دیوانہ" کا یہ کردار ابوہریرہ کو سجتا ہے جو خواہی نہ خواہی ہر واقعہ میں خود کو یوں شریک کر لیتے ہیں گویا اگر اس واقعے میں ان کی شرکت نہ تسلیم کی گئی یا تو وہ واقعہ ادھورا رہ جائے گا یا اس کی اہمیت کم ہو جائے گی یا اس کا واقعہ مشکوک ٹھہرے گا اسے آپ ایک اور کہاوت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں یعنی "تو کون میں خواہ مخواہ"

ابوہریرہ کی ایسی ہی بے سروپا روایتوں میں سے بطور "نمونہ مشتے از خروارے" ایک روایت یہاں پیش کی جاتی ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ محدثین کے اس پسندیدہ راوی کی اوقات کیا ہے۔ ابوہریرہ روایت کرتے ہیں۔

دخلت علی رقیۃ بنت رسول اللہ امرأۃ عثمان وبیدھا مشط وفقالت خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من عندی آنفا رجلت شعرہ فقال کیف تجدین اباعبداللہ (یعنی عثمان) قالت بخیر۔ قال اکرمیہ فانہ من اشبہ اصحابی بی خلقا۔

"میں رقیہ کے ہاں گیا جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی اور عثمان بن عفان کی بیوی تھی رقیہ کے ہاتھ میں کنگھی تھی رقیہ کہنے لگیں ابھی ابھی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے ہاں سے ہو کر گئے ہیں۔ میں نے ان کے بالوں میں کنگھی کی تھی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے دریافت فرمایا ابوعبداللہ یعنی عثمان (یہ ان کی کنیت ہو گی) کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے میں نے کہا وہ بھلے آدمی ہیں یہ سن کر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس شخص کی عزت کیا کر کیونکہ عثمان میرے صحابہ میں اخلاق کے اعتبار سے سب سے زیادہ مجھ سے مشابہ ہیں۔

تاریخ وحدیث وسیر کی تمام کتابیں اس امر پر متفق ہیں کہ حضرت رقیہ کا انتقال جنگ بدر کے فوراً بعد ہوا اور یہ واقعہ ۲ھ کا ہے ابوہریرہ ۷ھ میں مسلمان ہوئے ابوہریرہ مکہ یا مدینہ کے رہنے والے نہیں تھے کہ ان کے بارے میں یہ قیاس آرائی کی جا سکے کہ وہ اسلام لانے سے قبل مدینہ منورہ آئے اور حضرت رقیہ سے بھی ملنے چلے گئے ہوں وہ یمن کے رہنے والے تھے اور یمن کے قبیلہ آزد سے تعلق رکھتے تھے پھر کس کافر ومشرک کا کسی مسلمان کے ہاں اور وہ بھی ایسی عورت جسے وہ بنت رسول کہہ رہے ہوں اس کے گھر میں جانا چہ معنی دارد۔

ظاہر ہے یہ ساری سخن سازی انھوں نے معاویہ کے زمانہ میں کی جس نے اس قسم کی وضعی حدیثوں کی تیاری کے لیے ضمیر فروش صحابہ کا ایک گروہ مقرر کر رکھا تھا جو حضرت سیدنا علیؑ کی مذمت میں اور خاندان بنی امیہ کے افراد کی تعریف میں جھوٹی باتیں گھڑ کر انھیں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب منسوب کرتا تھا۔

جہاں تک ابوہریرہ کی ضمیر فروشی کا تعلق ہے تو اس کے ثبوت میں کئی واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں ایک واقعہ جسے مشہور راوی اعمش نے بیان کیا ہے اس سے ابوہریرہ کے کردار پر روشنی پڑتی ہے وہ کہتا ہے

جب ابوہریرہ معاویہ کے ساتھ عراق آیا اور یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب حضرت حسنؑ نے حکومت معاویہ کے سپرد کر دی تھی تو ابوہریرہ کوفہ کی مسجد میں گیا جب اس نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اسے دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے ہیں تو گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر اپنی کھوپڑی پر کئی بار ہاتھ مارا (یہ ابوہریرہ کی غیر اختیاری حرکت معمول کے مطابق تھی) اس کے بعد کہنے لگا۔

اے اہل عراق! کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر جھوٹ باندھوں گا اور خود کو آگ میں جلواؤں گا۔ اللہ کی قسم میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے ؎

؎ استدراک۔ ابوہریرہ کی دنائت طبع کا اندازہ جہاں اس سے ہوتا ہے کہ وہ خود یہ اعتراف کرنے کے باوجود کہ ان سب سے زیادہ احسانات حضرت جعفر طیارؑ بن سیدنا ابوطالبؑ کے ہیں وہاں حضرت ابوطالبؑ کے کفر کے بارے میں جو روایتیں کتب حدیث میں مذکور ہیں ان میں سے بیشتر کے راوی بھی یہی احسان فراموش شخص ہے اور سیدنا علیہ السلام کی مخالفت میں بھی یہی پیش پیش رہا وہ شخص جو خود یہ اعتراف کرتا ہے کہ نماز کا مزا تو علیؑ ابن ابی طالبؑ کی اقتدا میں ہے لیکن دسترخوان کا لطف معاویہ کے یہاں ملتا ہے اور وہ معاویہ کا آلۂ کار بن کر سیدنا علیؑ کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ کرتا ہے۔

جھوٹی روایتیں اس کثرت سے گھڑتا اور بیان کرتا تھا کہ خود اس کے آقایان ولی نعمت میں سے ایک یعنی خلیفہ دوم کے ہاتھوں خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں بھی پٹا اور ان کے زمانۂ خلافت میں بھی اس کی پٹائی ہوئی لیکن عثمان اور معاویہ کی حکومتوں کے عہد میں تو اسے خوب کھل کھیلنے کا موقعہ ملا اور اس نے اسلامی شریعت کے ہر مسئلہ میں تفسیر قرآن سے لے کر فقہ کے چھوٹے چھوٹے مسائل تک میں حدیثیں گھڑ کر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کرنی شروع کر دیں اور بلا روک ٹوک مفسر محدث فقیہ مورخ اور عالم بنتا چلا گیا حتیٰ کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ نے بھی اسے اس کی بر خود غلط روایتوں پر [illegible] تو اس نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ یہ جواب دیا کہ حضرت عائشہ کو تو کنگھی

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

"ہر پیغمبر کا ایک حرم ہوتا ہے اور میرا حرم مدینہ (منورہ) ہے عیرے سے لے کر ثور تک تو میرے اس حرم میں اگر کوئی حادثہ کسی شخص کے سبب رونما ہوا تو اس پر خدا کی اور فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہو" اور میں گواہی دیتا ہوں کہ مدینہ میں حادثہ کے مرتکب علیؑ ابن ابی طالبؑ ہوئے ہیں۔ جب ابوہریرہ کی اس کارگزاری کا علم معاویہ کو ہوا تو اس نے ابوہریرہ کو اکرام و انعام سے نوازا اور اس خدمت کے صلہ میں اس کو مدینہ کا گورنر مقرر کر دیا۔

ابوجعفر اسکافی کہتے ہیں

"معاویہ بن ابی سفیان نے صحابہ اور تابعین میں سے کچھ لوگوں کو اس کام پر لگایا تھا کہ وہ سیدنا علیؑ کے متعلق ایسی بری خبریں گھڑیں جن سے ان کی عظمت مجروح ہوتی اور ان کی کردار کشی ہوتی ہو اور لوگوں میں ان سے بیزاری کا جذبہ ابھرتا ہو اس کام کے لیے معاویہؓ نے ان لوگوں کا باقاعدہ روزینہ مقرر کیا تھا۔ چنانچہ یہ لوگ ایسی ایسی باتیں گھڑتے اور حدیثیں وضع کرتے جن سے معاویہؓ کی خوشنودی، مزاج حاصل ہوتی۔

کرایہ کے ان ٹٹوؤں میں ابوہریرہ تھے۔ عمروؓ بن العاص تھے۔ مغیرہؓ بن شعبہ تھے اور تابعین میں ایسے لوگوں کا سرغنہ عروۃ بن الزبیر تھا۔ اس

جو ٹی سے فرصت ہی کب ملتی تھی کہ وہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ارشادات پر توجہ کریں دوسرے صحابہ بھی اپنے اپنے کاروبار میں مشغول رہتے تھے ایک میں تھا جو ہر وقت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر رہتا تھا۔ اسے کہتے [illegible]

کے علاوہ کعب احبار وہب بن منبہ اور عبداللہ بن سلام جیسے لوگ بھی معاویہ کے آلۂ کار تھے۔ ابوالدرداء اور سمرہ بن جندب کے نام بھی اس فہرست میں صحابہ کی عظمت کو چار چاند لگا رہے ہیں حضرت رقیہ سے متعلق ابوہریرہ کی روایت تو آپ نے دیکھ لی جس میں یہ شخص موقعہ کا گواہ بنا ہے، اسی

---

۷ عبداللہ بن سلام جو یہودی عالم تھا اس کی تمام تر ہمدردیاں معاویہؓ بن ابوسفیانؓ کے ساتھ تھیں۔ عبداللہ ابن سبا کی فرضی اور سراسر من گھڑت شخصیت جس کا تاریخ میں تیسری صدی ہجری سے پہلے کہیں نام تک موجود نہیں ہے اسے یہودی قرار دے کر شیعان علیؑ کا رشتہ یہودیت سے عبداللہ ابن اسلام کی حقیقی شخصیت سے رشتہ وفاداری استوار کرنے والوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ یہ عبداللہ ابن سلام اس کو اس کی عمر بھر کی چیرہ دستیوں کا صلہ معاویہؓ کے دربار سے کیا ملا اور اس کی تفصیل اہل سنت ہی کے مورخین کی زبانی سنیئے۔

"معاویہؓ کا لڑکا یزیدؓ، عبداللہ ابن سلام کی بیوی ارنیب بنت اسحاق پر فریفتہ ہو گیا جو اپنے زمانہ کی حسین ترین عورتوں میں سے تھی۔ یزیدؓ کو اس عورت سے اس درجہ عشق ہو گیا کہ اس کی یاد میں آہیں بھرتا اور اس کے فراق میں قریب المرگ ہو گیا۔ جب معاویہؓ کو یزیدؓ کے اس عشق کا علم ہوا تو اس نے ابوہریرہ اور ابوالدردار کو بلا بھیجا وہ دونوں حاضر ہوئے۔ ان سے کہنے لگا۔۔۔ "میری ایک بیٹی ہے میں اس کی شادی کے لیے متفکر ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ عبداللہ ابن سلام جیسے عالم و فاضل دین دار اور شریف انسان کی بیوی بنے۔ ان دونوں نے عبداللہ ابن سلام سے اس خواہش (باقی اگلے صفحہ پر)

قسم کی ایک دو روایتیں اور بھی پیش کی جاتی ہیں تاکہ اندازہ ہو کہ اس صحابیٔ رسولؐ نے کیا گل کھلائے ہیں۔

ابوہریرہ روایت کرتے ہیں

صلّٰی بنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم الظهر او العصر فسلم فی رکعتین فقال له ذوالیدین انقصت الصلوٰۃ ام نسیت،

"رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں نماز ظہر پڑھائی یا عصر کی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو رکعت پڑھا کر ہی سلام پھیر لیا اس پر

(بقیہ حاشیہ) کا ذکر کیا تو وہ دام فریب میں آگیا اور معاویہؔ سے اس کی بیٹی کا رشتہ طلب کیا۔ معاویہؔ نے ابوہریرہ سے کہا کہ وہ خود جاکر اس کی بیٹی سے اس سلسلے میں گفتگو کرے۔ معاویہؔ کی بیٹی نے باپ اور بھائی کے ساتھ طے شدہ منصوبہ کے مطابق اثبات میں جواب دیا مگر کہا کہ میں اس شرط پر یہ رشتہ قبول کرتی ہوں کہ عبداللہ ابن سلام اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دے کیونکہ میں سوکنا پے سے ڈرتی ہوں کہ مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے جو مجھے غضب خداوندی کا شکار بنا کر رکھ دے۔ اس پر ابن سلام نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور معاویہؔ سے ایفاءِ عہد کا مطالبہ کیا کچھ عرصہ تک تو معاویہؔ ٹال مٹول سے کام لیتا رہا جب عبداللہ ابن سلام کی بیوی ایام عدت گزار کر یزیدؔ کے حجلۂ عروسی میں پہونچ گئی تو معاویہؔ نے صاف صاف جواب دے دیا کہ اس کی بیٹی کہتی ہے کہ جو شخص اپنی بنتِ عم کو جو اپنے وقت کی خوب صورت ترین عورت ہے طلاق دے سکتا ہے تو اس پر وہ کیوں کر اعتماد کر سکتی ہے۔ اسے کہتے ہیں یا بے ایمانی تیرا ہی آسرا۔

(طبری۔ معاویہ فی المیزان لعباس محمود العقاد)

ذوالیدین صحابی نے عرض کیا نماز میں کمی کر دی گئی ہے یا آپ بھول گئے ہیں۔ الخ "

ذوالیدین صحابی غزوہ بدر میں شہید ہوئے جب کہ ابھی ابوہریرہ کفر کے مزے لوٹ رہے تھے لیکن لوگوں کو یہ تاثر دینے کے لیے کہ وہ بھی اصحاب بدر میں شامل ہیں ایک قصّہ گھڑ لیا۔ حالانکہ غزوہ بدر ۲ھ کا واقعہ ہے جب کہ ابوہریرہ ۷ھ میں مسلمان ہوئے۔ یہ روایتیں بخاری اور مسلم میں مذکور ہیں جنھیں "صحیحین" کہا جاتا ہے۔

درازدستیٔ ایں کوتہ آستیناں بیں

یہی ابوہریرہ اپنے "پیشہ ورانہ" فرائض سرانجام دیتے ہوئے ایک اور دور کی کوڑی لائے ہیں تاکہ اپنے مربی و سرپرست معاویہ کی مسرتوں میں اضافہ کر کے گلچھرے اڑا سکیں۔

ایمان ابوطالبؑ

ابوہریرہ کہتے ہیں۔

قال رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم لعم ابی طالب قل لا الہ اللہ اشہد لک بہا یوم القیامۃ ابی انا کہ لہ تہری قال مولا ان تعیرنی قریش یقولون انما حملہ علی ذلک لا قرائت بہا عینک فانزل اللہ تعالیٰ انک لا تہدی من احببت ولکن اللہ یہدی من یشاء

(مسلم عن ابی ہریرہ)

حضور نبی اکرم صلی علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چچا ابوطالبؑ سے فرمایا آپؑ کلمہ لا الہ اللہ پڑھ لیں تو میں قیامت کے روز آپ کے حق میں گواہی دونگا۔ ابوطالبؑ بولے اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ قریش مجھے عار دلائیں گے اور کہیں گے کہ دیکھا بھتیجے نے اسے اس کام پر مجبور کر دیا تو میں ضرور تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کرتا اس موقعہ پر قرآن پاک کی یہ آیت نازل ہوئی۔

انک لا تہدی من احببت ولکن اللہ یہدی من یشاء۔

"تم اسے ہدایت نہیں دے سکتے جس سے تم کو محبت ہو یہ اللہ تعالےٰ

ہی ہے جو ہدایت عطا فرماتا ہے جسے وہ چاہتا ہے۔"

ایک دوسری روایت میں ہے ابوہریرہ کہتے ہیں۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چچا ابوطالبؑ سے فرمایا آپؑ کلمہ لاالہ الااللہ پڑھ لیں میں قیامت کے روز آپ کے حق میں اس کی شہادت پیش کردوں گا ابوطالبؑ نے انکار کر دیا اس پر قرآن مقدس کی وہ آیت نازل ہوئی جس کا ذکر پہلی حدیث میں آچکا ہے۔

انك لاتهدى من احببت الخ

حضرت ابوطالبؑ کا انتقال سنہ۱۰ نبوت میں ہوا بعض دوسری روایتوں کے بموجب آٹھ یا نو نبوت میں ان کی وفات ہوئی جب کہ ابوہریرہ سنہ۷ میں مسلمان ہوئے لیکن ابوطالبؑ کے قبول اسلام سے انکار کا آنکھوں دیکھا حال یوں سنا رہے ہیں جیسے واقعہ کے گواہ ہیں حالانکہ حضرت ابوطالبؑ کے انتقال اور ابوہریرہ کے مسلمان ہونے کے درمیان کم وبیش آٹھ دس سال کا فاصلہ حائل ہے یا تو ابوہریرہ صاحب اس راوی کا نام بتاتے جس سے انھوں نے یہ واقعہ سنا تھا تاکہ واقعہ کی صحت وعدم صحت پر کوئی تبصرہ ممکن ہوتا مگر وہ تو ہر واقعہ کے گواہ ہیں یعنی وہی بات ہوئی کہ خواجہ کا گواہ مینڈک۔

سنہ۷ میں جب اسلام ایک طاقت ور تحریک اور ناقابل شکست دین بن چکا تھا اس وقت ہوا کا رُخ دیکھ کر مسلمان ہونے والا شخص پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس بزرگ چچا کے درپے آزار ہے جس نے ایک ایسے پرآشوب دور میں پیغمبرؐ کی بھرپور حمایت ونصرت کی جب قدم قدم پر ابتلا وآزمائش کا سامنا تھا اور جب مسلمان ہونا کسی مسلمان کی

پشت پناہی کرنا شہادت گہ الفت میں قدم رکھنے کے مترادف تھا۔

اور حضرت سیدنا ابو طالبؑ کو کافر ثابت کرنے سے مقصد کیا تھا محض سیدنا علی علیہ السلام کی توہین و تذلیل اور یہ بتانا کہ معاویہ کا باپ ابوسفیان مسلمان تھا اور ان کے حریف حضرت علیؑ کے والد گرامی نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اس طرح ایک کافر باپ کے بیٹے کے مقابلہ میں ایک مسلمان کے بیٹے معاویہ بن ابی سفیان کی نسبی برتری ثابت کی جائے۔

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

یہاں ضمناً ایک اور بات کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ دورِ بنی امیہ اور دور خلافت ابوبکر و عمر و عثمان کے ان پیشہ ور راویان حدیث کی حیثیت آج کے دور کے ان صحافیوں کی سی تھی جو اپنے ضمیر و ایمان کو جنس بازار بنا کر ہر حکمران کے سامنے "من قماش فروش دل صد پارۂ خویشم" کی صدائیں بلند کرتے اور چڑھتے سورج کی پرستش کو عین دین و ایمان سمجھتے ہیں۔ اور یوں اپنے لیے آذوقہ عیش فراہم کرتے ہیں۔

خود ہمارے ملک پاکستان میں اگر صحافت کی تاریخ کا جائزہ لیں تو ایسے ایسے جغادری ضمیر فروش اور بے ایمان صحافی بہ کثرت دستیاب ہوں گے جو حکومت وقت کی قصیدہ نگاری میں اپنے قلم کی ساری جولانیاں وقف کئے ہوئے ہوں گے۔ ایوب خاں کے عہد آمریت میں اور بھٹو کے دور استبداد میں ان صحافیوں نے جس گھناؤنے کردار کا مظاہرہ کیا اور جس طرح رائے عامہ کو نظر انداز کر کے خوب کو ناخوب اور اس کے برعکس ثابت کرنے میں اپنا سارا زورِ قلم و تحریر صرف کیا وہ کسی بھی اخبار نویس اور اخبار بیں طبقہ سے مخفی نہیں ہے۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں تاریخ عمل ہر دور میں یکساں رہا ہے اس لیے کہ انسانوں کی طبائع اور ان کی فطرت میں خیر و شر کا امتزاج دو اور دو چار کی طرح ایک حقیقت کی طرح نمایاں ہوتا رہا ہے۔ اس لیے ایک پورے معاشرہ پر کبھی بھی اور کسی دور میں بھی اور کہیں بھی حتمیت کے ساتھ خیر محض کا اطلاق ممکن نہیں ہاں برے سے برے معاشرہ میں بھی البتہ استثناء ضرور ہوتا ہے اور اکا دکا ایسے افراد مل جاتے ہیں جنھیں "خیر مجسم" قرار دیا جا سکے۔ جو شخص تاریخ کے ادوار گذشتہ اور اعمال سابقہ کا جائزہ اپنے عہد کے تاریخی حالات کے پیش نظر میں نہیں لیتا وہ تاریخ کے مطالعہ کے دوران کسی مثبت نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔

مستبد حکمرانوں کا طرز عمل ہمیشہ ایک سا رہا ہے ان کے طریق کار میں وقتی اور ہنگامی مصلحتوں کی بنا پر صورتِ حال میں تبدیلی کا احساس ہوتا ہے لیکن ان کے سیاسی حربے میں کوئی بنیادی تغیر رونما نہیں ہوتا۔

زمانۂ قبل از تاریخ کے واقعات میں فرعونِ موسیٰ کا تذکرہ قرآن مقدس نے کیا ہے اس کے نظام استبداد میں جو بنیادی عوامل کارفرما تھے آج صدیاں گزرنے کے بعد بھی مستبد حکمراں ان پر عمل پیرا ہیں۔ قرآن مقدس نے کہا تھا۔

ان فرعون علا فی الارض وجعل اھلھا شیعا یستضعف طائفۃ منھم یذبح ابناءھم ویستحی نساءھم انہ کان من المفسدین۔

"فرعون نے زمین پر سرکشی کی راہ اختیار کی اور اس نے سرزمین مصر کے باشندوں میں پھوٹ ڈال کر ان کو گروہوں میں بانٹ دیا ایک گروہ کو دوسرے کے مقابلہ میں گرانا اور کمزور کرنا شروع کر دیا وہ ان کی جوان نسل کو اپنی سیاسی انا کی کی بھینٹ چڑھاتا تھا اور بے بس عورتوں کو بے کسی کی زندگی گزارنے کے لیے

چھوڑ دیتا تھا یقیناً وہ زمین پر فساد پھیلانے والوں میں سے تھا۔

مستبد حکمراں کو سرکشی کی راہ اختیار کرنے کے لیے ایسے حاشیہ برداروں اور قصیدہ گو مصاحبوں کی ضرورت ہوتی ہے جو اسے ما فوق البشر (SUPER MAN) ثابت کریں اور اس کی نخوت و رعونت میں اضافہ کرتے رہیں۔ مستبد حکمراں اپنے استبداد کو سندِ جواز بخشنے کے لیے ابوہریرہ مغیرہ، عمرو بن العاص، سمرہ بن جندب عبداللہ بن عمرو، عمروہ بن زبیر، عبداللہ بن عمر ابن خطاب جیسے "ثقہ" راویوں کی ہمیشہ سرپرستی کرتے رہے ہیں۔ اس سے ان کے ذوق خود نمائی کی بھی تسکین ہوتی رہتی ہے ان کی "انا" بھی پھلتی پھولتی رہتی ہے اور ان کی ستمگرانہ روش پر پردہ بھی پڑا رہتا ہے۔ استبداد کی پوری تاریخ کا ایک جائزہ لیں تو آپ کو استبداد کی مدح سرائی میں رطب اللسان لوگوں میں دو ہی طبقے نظر آئیں گے یا تو مفاد پرستوں کا گروہ جس کا کام ہی ابن الوقتی، طالع آزمائی اور خود غرضی رہا ہے یا پھر تیسرے درجہ کے لوگ جن کے ہاں معیار اخلاق ہی یہ ہے کہ وہ بد اخلاقی کا مظاہرہ کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہ دیں۔

استبداد کی دل وجان سے حمایت کرنے والے یہ دونوں طبقے مستبد حکمرانوں کی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی حکمت عملی کو کامیاب بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور "در پردہ چشم یار کی شہ پاکر" عوام کے مختلف طبقات کو کچلنے اور دبانے کی ہر ممکنہ جدوجہد میں پیش پیش رہے ہیں۔

تعجب ہوتا ہے کہ قلم جس کی عصمت کی قسم قرآن مقدس نے کھائی اور جسے علم کا منبع قرار دیا اسی کے قلم کے دھنی سب سے زیادہ بے ضمیر اور خود فروش ثابت ہوتے رہے۔

میں نے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں جب شعور و وجدان کا آغاز

تھا ادیبوں اور قلم کاروں کے بارے میں عجیب عجیب تصورات باندھ رکھے تھے اور میرا خیال تھا کہ اہل قلم سے زیادہ حساس، خودنگر، خودشناس، غیرت مند اور صاحب کردار وضمیر اور کوئی نہیں ہوتا بالخصوص ترقی پسند ادیبوں کے افکار ونظریات کے مطالعہ سے تو یہ خوش اعتقادی اس حد تک بڑھ گئی کہ ترقی پسند ادیبوں کو مافوق البشر قسم کی مخلوق سمجھنے لگا۔

لیکن عقل وشعور کے ساتھ ساتھ جب نقد وتبصرہ کا شعور حاصل ہوا کہ اہلِ قلم کی بستی میں شاذ و نادر ہی ایسے لوگ ملیں گے جو وہی کچھ لکھیں جو محسوس کریں اکثریت ان قلم وضمیر فروشوں کی ہے جو بقول غالب

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبع خریدار دیکھ کر

اور "عیارِ طبع خریدار" کیا ہے چند روپہلی سکوں اور نقرئی خزف ریزوں کی تھیلیاں یا عیش وعشرت دنیا کے چند اسباب ذہبیہ اس بکاؤ مال میں ایسے ایسے "عظیم دانشوروں" کے نام دیکھنے اور سننے میں آئے جنھیں ادبی دنیا میں شہرت وناموری کا منصب بلند حاصل تھا جن کی افسانہ نگاری، جن کی شاعری جن کی صحافتی، ادبی، فکاہی اور علمی زندگی کے دوسرے بہت سے پہلو عوام میں پسندیدگی اور استحسان کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

جب تہذیب وارتقاء کے اس دور میں صحافی اور اہل قلم بازار کی جنس فرومایہ بن سکتے ہیں تو ابوہریرہ جیسے حدیث العہد نومسلموں سے یہ توقع کرنا کہ وہ اپنے آقائے ولی نعمت معاویہؓ کی خوشنودی الطبع کی خاطر چند جھوٹی حدیثیں نہیں گھڑے گا کہاں تک درست ہوگا۔

ایک اور ضمیر فروش صحابی

ابوہریرہ ہی کی قماش کے ایک اور صاحب سمرہ بن جندب ہیں ان پر بھی "صحابیت" کی تہمت لگی ہوئی ہے۔ معاویہ نے اس صحابی رسولؐ کو چار لاکھ درہم دیے صرف اس لیے کہ وہ اہل شام کے سامنے سیدنا علی علیہ السلام کی مذمت میں کوئی حدیث سنائے چنانچہ اس بدبخت نے ایک ایسی حدیث وضع کی جس میں قرآن مقدس کی دو آیات کریمہ کو بھی ملوث کیا اس نے کہا۔

ومن الناس من یعجبك قوله فی الحیاة الدنیا ویشهد الله علی ما فی قلبه وهو الد الخصام واذا تولیٰ سعی فی الارض لیفسد فیها ویهلك الحرث والنسل والله لا یحب الفساد

سمرہ بن جندب نے ایک ایسے شخص کو اپنی کذب بیانی اور الزام تراشی کا نشانہ بنایا جو بلا اختلاف امت "خلیفہ راشد" قرار دیا جاتا ہے اس کے باوجود کچھ لوگ اس بات پر بضد ہیں کہ کسی صحابی کو برا بھلا مت کہو خواہ وہ صحابی

ابوہریرہ اور سمرہ بن جندب جیسا کذاب ہی کیوں نہ ہو۔

یہ وہی سمرہ بن جندب ہے جس سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا تھا کہ تم اپنے کھجوروں کے فلاں درختوں کے عوض فلاں مقام پر اتنے ہی کھجوروں کے درخت لے لو تو اس نے حضورؐ کی اس پیش کش کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ حضور نبی اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ پیش کش دو تین مرتبہ دہرائی اور اجر و ثواب کی اس پر مستزاد یقین دہانی بھی فرمائی لیکن یہ شخص ٹس سے مس نہ ہوا۔ بالآخر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر یہ درخت بلاقیمت اور بلا کسی معاوضہ کے کاٹ دیے گئے اور اس طرح حضور نبی اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی اور آپؐ کے حکم سے سرتابی کے باوجود اس کی صحابیت تنقید سے بالاتر رہی۔

ان حضرات کا دھندا شراب فروشی تھا اور یہ دھندا حرمت شراب کے بعد بھی جاری رہا۔ علامہ جار اللہ زمخشری نے "الفائق" میں عمرو بن الخطاب کا قول نقل کیا ہے

ان سمرہ بن جندب باع خمرا قاتل اللہ سمرۃ الم یعلم ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال لعن اللہ الیھود حرمت علیھم الشحوم فجملوھا فباعوھا ای اذا بوھا نباعوھا۔

سمرۃ بن جندب شراب فروشی کا دھندا کرتا ہے اللہ اس سمرۃ کو غارت کرے کیا وہ نہیں جانتا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ یہودیوں پر لعنت کرے کہ ان پر چربی حرام کی گئی تھی مگر انھوں نے چربی کو تیل کی شکل میں پگھلا کر بیچنا شروع کر دیا۔ غالباً یہ سمرۃ شراب فروشی کا دھندا ابھی کسی قسم کی جعل سازی اور حیلہ گری کے ذریعہ کرتا ہوگا مگر روایات سے تو ثابت ہوتا ہے کہ سمرۃ بن جندب اگر شراب فروشی کا مجرم تھا تو خلیفۂ دوم شراب نوشی کے عادی تھے۔

مغیرہؑ بن شعبہ۔ ایک بدفطرت انسان

اور اب ایک اور صحابی رسولؐ کا احوال بھی پڑھ لیجئے۔ یہ مغیرہ بن شعبہ ہے جس کی تعریف میں حسب معمول اہل سنت زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں اور اسے عرب کا ایک بڑا سیاست داں قرار دیتے ہیں۔ حضرت سیدنا ابن ابی طالب علیہا السلام کے خلاف جھوٹا پروپگنڈا کرنے والوں میں اس بدنہاد انسان کا نام بھی شامل فہرست ہے۔

یہ وہی مغیرہؑ بن شعبہ ہے جس کے بارے میں فن اسمار الرجال کی مستند کتابوں میں لکھا ہے کہ اس نے ایک ہزار عورتوں سے نکاح کیا تھا۔ خلیفۂ دوم کے زمانہ میں یہ شخص بصرہ کا گورنر تھا! اور زنا کرتے ہوئے موقعہ پر پکڑا گیا تھا ارتکاب جرم کے عینی گواہوں میں ایک صحابی ابوبکرہ بھی تھے لیکن چوتھا گواہ زیادؑ بن سمیہ چونکہ مغیرہؑ کا دوست تھا اس لیے اس نے لفظوں کے الٹ پھیر سے گواہی کو مشکوک کردیا اور یوں مغیرہ کی جان بچ گئی۔ یہ وہی زیادؑ ہے جو ابوسفیانؑ کا ولدالحرام تھا یہ وہی مغیرہؑ بن شعبہ ہے جس کی "صحابیت" نے امت محمدیہ کو اس کے بالکل ابتدائی دور میں ایک ایسی لعنت سے دوچار کیا جس کے

اثراتِ بد سے آج تک یہ امت اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکی۔

ابن اثیر نے اپنی کتاب تاریخ "الکامل" میں مغیرہؓ بن شعبہ کی دسیسہ کاریوں کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجئے اور ان لوگوں کے حوصلے کی داد دیجئے جو اس قماش کے بدکردار لوگوں کو امت محمدیہ کے مقتدا و پیشوا بنا کر پیش کرتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے نہ انھیں خدا کا خوف دامنگیر ہوتا ہے نہ پیغمبر علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام سے شرم وحیا محسوس ہوتی ہے۔ مغیرہؓ بن شعبہ کوفہ کا گورنر تھا معاویہؓ نے اس کو معزول کر دینا چاہا۔ مغیرہؓ کو جب معاویہؓ کے اس ارادے کا علم ہوا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"میری رائے میں اب موقعہ ہے کہ میں از خود معاویہؓ کے پاس جا کر اس کے سامنے اپنا استعفےٰ پیش کروں تاکہ لوگوں پر واضح ہو جائے اور میرے بارے میں یہ تاثر پیدا ہو کہ مجھے گورنری کے عہدہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ میں اسے ناپسند کرتا ہوں۔

معاویہؓ کے پاس جانے سے قبل اس نے اپنے محرم راز دوستوں سے بڑے تیقّن کے ساتھ یہ بات کہی کہ اگر اس مرحلہ پر میں نے اپنی گورنری پکی نہ کی تو پھر کبھی ایسا موقعہ نہیں آئے گا۔

اس کے بعد مغیرہؓ معاویہ کے پاس جانے سے قبل اس کے لڑکے یزید کے ہاں پہنچ گیا اور اس سے کہا

انہ قد ذھب اعیان اصحاب محمد رسول اللہ صلی اللہ وآلہ وسلم، وکبراء قریش وانما بقی ابناؤھم وانت من افضلھم واحسنھم رایا واعلمھم بالسنۃ و السیاسۃ ولا ادری ما یمنع امیر المومنین ان یعقد لک البیعۃ۔ قال اوتری ذلک یتم؟ قال نعم!

"محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بڑے بڑے صحابہ اور قریش کے بزرگ انتقال کر چکے ہیں اب ان کی اولاد باقی رہ گئی ہے ان میں سب سے افضل اور عقل وخرد کے اعتبار سے سب سے بہتر اور سنت وسیاست کا سب سے بڑا عالم تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہے میں نہیں جانتا کہ ... امیر المومنین (معاویہ) کو تمہاری ولی عہدی کا اعلان کرنے میں کیا چیز مانع ہے اور وہ تمہاری خلافت کی بیعت کیوں نہیں لیتے؟"

یہ سن کر یزید کے دل کی کلی کھل اٹھی بے ساختہ بولا "تمہاری رائے میں یہ منصوبہ تکمیل پذیر ہو سکے گا؟ اور بیل منڈھے چڑھ سکے گی؟"

"مغیرہ بولا، کیوں نہیں!

یزید مغیرہ بن شعبہ کے سازشی دماغ کی اس حسب تمنا تجویز کو لے کر اپنے باپ کے پاس گیا معاویہ نے فوراً ہی مغیرہ کو طلب کیا اور پوچھا یزید نے تمہاری تجویز کے متعلق جو کچھ کہا ہے آیا یہ درست ہے؟ مغیرہ کہنے لگا

امیر المومنین! میں دیکھ رہا ہوں بہت خون بہ چکا ہے اور عثمان بن عفان کے قتل کے بعد امت میں جو اختلاف رونما ہوا وہ بھی میری نظروں کے سامنے ہے۔ یزید کی صورت میں تمہارا جانشین موجود ہے اس کو اپنا ولی عہد نامزد کر دیجیے تاکہ اگر آپ کو کچھ ہو جائے تو آپ کا لڑکا لوگوں کے لیے آپ کا جانشین اور رعایا کے لیے جائے پناہ ثابت ہو اور خوں ریزی اور فتنہ انگیزی کا امکان باقی نہ رہے۔

معاویہ بولا لیکن تمہاری اس تجویز پر عمل درآمد کے سلسلے میں میری مدد کون کرے گا؟

مغیرہ نے جواب دیا۔ "بصرہ والوں کے لیے میں کافی ہوں اور کوفہ

والوں کے لیے زیاد کافی رہے گا اگر ان دو مرکزی شہروں کا معاملہ درست رہے تو کہیں اور سے مخالفت کا امکان نہیں ہے۔"

معاویہ نے مغیرہ سے کہا۔ "ٹھیک ہے تم بصرہ کی گورنری سنبھالو اور وہاں بھروسہ کے آدمیوں سے اس بارے میں بات چیت کرو۔"

اس کے بعد مغیرہ، معاویہ سے رخصت ہو کر اپنے دوستوں کے پاس آیا اور بولا۔

"خوب رہی۔ میں نے معاویہ کا پاؤں ایک ایسی رکاب میں پھنسایا ہے جس میں سے وہ کبھی باہر نہیں آسکے گا اور امت محمدیہ پر اُس کے اثرات مدتوں تک محسوس کیے جاتے رہیں گے۔

بصرہ پہنچ کر اس ملعون شخص نے زرخرید لوگوں کے وفود بنا بنا کر معاویہ کے پاس بھیجنے شروع کیے جو معاویہ کو آکر یقین دلاتے تھے کہ یزید کی ولی عہدی اور حکومت کے لیے اس کی نامزدگی بہترین تجویز ہے ایسا ہی ایک وفد جو دس افراد پر مشتمل تھا۔ مغیرہ نے اپنے بیٹے موسیٰ بن مغیرہ کی کی سرکردگی میں معاویہ کے پاس بھیجا اس وفد نے معاویہ کو اپنی چرب زبانی کے ذریعے یہ تاثر دیا کہ حالات کا طبعی تقاضا یہ ہے کہ یزید کی بیعت لی جائے اور اسے ولی عہد نامزد کر دیا جائے۔ معاویہ نے اس وفد سے کہا۔

سردست تم اس رائے کا اظہار مت کرو اور اس مقصد کے لیے زمین ہموار کرتے رہو۔ پھر معاویہ نے وفد کے سربراہ موسیٰ بن مغیرہ بن شعبہ کو تنہائی میں بلا کر پوچھا کہ "تمہارے والد نے کتنے پیسوں میں ان لوگوں کا دین و ایمان خرید کیا ہے؟"

موسیٰ بن مغیرہ نے کہا "صرف تیس ہزار درہم میں۔"

معاویہ نے کہا۔ "ان کا دین تو بہت ارزاں رہا"

کہاں ہیں وہ لوگ جو صحابہ کی ہر غلط کاری کو اجتہادی غلطی سے تعبیر کرتے ہیں اور اس اجتہادی غلطی پر انھیں اجر و ثواب کا مستوجب گردانتے ہیں۔ مغیرہ بن شعبہ کا یہ طرز عمل کیا اجتہادی غلطی تھا یا اپنی گھٹیا اغراض کی تکمیل اور مطلب برآری کے ذلیل حربے تھے۔ ایک شخص صرف اپنی گورنری کے عہدہ کو برقرار رکھنے کی خاطر امت محمدیہ کو ایک ایسی صورت حال سے دوچار کر رہا ہے جس کی سنگینی کا اسے خود بھی احساس ہے وہ حاکم وقت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کے نااہل اور فاسق و فاجر بیٹے کی ولی عہدی کی تجویز پیش کرتا ہے اور اس کے عوض اپنی نوکری پکی کر لیتا ہے اور اس پر بھی فرومایہ لوگ اس بات پر بضد ہیں کہ "صحابہ کو کچھ نہ کہو"

اگر اسی کا نام اجتہادی غلطی ہے تو پھر جرم و گناہ کسے کہتے ہیں بد نیتی کیا ہے اور خبث باطن اور بد فطرتی کا کیا نام رکھا جائے۔

تمہاری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی

وہ تیرگی جو مرے نامۂ سیاہ میں ہے

اجتہادی غلطی کا اصلی رُوپ

"اجتہادی غلطی" کی یہ ملعون اصطلاح بھی خلیفۂ اوّل ابوبکر ابن ابی قحافہ .. "ایجاد بندہ" ہے جس طرح انھوں نے خالد بن ولید کی زنا کاری کو سند جواز بخشی اور اسے خالد بن ولید کی اجتہادی غلطی سے تعبیر کیا اس کے بعد وہ کونسا جرم باقی رہ جاتا ہے جسے اجتہادی غلطی کا جامہ پہنا کر مستحق تحسین قرار نہیں دیا جا سکتا۔

لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ صحبتِ نبوی کے فیض یافتگان سے گناہ و معصیت کا سرزد ہونا محال ہے اس غلط نظریہ کی اساس بھی یہی اجتہادی غلطی کا خود ساختہ فلسفہ ہے شرط صرف یہ ہے کہ وہ صحابی کوئی بھی ہو لیکن ہو سیدنا علیؑ کے مخالف کیمپ میں تب تو اس کی ہر غلطی کو یہ کہہ کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ "اس بیچارے سے اجتہادی غلطی" ہو گئی اور اجتہادی غلطی پر تو مجتہد کو اجر و ثواب ملتا ہے۔

اور اگر وہ صحابی محبانِ اہلِ بیتِ نبوت میں سے ہو اور سیدنا علی علیہ السلام سے رابطہ قلبی استوار رکھتا ہو تو اس کا کلمۂ حق کہنا بھی گناہ کبیرہ ہے جس کی سزا

بجز قتل کے اور کیا ہو سکتی ہے۔

معاویہؓ نے حجرؓ بن عدی کو دردناک طریقہ سے شہید کروادیا۔ معاویہؓ کا فعل اجتہادی غلطی کے زمرہ میں آئے گا اور حجرؓ بن عدی کا اپنی زبان کو حضرت علیؑ کی شان میں گستاخی سے آلودہ نہ کرنا گردن زدنی جرم قرار پائے گا۔

زانی سپہ سالار۔ خالدؓ بن ولید

جب خالدؓ بن ولید نے مالکؓ بن نویرہ کو اس جرم میں قتل کیا کہ وہ ایک حسین عورت کا شوہر تھا اور اس حسین عورت کو ابوبکر کا یہ چہیتا سپہ سالار ہر قیمت پر اپنے حجلۂ ہوس پرستی کی زینت بنانا چاہتا تھا اور اس نے مالکؓ بن نویرہ کو قتل کر کے ایام عِدّت ہی میں اس سے "صحبت سیئہ" کی مالک بن نویرہ مسلمان تھا اس نے خالد کے سامنے بھی کلمۂ شہادت پڑھا لیکن خالد نے سُنی ان سُنی کر دی اور اسے قتل کر کے دم لیا۔

یہ خالد کا پہلا فعل نہ تھا کہ اجتہادی غلطی پر محمول کیا جاتا اس سے پہلے بھی اس نے ایک شخص کو عہدِ رسالت میں اسی طرح انہی حالات میں قتل کیا تھا اور مقتول کے کلمۂ شہادت کے اقرار کو رد کر دیا تھا تب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خالد کو ڈانٹا تھا اس کے اس فعل سے اظہار برأت فرمایا تھا اور مقتول کے بارے میں خالد سے کہا تھا۔ اشققت قلبہ۔ کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا؟ اور مقتول کے وارثوں کو "دیت" ادا فرمائی تھی تاکہ ہمیشہ کے لیے نظیر قائم ہو جائے کہ کلمۂ شہادت کے اقرار کے

بعد جان لینے اور مار ڈالنے والا ہاتھ رک جائے۔

یہ کسی دوسرے یا تیسرے شخص کا واقعہ نہیں تھا صاحب واقعہ خود خالدؓ بن ولید تھا مگر وہ دوبارہ اسی جرم کا مرتکب ہوتا ہے اور اسے نہ تنبیہہ کی جاتی ہے نہ سرزنش الٹا اسے "اللہ کی تلوار" کا خطاب مرحمت کر دیا جاتا ہے۔ کیا اللہ کی تلوار سفاک ہوتی ہے کہ اپنے بیگانے سب کے سر کاٹتی چلی جاتی ہے کیا اللہ کی تلوار حسین عورتوں کے شکار کے لیے استعمال کی جاتی ہے کیا اللہ کی تلوار اندھی ہوتی ہے۔

کیا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسے شخص کو "سیف اللہ" (اللہ کی تلوار) کا خطاب مرحمت فرما سکتے تھے جس نے ان کی زندگی میں ناحق ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔ کیا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کا ارشادِ گرامی یہ ہے کہ

اتقوا فراسۃ المومن فانہ ینظر بنور اللہ تعالیٰ

صاحب ایمان شخص کی فراست اور معاملات کی تہ تک پہنچنے کی اس خداداد ذہانت سے بچتے رہو کہ وہ حقائق کو خدا کے عطا کئے ہوئے نور سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

مردم شناسی کی اتنی استعداد بھی نہیں رکھتے تھے کہ وہ خالدؓ بن ولید جیسے شخص کو اللہ کی تلوار کے خطاب سے نواز دیتے۔ یہ صحیح ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبع سامی میں ایک انسان کامل کی حیثیت میں مروت، حیا، چشمی، رواداری اور شرافت کے محاسن بدرجۂ اتم موجود تھے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی طبعی افتاد کی بنا پر ایسے لوگوں سے چشم پوشی اور صرف نظر فرماتے تھے جو اپنی خباثت طبع کا مظاہرہ کرتے رہتے تھے لیکن ایک

عظیم انقلابی رہنما، ایک زبردست عالمی مدبر، عوامی نفسیات کے بالغ نظر ماہر اور وحی والہام خداوندی کے مہبط و مورد کی حیثیت سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر شخص کے مقام سے بخوبی واقف اور ایک ایک فرد کی ذہنی، فکری اور عملی کیفیت سے بخوبی واقف تھے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے فرمان کے مطابق کہ المومن لایخدع ولایخدع۔ "مومن نہ دھوکہ دیتا ہے نہ دھوکا کھاتا ہے"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی بھی شخص کے ظاہر سے دھوکہ نہیں کھا سکتے تھے نہ اس کی باطنی کیفیات سے بے خبر رہ سکتے تھے۔

دس جنتیوں والی جھوٹی روایت

اور اُس کا جھوٹا راوی عبدالرحمٰن بن عوف

خطابات کی بات چلی ہے تو ضمناً اس حقیقت کا اظہار بھی بے محل نہ ہوگا کہ "صدیق اکبر" اور "فاروق اعظم" کے بھاری بھرکم خطابات جو اہل سنت کی کتابوں میں اور ہر کس و ناکس کی زبان پر خلیفہ اول و دوم کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں خود اہل سنت کی کسی معتبر و مستند کتاب میں اس کا کوئی مستند حوالہ نہیں ملتا۔

یہ خطابات بھی "عشرہ مبشرہ" والی روایت کی طرح من گھڑت اور خود ساختہ ہیں یعنی ان دس آدمیوں کا معاملہ جنھیں اس دنیا ہی میں جنت کی بشارت دی گئی اور جن کی ہر لغزش اور غلط کاری کو مواخذہ و احتساب سے بالاتر قرار دے دیا گیا ان دس آدمیوں کے جنتی ہونے کی جو ترتیب پیش کی گئی ہے وہ اس ترتیب کے عین مطابق ہے جو اہل سنت کے ہاں خلافت کے باب میں ملحوظ رکھی جاتی ہے یعنی پہلے ابوبکر کا نام ہے پھر عمر کا پھر عثمان

کا اور پھر جناب علیؑ علیہ السلام کا اور "عشرہ مبشرہ والی حدیث میں اس ترتیب کی رعایت اس حدیث کے موضوع اور جعلی ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے اس حدیث کے من گھڑت ہونے کا ایک اور واضح ثبوت یہ ہے کہ اس کا راوی عبدالرحمٰن بن عوف ہے جس کا نام بھی دس کی اس فہرست میں شامل ہے۔

مثل مشہور ہے "جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے" اب اگر عبدالرحمٰن بن عوف کو جس کی دسیسہ کاریوں سے اسلام کا دامن تاریخ تار تار ہے جنتی ہونے کا ایسا ہی شوق تھا کہ اس کے نام کے بغیر یہ فہرست مکمل ہی نہیں ہو پاتی تھی تو اسے اس مقصد کے لیے ابوہریرہ کی خدمات بڑی آسانی سے مہیا ہو سکتی تھیں ایک کروڑ پتی شخص کو دو چار ہزار درہم خرچ کرنے میں کیا تامل ہو سکتا تھا اگر اس کے نام کا پرچار ہو اور اسے دنیا ہی میں جنتی ہونے کی شہرت ملے لیکن اتنے گھاگ سیاست دان اور ایسے گرگ باراں دیدہ سے بھی چوک ہو گئی اور اس نے "در مدح خود می گوید" کے جوش میں اپنے حق میں ایک حدیث گھڑ لی حالانکہ پیشہ ور واضعان حدیث کی ایک اچھی خاصی تعداد اس وقت خود گروہ صحابہ میں موجود تھی بلکہ یہ وہ حمام تھا جس میں بڑے نامی گرامی لوگ ننگے تھے حتیٰ کہ خود خلیفۂ اول تو اس رسم کے بانی مبانی تھے۔ نحن معاشر الانبیاء لا نرث ولا نورث ما ترکنا فھو صدقۃ (ہم انبیا کا گروہ نہ کسی کے وارث بنتے ہیں نہ کسی کو اپنا وارث بناتے ہیں۔ ہم جو کچھ ترکہ چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے)

اس حدیث کے راوی حضرت ابوبکر ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ حدیث انھوں نے سیدہ فاطمہ علیہا السلام کو محروم ارث کرنے کے لیے بروقت وضع کی اور اس جماعت کا اعتراف تو خود محدثین نے کیا ہے کہ کسی اور صحابی کے علم میں یہ

حدیث یا اس کا مضمون نہیں تھا اب یہ کوئی ایسی راز کی بات بھی نہیں تھی کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف ابوبکر کے کان میں کہی اور کسی کو بھی کانوں کان خبر نہ ہوئی پھر ایسی حدیثیں بھی وضع کی گئی تھیں جن میں خلیفہ دوم عمر ابن خطاب کی فضیلت حضور نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ثابت ہوئی تھی اور ان کی برتری پیغمبرؐ کی عظمت سے بھی سبقت لے گئی تھی مگر وہ لوگ سیانے تھے کہ انھوں نے اس قسم کی حدیثیں خود گھڑنے کا تکلف گوارا نہیں کیا بلکہ اس کے لیے "کرایہ کے آدمیوں" کی خدمات حاصل کیں۔ عبدالرحمن بن عوف چاہتے تو ایسے ہی کسی کرایہ کے آدمی سے اس قسم کی روایت کہلواتے تو کچھ بات بن جاتی مگر یہاں وہ ٹھوکر کھا گئے اور اس طرح ان کا جھوٹ موقع پر پکڑا گیا۔

باقی رہی ان دس آدمیوں میں سیدنا علی علیہ السلام کے نام کی شمولیت تو یہ محض برائے وزن بیت تھی عبدالرحمن بن عوف سے زیادہ کون اس حقیقت سے واقف ہوگا کہ اگر ان دس آدمیوں میں سیّدنا علیؑ ابن ابی طالبؑ کا نام شامل نہ کیا گیا تو باقی نو آدمیوں کے جنتی ہونے پر کوئی بھی یقین نہیں کرے گا البتہ اگر حضرت علیؑ کا نام اس فہرست میں درج ہو جائے تو باقی نو کی بات بھی پکی ہو جائے گی۔

لیکن ان جنتیوں کے بارے میں ایک اور جنتی کی کیا رائے تھی اس کا مفصل تذکرہ کتب سیر و حدیث میں ملتا تھا خلیفۂ دوم عمر ابن خطاب کو جب ابولولو فیروز مجوسی نے زخمی کر دیا اور وہ بستر مرگ پر تھے تو انھوں نے عشرۂ مبشرہ کے گھرانہ کے ان افراد کو طلب کیا جو بقید حیات تھے یہ چھ حضرات تھے اور خلیفۂ دوم نے خود ہی ان کے نام تجویز کیے تھے کہ ان میں سے کسی ایک کو ان کے بعد خلیفہ منتخب کیا جائے جب یہ لوگ ان کے ہاں جمع ہوئے تو انھوں

نے اپنی روایتی بد لحاظی اور بے مروتی کے ساتھ ان سے جو سوال کیا وہ ان کی دیرینہ عادت کے عین مطابق تھا انھوں نے پوچھا۔ اکلکم یطمع فی الخلافۃ بعدی؟ (کیا تم میں سے ہر شخص کو میرے بعد خلیفہ بننے کی ہوس ہے) اس پر لوگ چپ رہے دوبارہ حضرت عمر نے اپنا سوال دہرایا اس پر حضرت زبیر ابن العوام نے جواباً بڑے تلخ لہجہ میں زخمی خلیفہ سے کہا

وما الذی یمنعنا منہا وقد ولیتہا انت فقمت بہا ولسنا دونک فی قریش ولا فی السابقۃ۔

"ہمیں اس مسند پر بیٹھنے میں کونسی چیز مانع ہے جس پر تم بیٹھ کر کامیابی سے حکومت چلاتے رہے ہو ہم تم سے نہ تو قریش کے قبیلہ میں حیثیت و منزلت کے اعتبار سے کم تر ہیں نہ اسلام میں سبقت کے لحاظ سے تم سے پیچھے ہیں اس جواب سے بدمزہ ہو کر خلیفہ دوم نے کہا۔ میں تمہیں تمہاری حقیقت سے آگاہ نہ کر دوں۔ جواب ملا کہو جو کچھ کہنا چاہتے ہو وہ تم کہہ کر رہو گے اور ہماری تمہیں پہلے کب پرواہ تھی جواب ہوگی۔ عمر سب سے پہلے زبیر پر برسے اور بولے۔

اما انت یا زبیر! نوعق نفس مؤمن الرضا کافرا لغضب یوما انسان ویوما شیطان (زبیر! جہاں تک تمہارا تعلق ہے تم ایک یاوہ گو اور بدزبان شخص ہو، خوش ہو تو مومن غضبناک ہوتے ہو تو کافر ہوتے ہو ایک دن انسان ہوتے ہو دوسرے دن شیطان کا روپ دھار لیتے ہو)

جنّت کی بشارت پانے والا ایک شخص جنت کی بشارت پانے والے دوسرے شخص کو شیطان کا خطاب دے رہا ہے اور جنّت ہے کہ دونوں کے قدموں میں لوٹ رہی ہے۔

اس کے بعد ہمارا یہ زخمی شیر جولب گور ہے دوسرے جنتی کی جانب متوجہ ہوا یہ طلحہ تھے جنھوں نے عمر کی خلافت کے لیے نامزدگی کے موقعہ پر ابوبکر سے کہا تھا۔

ما انت قائل لربك غدا وقد وليت علينا فظا غليظا تفرق منه النفوس وتنغص منه القلوب.

"کل خدا کو کیا جواب دو گے تم ہم پر ایک ایسے شخص کو مسلط کر رہے ہو جو نہایت تند خو اور بدمزاج انسان ہے لوگ جس کے نام سے گریزاں اور دل جس کے تذکرے سے مکدّر ہو جاتے ہیں۔"

عمر ابن خطاب اس نقرے کی چبھن ابھی تک محسوس کر رہے تھے اس لیے انھوں نے بڑے تلخ لہجہ میں طلحہ سے کہا۔ تمہارے متعلق بھی کہوں یا خاموش رہوں۔ طلحہ نے ترت جواب دیا

قل فانت لاتقول من الخير شيئاً

"کہہ ڈالو یہ تو ہمیں علم ہے کہ تمہاری زبان سے خیر کا کوئی کلمہ صادر نہیں ہوگا۔"

عمر ابن خطاب نے جو عبدالرحمن ابن عوف کے قول کے مطابق دس جنتیوں میں سے ایک تھے اپنے جنتی بھائی سے مخاطب ہو کر کہا۔

اما انی اعرفك منذ اهيبت اصبعك يوم احد والذى حدث لك ولقد مات رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم ساخطا عليك بالكلمة التى قلتها يوم انزلت آية الحجاب.

"میں تمہیں اس وقت سے جانتا ہوں جب جنگ احد میں تمہیں حادثہ پیش آیا تھا اور تمہاری ایک انگلی اس حادثہ کا شکار ہو گئی تھی اور واقعہ

یہ ہے کہ حضور نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جب وصال ہوا تو تم سے سخت ناراض تھے اس فقرے کی بنا پر جو تم نے آیت حجاب کے نزول کے وقت کہا تھا۔

اور وہ فقرہ جو بستر مرگ پر بھی عمر ابن خطاب کو یاد رہا وہ طلحہ کا وہ گستاخ اور شوخ چشمانہ قول تھا جو آیت حجاب نازل ہونے کے وقت بے ساختہ طلحہ کے منہ سے نکل گیا تھا۔ حدیث میں یہ فقرہ کچھ اس طرح نقل کیا گیا ہے۔

ما الذی یغنیہ حجابہن الیوم وسیموت غدا فننکحہن

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیگمات کو پردہ میں رکھنے سے حضور کو کیا فائدہ۔ کل جب "ان" کا (یعنی حضورؐ کا) انتقال ہو جائے گا تو پھر ہم ان بیگمات کو اپنے نکاح میں لے آئیں گے۔

طلحہ نے جنھیں عبدالرحمٰن ابن عوف نے ان دس آدمیوں کی فہرست میں شامل کیا ہے جو بقول ان کے جنتی ہیں یہ فقرہ بھری محفل میں کہا اور بعض صحابہ نے اسے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سمع گرامی تک پہنچایا۔ انتخاب خلیفہ کے لیے چھ آدمیوں کی جو کمیٹی خلیفہ دوم نے مقرر کی تھی اس کے بارے میں تمام محدثین و مورخین نے ان سے یہ بات منسوب کی ہے کہ انھوں نے ان لوگوں کے بارے میں کہا تھا۔ لم ارا حداً احق بھذا الامر من ھؤلا الستہ الذین توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وھو عنھم راض۔ "ان چھ آدمیوں سے زیادہ موزوں مجھے اور کوئی نظر نہیں آتا۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب حضورؐ کا وصال ہوا تو وہ ان سے راضی تھے" لیکن ایک سانس میں یہ بات کہہ کر دوسرے سانس میں وہ ان چھ میں سے کم از کم دو کو سراسر نااہل، ان میں سے ایک کو شیطان اور کافر اور دوسرے کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ناپسندیدہ شخص قرار دے رہے ہیں۔

خلیفۂ دوم کی تضاد بیانیاں

اس تضاد بیانی اور ژولیدہ فکری کی وجہ شدید زخمی ہونا نہیں ہے بلکہ خلیفۂ دوم کی پوری زندگی اسی ذہنی انتشار کی آئینہ دار رہی ہے وہ وقفہ وقفہ سے بیان بدلنے میں یدطولیٰ اور مہارت تامہ رکھتے تھے اسے آپ شدید جذباتیت بھی نہیں کہہ سکتے کہ جذباتی انسان اعلان محبت اور اظہار نفرت میں کوئی تامل نہیں کرتا نفرت ومحبت کے باب میں اس کے جذبات میں شدت پسندی ہوتی ہے لیکن حضرت عمر سے توخود ان کی بیوی کو یہ شکوہ رہا کہ زندگی میں ایک بار بھی اس کے شوہر نے اس سے محبت کا اظہار نہیں کیا

ان کی بیان بدلنے کی یہ عادت ہمیشہ کسی نہ کسی وقتی مصلحت پر مبنی تھی مثلاً انھوں نے ایک بار حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے آپ سے محبت تو ضرور ہے مگر اپنی جان سے زیادہ نہیں۔ اس پر حضور نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا" تمہارا ایمان ابھی مکمل نہیں ہوا۔"

یہ سن کر اسی مجلس میں اور اسی لمحہ اعتراف کر لیا کہ آپ تو مجھے اپنی

جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں. لیکن جان سے زیادہ پیار کرنے والا یہ شخص صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر ہی شک وشبہ کا اظہار کرنے لگا جس پر بعد میں کہا کہ مجھے آج بھی اپنی اس تلخ کلامی پر ندامت ہے جو صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے مجھ سے سرزد ہوئی تھی.

ایک طرف تو ان کی نیازمندی کا یہ عالم تھا کہ بات بے بات پہ وہ کسی قصوروار صحابی کے لیے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت طلب کر رہے ہیں کہ یارسول اللہؐ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کی گردن ماردوں.

دوسری جانب جب ابوسفیانؓ کی بیوی اور معاویہؓ کی ماں ہندہ بنت ربیعہؓ بادل نخواستہ بیعت کے لیے بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئی اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے قرآن مقدس کی ہدایت کے مطابق عہد لینا شروع کیا جس کی ایک شق یہ تھی کہ " تم اپنی اولاد کو قتل نہیں کروگی. تو اس شتر کینہ شوخ چشم اور بدنہاد عورت نے زہر بھرے طنز کے ساتھ کہا۔

ربینا ھم صغیرا وقتلھم یوم بدر کبیرا۔

"ہم نے تو اپنی اولاد کو بچپن میں پالا پوسا تھا اور جب وہ بڑے ہوئے تو تم نے جنگ بدر میں انھیں تہ تیغ کر دیا۔"

بارگاہ نبوت میں یہ گستاخانہ فقرہ سن کر ایک مسلمان کا خون کھول جانا چاہیے تھا مگر عمر ابن خطاب کے سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا اور وہ یوں کھل کھلا کر ہنسے گویا ہندہ نے ان کے دل کی بات کہہ دی ہو۔

جن لوگوں کو تہذیب و شائستگی سے ذرا بھی واسطہ رہا ہے وہ جانتے ہیں کہ دشمن کی کسی طنز یہ بات پر دوست کے اوپر ہنسنا بلکہ مسکرانا بھی ایک غیر دوستانہ عمل ہے لیکن یہاں عمر ابن خطاب کھل کھلا کر اور قہقہہ مار کر ہنس رہے ہیں کس پر اس مقتدا، و پیشوا پر جسے وہ بار بار اپنی وفاداریوں کا یقین دلاتے نہیں تھکتے۔

اب یہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ظرف تھا کہ وہ اس گستاخ اور بے حیا کے اس بے ہودہ فقرے "گندم نما جو فروش یا دوست نما دشمن کے بیباک قہقہہ پر بھی ضبط فرما گئے" کوئی اور ہوتا تو ایسے شخص کو جوتے لگوا کر اپنی مجلس سے باہر نکال دیتا۔

اب یہ بھی تو ان کی تضاد بیانی اور ژولیدہ فکری ہی کا ثبوت ہے کہ جب انصار کے مقابلہ میں وہ ابو بکر کی خلافت کی راہ ہموار کر رہے تھے اور دراصل اس کی آڑ میں وہ اپنے اقتدار کا ڈول ڈال رہے تھے تو انھوں نے اس موقعہ پر انصار کا منہ یہ کہہ کر بند کر دیا تھا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے الائمۃ من قریش (حکمراں صرف قبیلہ قریش میں سے ہونے چاہئیں)"

لیکن جب بستر مرگ پر تھے تو انھوں نے اپنے ہی کہے کو یہ کہہ کر ملیا میٹ کر دیا کہ "آج اگر حذیفہ کا غلام سالم زندہ ہوتا تو میں بغیر کسی مشورہ کے اسے خلافت کے لیے نامزد کر دیتا۔"

جب اپنا اور اپنے پسندیدہ شخص کا انتخاب درپیش تھا تو قریش کے حکمراں بننے کی بحث کرتے رہے اور جب اس بہتی گنگا میں سے ہاتھ دھو لیے تو اب وہ ایک غلام کی بابت سوچنے لگے کہ امت محمدیہ کی زمام کار اگر وہ زندہ ہوتا تو

اس کے حوالے کر دیتے. موجودہ دور میں کامیاب سیاست داں وہ کہلاتا ہے جس کا ضمیر اس حد تک مردہ ہو چکا ہو کہ وہ اپنی کہی ہوئی بات سے پھرنے میں نہ ہچکچائے نہ شرمائے اس اعتبار سے دیکھا جائے تو عمر ابن خطاب حقیقتاً ایک زبردست سیاست داں تھے اور پینترا بدلنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے.

یہ الگ بحث ہے کہ آیا اس قسم کی دورخی سیاست کی گنجائش اسلام میں ہے یا نہیں اس کی فکر تو ان لوگوں کو تھی جو اسلام کی تمام مزاجی خصوصیات اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھے اور اس لیے بساطِ سیاست پر اپنے حریفوں سے مات کھا گئے.

جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہزاروں کے مجمع میں من کنت مولاہ فعلی مولاہ کا آوازہ بلند کیا تو سب سے پہلے جس شخص نے سیدنا علیؑ ابن ابی طالبؑ کو مبارک باد دی. وہ یہی حضرت تھے لیکن یہ ان کی سیاسی قلابازی تھی کہ جب علیؑ ابن ابی طالبؑ کی "مولائیت" کے نفاذ قیام کا وقت آیا تو انھوں نے یوں آنکھیں پھیر لیں اور طوطا چشمی کا ایسا مظاہرہ کیا کہ عقل دنگ رہ گئی.

تاریخ بتاتی ہے کہ جناب عمر کو اس امر کا بخوبی احساس تھا. اور علم بھی کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسند خلافت پر علیؑ ابن ابی طالبؑ کے سوا اور کوئی ممکن نہیں ہو سکتا یہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواہش بھی تھی اور وصیت بھی لیکن حضرت علیؑ کو اس جانشینی سے محروم کرنے میں سب سے زیادہ اور بڑھ چڑھ کر خود عمر ابن خطاب نے حصہ لیا اگرچہ انھوں نے دبے لفظوں

میں عبداللہ ابن عباس کے سامنے اپنی اس غلط روی کا اعتراف بھی کر لیا لیکن ایک کامیاب سیاست داں کی طرح انھوں نے مرتے دم تک یہ کوشش کی کہ سیدنا علیؑ ابن ابی طالبؑ کو مسند خلافت سے دور رکھا جائے اور اس مقصد کے لیے عبدالرحمن ابن عوف کو خصوصی اختیارات دیے۔

ایک معمولی سوجھ بوجھ کا شخص بھی انتخاب خلیفہ کے لیے عبدالرحمن بن عوف کو خصوصی اختیارات دینے کی علت معلوم کر سکتا ہے عبدالرحمن ابن عوف عثمان بن عفان کے قریبی رشتے دار تھے اور ظاہر ہے ان کا جھکاؤ عثمان ہی کی جانب ہونا تھا چنانچہ وہ ایک سیاسی چال کے ذریعہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے

ہماری تاریخ کا سب سے حیرت انگیز اور تعجب خیز پہلو یہ ہے کہ اس میں جو شخص جتنا بڑا ظالم خوں خوار، سفاک اور جابر و ستمگر ہوا اتنا ہی اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے گئے اور اس کی عظمت کے خوب ڈنکے بجائے گئے ہم نے اپنے زمانہ میں خود اپنے ملک کے اندر بعض ایسے کم سواد لوگوں کو دیکھا کہ وہ جب کسی حصہ ملک کے اقتدار پر قابض ہوئے اور انھوں نے اپنے دور اقتدار میں ظلم و تشدد کا بازار گرم کیا تو ان ظالم اور مدنہاد حکمرانوں کی بیحد تعریف کی گئی اور انھیں "مرد آہن" کے بھاری بھر کم خطاب سے نوازا گیا ان کی مدح سرائی میں قصیدے لکھے گئے ان کی حب الوطنی کو خراج تحسین پیش کیا گیا یہ روایت کوئی نئی نہیں ہے ہر دور میں اس روایت کو دہرایا جاتا رہا عمر ابن خطاب کی سخت گیری، بے جا احتساب، دار و گیر کی گرم بازاری اکابر صحابہ کے ساتھ بدسلوکی کے قصوں کو جتنی زیادہ زیادہ شہرت ملی ان کی عظمت کا سکہ اسی قدر زیادہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا۔

مسلمان قوم کی اس سے بڑی بدبختی اور روسیاہی اور کیا ہو سکتی ہے

کہ اسے ظلم سے نفرت اور ظالم سے اظہار بیزاری کی بار بار تاکید کی گئی تھی لیکن اس نے ہر ظالم حکمراں کو اپنا آئیڈیل بنا لیا اور اس کے گن گانے لگی۔

ہمارے مورخوں نے دور بنی امیہ و بنی عباس کے ظالم و سفاک حکمرانوں کی منقبت میں کتابیں لکھیں اور اس پر داد کے ڈونگرے برسائے گئے۔

ماضی قریب میں شبلی نعمانی نے "المامون" لکھ کر عہد بنی عباس کے اس ظالم اور خوں خوار خلیفہ کو نہایت علم دوست، ادب پرور اور انصاف پسند حکمراں ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

یہ وہی شبلی نعمانی ہے جس نے "الفاروق" لکھ کر خلیفۂ دوم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی بڑا مدبر اور صاحب الرائے قائم کیا تھا اور ان کی تحریف دین کی کوششوں کو سند جواز بخشا تھا۔

اس مورخ نے اسکندریہ کے کتب خانہ کو جلانے کے الزام سے خلیفۂ دوم کو بری الذمہ قرار دینے میں بھی ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا لیکن ابن خلدون کی اس روایت کی تردید کرنے کی اسے جرائت نہ ہوسکی جس میں خلیفۂ دوم کے حکم سے فارس کے کتب خانوں کو جلانے اور دریا برد کرنے کا پتہ چلتا ہے۔ جرم کی نوعیت ایک ہو تو مجرم کی صفائی پیش کرنے سے کیا حاصل۔ ابن خلدون لکھتا ہے۔

"ظہور اسلام کے بعد جب فارس فتح ہوا اور اس میں کتب خانے دستیاب ہوئے تو حضرت سعد ابن ابی وقاص نے حضرت عمر ابن خطاب کو لکھا کہ ان کے بارے میں کیا کیا جائے اگر اجازت ہو تو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے آپ نے فرمان صادر فرمایا کہ ان کو دریا برد کر دو کیونکہ اگر ان میں ہدایت ہے تو اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہم سب کو بالاتر ہدایت مل چکی ہے اور اگر ان میں

گمراہی ہے تو ہم اس کے حاجت مند نہیں لہذا تعمیل حکم میں کچھ کتابوں کو دریا برد کیا گیا اور کچھ کو نذر آتش کیا گیا اور یوں پارسی علوم و فنون کا ذخیرہ ہم تک نہ پہنچ سکا۔ (مقدمہ ابن خلدون ترجمہ مولوی سعد حسن خاں یوسفی مطبوعہ کراچی)

یہ طرز عمل اس شخص کا جو خود کو پیغمبرؐ خدا کا جانشین قرار دیتا ہے لیکن کتابوں کو نذر آتش کرنے اور دریا برد کرنے کا فرمان جاری کرتا ہے حالانکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو پہلی وحی نازل ہوئی وہ قلم کے تقدس کی حامل تھی اور یہ فرمان بھی اسی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تھا کہ

کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن حیث اخذھا فھو احق بھا۔

(دانائی کی بات مومن کی متاع گم گشتہ ہے حکمت و دانش کی بات اسے جہاں سے بھی ملے وہ اسے قبول کرے کہ وہی اس کا سب سے زیادہ حق دار ہے)

تہذیب و شائستگی کے کسی دور میں بھی کسی قوم کے علمی ذخیرہ سے دشمنی کا ایسا مظاہرہ کبھی نہیں ہوا جیسا کہ خلیفہ دوم کے عہد میں کیا گیا۔

ہفت روزہ چٹان لاہور کے ایک پرانے شمارہ میں جواہر لال نہرو (وزیر اعظم ہند) کے واقعات میں پڑھا تھا کہ تقسیم ہندوستان کے ہنگاموں میں جب مسلمانوں کی ایک لائبریری کو ہندو غنڈوں نے آگ لگائی تو نہرو نے یہ منظر دیکھ کر دلی کے چیف کمشنر سے غضبناک ہو کر کہا۔

"دیکھتے ہو یہ کیا جل رہا ہے یہ ہماری تہذیب و تمدن کا اثاثہ نذر آتش ہو رہا ہے"

ایران دنیا کی قدیم ترین تہذیب کا مسکن تھا اور پھر یہ زرتشت جیسے مقدس انسان کا وطن بھی تھا اس کی آسمانی کتاب "ژند اوستا" کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت

طیبہ سے کم از کم پانچ سو سال قبل کی یہ کتاب حیرت ناک حد تک قرآن مقدس کے مضامین سے مطابقت رکھتی ہے۔

اس قدیم تہذیب کی آئینہ دار علوم وفنون کی معرکہ آرا کتابوں کو جلانے کی کیا تک تھی اور کیا یہ گھناؤنا جرم اسلام کے مزاج عمومی سے ادنیٰ سی مطابقت بھی رکھتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود حکم یہ ہے کہ یہ خلافت راشدہ تھی اور اس نے جو گل کھلائے ہیں انھیں عین اسلام سمجھو اور ان پر زبان طعن دراز نہ کرو۔

اجتہادی غلطی کی من گھڑت اصطلاح کی طرح " خلافت راشدہ" کی اصطلاح بھی اسی لیے وضع کی گئی اور ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو خلیفۂ راشد قرار دے کر اس کے سیاہ کارناموں پر پردہ ڈال دیا گیا۔ یہی وہ "سنت شیخین" تھی جس کی اتباع کا مطالبہ سیدنا علیؑ کرم اللہ وجہہ الکریم کی ذات اقدس سے کیا گیا اور سیدنا علیؑ نے اسے انتہائی حقارت سے ٹھکرا دیا تھا اور یوں اپنی حق تلفی گوارا فرمالی لیکن سنت پیغمبری سے انحراف گوارا نہ فرمایا۔

سنت و اسوۂ پیغمبری سے انحراف کا یہ پہلا واقعہ نہ تھا جو ایک خلیفہ راشد نے اپنے دور اختیار میں روا رکھا۔ اس خلافت راشدہ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہر عمل اور آپ کی ہر سنت کو پامال کرنا اپنا دل پسند مشغلہ بنا لیا تھا۔

اسلام میں ہوس ملک گیری کا کیا جواز ہے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کا ایک واقعہ بھی پیش نہیں کیا جا سکتا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قوموں ملکوں اور قبیلوں پر چڑھائی کی ہو جارحانہ جنگ کا اقدام کیا ہو بلا کسی وجہ اشتعال کے کسی قوم یا ملک سے نبرد آزمائی کی ہو۔

دنیا کا کوئی نظام، کوئی نظریہ، کوئی آئین اور کوئی دین و مذہب تیغ آزمائیوں اور ترکتازیوں کے ذریعے نہیں پھیلا ہمیشہ اپنے اچھے اصولوں، اپنے دلکش نظریات اور اپنی اعلیٰ اقدار کے ذریعہ رواج پزیر ہوا ہے۔

اسلام جو آسمانی ہدایت کا اولین اور آخرین منشور ہے وہ اپنی تعلیمات کے فروغ کے لیے کسی تلوار کا رہین منت نہیں ہے۔ لیکن یہ خلافت راشدہ تھی جس نے "اسلام تلوار کے زور سے پھیلا" کا تصوّر پیدا کیا اور اس طرح امن و سلامتی کے سب سے بڑے علمبردار مذہب کو غیروں کی نگاہ میں ایک خونی اور شمشیر بہ کف مذہب کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔

نعرہ بازی اور ہنگامہ خیزی کی سیاست میں شاید اس بات کا سمجھنا مشکل ہو کہ روم و ایران و شام و مصر کی طرف جنگی مہمات کے بھیجنے کا مقصد ہرگز ہرگز تبلیغ اسلام اور اعلا کلمتہ الحق نہیں تھا کہ دین کی تبلیغ کے لیے تلوار اٹھانا ایک غیر مہذب فعل اور ایک غیر شائستہ طریق کار ہے دنیا میں جن مذاہب کو ڈنڈے کے زور سے منوایا گیا آج ان مذاہب کی شکل و صورت اس حد تک مسخ ہو چکی ہے کہ ان کی اصل تعلیمات کا سراغ لگانا مشکل ہو گیا ہے۔

اسلام کی کتاب قانون و دستور، قرآن مقدس میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ تم بہ زور شمشیر دنیا میں اسلام کا پیغام پھیلاؤ اور ایک ایک ملک پر فوج کشی کر کے اس کے باشندوں کو حلقہ بگوش اسلام کر دیا انہیں اپنا باج گزار بناؤ۔ قرآن کی ہدایات اس باب میں بالکل واضح ہیں وہ کہتا ہے۔

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی (پ ۳ سورہ بقرہ)

(دین میں جبر و اکراہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہدایت اور گمراہی کے خطوط متعین ہو چکے ہیں۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہوا۔

وقل الحق من ربکم فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر (پ ۱۵ سورۂ کہف)

۔آپ کہہ دیجئے کہ سچائی کا یہ سندیسہ تم لوگوں کے پروردگار کی جانب سے ہے اب جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے کفر کی روش اپنا لے۔

خلافت راشدہ کا اسلام

ایک خون آشام مذہب

اسلام اگر عقل و دانش اور دلیل و منطق کا دین ہے تو اسے دین فطرت کہا جائے گا لیکن اگر اس کے ہاں استدلال کا فقدان ہے تو وہ دین تو نہ ہوا وہ تو محض لٹھ بازی اور شمشیر زنی کا مظاہرہ ہوا۔

قرآن مقدس نے اپنی تعلیمات کی اساس عقل و دلیل کو قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

یھلک من ھلک عن بینہ ویحییٰ من حیی عن بینہ

(پ ۱۰ سورۂ انفال)

جسے تباہ ہونا ہو وہ بھی دلیل کی رو سے تباہ ہوا اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل کے ساتھ زندہ رہے۔

دلیل و دانش کے علم بردار مذہب کو "خلافت راشدہ" نے خوں آشام مذہب میں تبدیل کرکے اسلام کے حق میں جو کانٹے بوئے اسلام کا

دامن آج تک اس سے تار تار ہے۔

دنیا میں گوتم بدھ اور یسوع مسیح کو امن و آشتی کا پیغمبر قرار دیا جاتا ہے اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شمار جنگ جو پیغمبروں میں کیا جاتا ہے اس سے بڑھ کر تاریخ کی ناانصافی اور کیا ہو سکتی ہے اور یہ سب کیا دھرا ان "خلفائے راشدین" کا ہے جو اسلام کی داخلی اور خارجی پالیسیوں کو اسلام کی مقدس تعلیمات سے ہٹا کر اپنی مستبدانہ خواہشات کے مطابق ڈھالنے میں کامیاب ہو گئے اور اس طرح اپنے وقتی مفاد اور ہنگامی مصلحت کے تحت اسلام کی رسوائی کا باعث بنے اسلام کے دامن خوشنما پر یہ ایک ایسا بدنما داغ خلفائے ثلاثہ کی شورش انگیزیوں سے لگا ہے کہ ہزار کوشش کے باوجود اسے دھویا نہیں جا سکا اور مسلمانوں کو چھوڑ کر پوری دنیائے انسانیت اسلام کو ایک قاتلانہ مذہب قرار دیتی چلی آئی ہے۔ بلاشبہ اسلام میں جہاد کی مشروعیت جاری و ساری ہے اس لیے کہ اسلام غیرت و حمیت کا مذہب ہے.... کوئی شخص یا گروہ یا کوئی ملک اور قوم مسلمانوں کی غیرت و حمیت کو للکارے تو مدافعت کا حق پیروان اسلام کو حاصل ہے لیکن چنگیز و ہلاکو کی طرح دوسری قوموں یا ملکوں پر یلغار کرنا انہیں تاخت و تاراج کرنا ان کی تہذیب و معاشرت اور ان کے تمدن و ثقافت کو ملیامیٹ کر دینا اسلام کی روح اور اس کے مزاج اور اس کی منشا کے خلاف ہے۔

میں جانتا ہوں صدیوں سے مسلمان قوم کا جو عمومی مزاج بن چکا ہے اس کی بنا پر یہ بات شاید اس کے حلق سے نیچے نہ اتر سکے کہ اسلام جارحیت کا مذہب نہیں ہے وہ جنگ جویانہ جوش و جذبہ کی اسی حد تک حوصلہ افزائی کرتا ہے جہاں تک اس کی بقا کے لیے یہ ناگزیر ہو۔ وہ امن و سلامتی کا داعی

ہے وہ زمین پر فتنہ و فساد پھیلانے کی سختی سے ممانعت کرتا ہے پے درپے فتوحات اور ملک گیری کی پیہم کوششیں اور جنگ وجدال اور قتل و خوں ریزی کی مسلسل واردات اسلام کے پروگرام کا کوئی حصہ نہیں ہیں۔

لیکن خلافت راشدہ کے تین ابتدائی عہدوں میں مسلمانوں نے اسلام کے نام پر جو معرکہ آرائی اور جنگ جوئی کی راہ اختیار کی اور اپنوں اور بیگانوں پر یکساں انداز میں جس طرح لڑائی مسلط کی اور پوری امت مسلمہ پر جس انداز میں ہنگامی صورت حال کا نفاذ کئے رکھا وہ اسلامی تاریخ کا ایک شرم ناک باب ہے اور آج تک ہم ان جنگوں اور ہنگاموں کی جواب دہی سے قاصر ہیں اور قوموں کی برادری میں شرمسار ہیں۔

غزوۂ تبوک اور پیغمبرِ اسلام کی امن پسندی

کیا اسلام ایک فاشسٹ نظام ہے کیا وہ نپولین، ہٹلر اور مسولینی جیسے فاتح یا خوں خوار انسان پیدا کرنا چاہتا ہے کیا وہ خدائی فوجداروں کا ٹولہ ہے جو بلا روک کبھی ایک طرف یلغار کرتا ہے کبھی دوسری طرف جہاں تک حضور سرور کائنات محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت سیئہ کا تعلق ہے وہ تو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ رومی فوجوں کی جانب سے مملکت اسلامی کے وجود کو شدید خطرہ لاحق ہوا اس سے پہلے یہ اسلام دشمن طاقت دنیا کے مسلمہ بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سفیر کو قتل کر چکی تھی اور اسی وقت سے مسلمانوں کے معاملہ میں اس کا رویہ معاندانہ رہا تھا سریہ مؤتہ بھی اسی کا ردعمل تھا جس میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عم زاد حضرت جعفرؑ طیار شہید ہوئے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رومی سلطنت کی اس جارحانہ

کارروائی کے معاملہ میں فوجی تیاری کا حکم دیا، حالات انتہائی ناساعد تھے موسم سخت گرم تھا جنگی ساز و سامان کی کمی تھی اور اس کی بہم رسانی کے لیے اسباب و وسائل نہایت محدود تھے۔ سفر بھی دور دراز کا تھا غرضکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کا یہ ایک کٹھن اور مشکل مرحلہ تھا جسے سر کرنے کے لیے بہت کچھ تگ و دو اور دوڑ دھوپ کرنی پڑی حتیٰ کہ قرآن مقدس میں اس لشکر کو "جیش عسرت" سے تعبیر کیا گیا۔

فوجی جمعیت کے ساتھ جب حضور اقدس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "تبوک" کے مقام پر پہنچے جو رومی سلطنت کی سرحد پر واقع ایک مقام تھا تو حریف فوجیں میدان سے غائب تھیں اور دشمن کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں تھا۔

یہیں وہ فرق واضح ہوتا ہے جو ایک پیغمبر اور ایک طالع آزما فوجی جرنیل کے درمیان ہوتا ہے حضور نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب دیکھا کہ دشمن اپنی جارحانہ کارروائیوں کے علی الرغم میدان سے غائب ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ گوارا نہ فرمایا کہ دشمن کے علاقہ پر یلغار کی جائے دشمن کی سرحد کے اندر گھس کر زیادہ نہیں تو کچھ آس پاس کی بستیوں ہی کو زیر نگیں کر لیا جائے اتنی طویل مسافت طے کرنے کے بعد بغیر کسی کارروائی اور کارگزاری کے واپس لوٹنا ٹھیک نہیں ہے اس لیے دشمن کے کچھ علاقے ہتھیا لیے جائیں یہ سب کچھ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی کر سکتے تھے لیکن اسلام کے عالمگیر مذہب کی امن پسندی پر یقیناً اس سے حرف آتا اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقاصد بعثت و رسالت پر اعتراض کا پہلو ابھرتا۔

تاریخ وسیر کی تمام کتابیں اس امر پر متفق ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لے آئے اور کسی قسم کا جنگی اقدام نہیں کیا گیا اس لیے کہ اسلام جنگ وجدال کا مذہب نہیں ہے صلح وامن کا پیغام بر ہے۔

غزوہ تبوک کی اہمیت کا تاریخ اسلامی میں اپنا ایک خاص مقام ہے اور یہ وہ پہلی جنگی سرگرمی تھی جس میں ہر عاقل و بالغ مسلمان کی شرکت کو لازمی قرار دیا گیا تھا حتیٰ کہ جن تین آدمیوں نے محض تساہل پسندی سے اس جنگ میں حصہ لینے سے گریز کیا ان کا مکمل سوشل بائیکاٹ کیا گیا ان کی بیویوں کو بھی ان سے بول چال تک سے روک دیا گیا۔

بایں ہمہ جنگ میں پیش قدمی اور جارحانہ کارروائی سے مکمل اجتناب کیا گیا اور دشمن کی فوجوں کو موجود نہ پاکر موقعہ کو غنیمت نہیں جانا گیا بلکہ جنگ سے گریز کیا گیا۔

یہ حضور نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مصلحت پسندی نہ تھی کہ جنگ سے گریز کیا گیا کیونکہ پیغمبرؐ کا کوئی کام مصلحت کوشی پر مبنی نہیں ہوتا وہ جو کچھ کرتا ہے ہدایت خداوندی کی بنیاد پر کرتا ہے جنگ سے اجتناب کی اصل وجہ یہ ہے کہ پیغمبرؐ کی بعثت قوموں اور ملکوں پر جنگ تھوپنا اور اس طرح زمین میں فتنہ وفساد کی آگ بھڑکانا نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ہمیشہ اور ہر آن "الصلح خیر" کا علمبردار ہوتا ہے یعنی صلح خیر ہے۔

عربی ادب کی روایات میں جنگ کو "شر" (برائی) سے تعبیر کیا گیا ہے جبکہ پیغمبرؐ قائد خیر اور رسول خیر ہوتا ہے وہ خیر کی تبلیغ و تلقین کرتا ہے اور شر کو مٹانے اور روکنے کی کوشش کرتا ہے۔

لیکن وہ نام نہاد خلافت راشدہ جس کے دور کو عہد انسانی کا زریں دور قرار دیا گیا ہے اس میں حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی کھلم کھلا مخالفت کی گئی اور جہاد کے مقدس نام پر فتنۂ فساد کا بازار ہر طرف گرم کر دیا گیا اور اس میں نہ اپنوں کی رعایت ملحوظ رکھی گئی نہ بیگانوں کی حتیٰ کہ ان لوگوں کو بے دریغ تہ تیغ کیا گیا جنھوں نے ابوبکر کی خلافت کو غیر آئینی سمجھ کر انھیں زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تھا۔

خالد بن ولیدؓ کی سرکردگی میں خلیفۂ اول نے جو فوجی مہم شروع کی تھی اس کی دہشت گردی کا یہ عالم تھا کہ بارگاہ ابوبکر سے اللہ کی تلوار (سیف اللہ) کا... خطاب پانے والا سپہ سالار عین میدان جنگ میں حریف قبیلوں کی بہو بیٹیوں کو اپنے حجلۂ عروسی کی زینت بنا لیتا تھا۔

یہاں مجھے پاکستان کے مؤقر اور سب سے بڑے روزنامہ "نوائے وقت" کے شمارہ ۱۳ مئی ۱۹۷۰ء کا ایک اقتباس یاد آیا اس شمارے میں "انداز صدیق" کے عنوان سے مشہور مصری مورخ محمد حسنین ہیکل کے حوالہ سے درج یہ واقعہ اپنے اندر عبرت کا بہت سا مواد رکھتا ہے بشرطیکہ دیکھنے والی آنکھ پر تعصب کی پٹی نہ بندھی ہو۔

"حضرت خالدؓ بن ولید نے یمامہ کی جنگ کے بعد بنو حنیفہ کے سردار مجاعہ کی بیٹی سے شادی کر لی تو حضرت صدیق اکبر نے انھیں لکھا (اس سے پہلے مالکؓ بن نویرہ کی بیوی لیلیٰ سے حضرت خالد کے عین میدان جنگ میں شادی کرنے کا واقعہ ہو چکا تھا)

اے خالدؓ بن ولید! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم عورتوں سے نکاح کرتے پھرتے ہو حالانکہ تمہارے سامنے ۱۲ سو مسلمانوں کا خون

زمین پر پھیلا ہوا ہے جن کے خشک ہونے کی بھی نوبت
نہیں آئی۔ (نقل مطابق اصل)

کیا یہی وہ خلافت راشدہ تھی جس کا دنیا میں ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے اور تاثر دیا جاتا ہے کہ چشم فلک نے اس سے بہتر طرز حکومت اور اس سے زیادہ جامع نظام مملکت نہیں دیکھا۔

اس خلافت راشدہ کا سپہ سالار ایسی مذبوحی حرکت کر رہا ہے اور پے بہ پے کر رہا ہے اور اس کے مواخذہ واحتساب کی قطعاً ضرورت محسوس نہیں کی جا رہی ایسے سنگین بدعنوانی کے واقعہ کو محض ایک تہدیدی خط کے ذریعے ٹال دیا گیا ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے نظام اور عوام کے چند شوریدہ سر لوگوں کے منتخب حکمرانوں کے دور حکومت کو خلافت راشدہ کہنا بہت بڑی اور ناروا جسارت ہے۔

این چنیں مرداں چہ امید بہی ؟

تاریخِ انسانیت کا بدترین دور

اگر خلافت راشدہ اسی کو کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس کے ساتھ بے مروتی اور بدسلوکی کا معاملہ کیا جائے۔ احسان فراموشی اور گربہ چشمی کا مظاہرہ کیا جائے اسلام دشمن قبیلوں کو اسلام کے لیے سب کچھ لٹا دینے والے قبیلوں پر ترجیح دی جائے۔ غنڈہ گردی کے ذریعے پیغمبرؐ کی وصیت کو منسوخ کر دیا جائے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اکلوتی اور چہیتی بیٹیؑ کے مکان کو نذر آتش کرنے کی دھمکی دی جائے اور ان کے ساتھ بدتمیزی اور گستاخی کا ایسا مظاہرہ کیا جائے کہ ان کا حمل ساقط ہو جائے۔ پیغمبرؐ کی اس محبوب بیٹیؑ کو اس کے مقدس باپؐ کے ورثہ سے جھوٹ کا سہارا لے کر محروم کر دیا جائے رذیلوں کو سر چڑھایا جائے اور شریفوں کی بے آبروئی کی جائے۔

اگر خلافت راشدہ اسی کا نام ہے کہ اس کا مقرر کردہ سپہ سالار حریف قبیلوں کی بہو بیٹیوں کو عین میدان جنگ میں اپنے حبالۂ عقد میں لے آئے۔

اگر خلافت راشدہ کی یہی اوقات ہے کہ ملک میں ہنگامی حالت نافذ رکھی جائے اور اسے مسلسل طول دیا جاتا ہے۔ اور اسلام کی تبلیغ کے نام پر ملکوں کے امن وسکون کو درہم برہم کیا جاتا ہے اور پوری قوم کو جنگی جنون کی نذر کر کے اپنی مدّتِ حکومت میں توسیع کی جائے۔

اگر خلافت راشدہ ہاتھ میں درّہ اٹھائے ایک ایک فرد رعایا کا تعاقب کرتی نظر آئے، بعض بڑے بڑے بااثر صحابہ کو پابندِ مسکن کردے اور خوف وہراس کی ایک ایسی فضا پیدا کردے جس میں کسی کو لب کشائی کی جرائت نہ ہو۔ اگر خلافت راشدہ خویش پروری، اقربا نوازی، جنبہ داری اور دوست نوازی کے طور طریقے بنائے اور اس کو عین اسلامی زندگی قرار دے۔

اگر خلافت راشدہ اپنے خاندان کے نااہل افراد کو "اندھا بانٹے ریوڑیاں اور پھر اپنوں کو دے کا وطیرہ اپنائے اور اپنے قریبی رشتہ داروں پر بیت المال کا منہ کھول دے کہ وہ جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں۔ اگر خلافت راشدہ اپنے مخالفین کو جن میں سے بشیتر جلیل القدر صحابہ ہیں جلاوطن کرنے، ملک بدر کرنے اور اذیتیں دینے کو اپنا معمول بنائے۔

اگر خلافت راشدہ عوام کے مطالبہ کو مسلسل نظرانداز کرتی رہے، ضدہٹ دھرمی، اور بے جا جبر وتشدد کے ذریعے عوامی خواہشات کو دباتی اور کچلتی رہے اور محض ایک شخص کو تحفظ دینے کے لیے جس کا کردار نہایت مشکوک اور نہایت گھناؤنا تھا عوام کے مقابلہ پر تل جائے اور کسی معقول اور جائز بات کو سننے کے لیے تیار نہ ہو۔

تو یہ خلافت راشدہ نہیں کسی فسطائی آمر کا دورِ استبداد ہے، یہ ہلاکو و چنگیز کی روایت ہے یہ ظلم واستحصال کا انداز ہے اور افسوس کہ اس خلافت راشدہ

کے پچیس سالہ دور استبداد نے مسلمانوں کی پوری تاریخ کو جبر و استبداد کی تاریخ بنا کر رکھ دیا اور اس خلافت راشدہ کے عہد نامسعود میں جن ناخوش گوار روایات نے جنم لیا وہ پچھلے چودہ سو برس میں مسلمانوں کی قومی روایات بن چکی ہیں اور اب ان سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

خلافت راشدہ کے اس نام نہاد اور فرضی تقدس نے ہر ظالم و جابر حکمراں کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ اپنے مستبدانہ اور ظالمانہ طرز حکومت کو خلافت راشدہ کے طور طریقوں کے حوالہ سے سند جواز بخشے۔

اگر انتخاب خلیفہ کو لیے خواہ وہ کیسا ہی نا اہل کیوں نہ ہو اکثریت کی رائے کو حتمی قرار دینے کی بات ہو خواہ وہ اکثریت کتنی ہی بے خبر، ناسمجھ اور بے ضمیر کیوں نہ ہو تو ابوبکر کی خلافت کے لیے نامزدگی کو بطور ثبوت پیش کیا جاتا ہے حالانکہ قرآن مقدس نے "اکثریت" کو ہمیشہ نا اہل اور ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ قرآن مقدس میں بار بار ان فقروں کی تکرار ملے گی۔

ولکن اکثر الناس لا یعلمون

لیکن لوگوں کی اکثریت علم سے بے بہرہ ہے

ولکن اکثر الناس لا یعقلون

لوگوں کی اکثریت عقل سے بے بہرہ ہے

ولکن اکثر الناس لا یشکرون

انسانوں کی اکثریت ناشکر گزار ہے

ولکن اکثر الناس لا یفقہون

انسانوں کی اکثریت سمجھ بوجھ سے بے بہرہ ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ ارشاد ہوا۔

لا یستوی الخبیث والطیب ولو اعجبک کثرۃ الخبیثہ۔

پاک اور اور ناپاک کبھی برابر نہیں ہو سکتے خواہ ناپاک لوگوں کی کثرت تمہیں کتنا ہی حیران کیوں نہ کرے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ربانی ہے کہ

وقلیل من عبادی الشکور

میرے سپاس گزار بندے بہت کم ہیں۔

انگریز کی روایات کے مطابق کہ اکثریت ہی قانون ہے - (MAJORITY IS LAW) انتخاب خلیفہ کے لیے نااہل اکثریت کو فیصلہ کن حیثیت دی گئی اور اسے "اجماع امت" کا نام دیا گیا۔ اجماع امت کا یہ تصور جسے استعمال کر کے ہر غلط بات کو درست قرار دیا گیا اسلام کے مزاج سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا اس لیے کہ آج تک کوئی ایسا اجماع متحقق نہیں ہوا۔ بجز عقیدہ تحفظ ختم نبوت کے، جس اجماع میں امت کے تمام اصحاب عقل ودانش اور ارباب فکر ونظر متفق ہو گئے ہوں یہ محض اکثریت کے فیصلے تھے جنھیں اجماع کا نام دیا گیا۔

اکثریت کی رائے کو حتمی اور قطعی شکل دینے کی تجویز مغربی ذہن کی پیداوار ہے اور جمہوریت کی موجودہ مروجہ صورت جس میں اکثریت کی رائے کو حرف آخر سمجھا جاتا ہے۔ انقلاب فرانس کے بعد متعارف ہوئی اس جمہوری طرز حکومت میں۔ بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے" کا غیر منطقی اور غیر عقلی فلسفہ کار فرما ہے۔

اکثریت کی فرماں روائی کے استحقاق کو جسے اقبال نے ایک انسان کے مقابلے میں دوسو گدھوں کی فرمانروائی کے مترادف قرار دیا ہے کہ

از مغز دوصد خر فکر انسانی نمی آید

اسلام میں کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ لیکن انقلاب فرانس سے بہت پہلے پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشینوں نے دھاندلی اور دھونس کے ذریعے اکثریت کی رائے کو فیصلہ کن قرار دیا اس اکثریت میں بیشتر افراد وہ تھے جن کا اسلام فتح مکہ کا رہین منت تھا۔ جن کے بارے میں قرآن مقدس نے وضاحت کی تھی کہ

قالت الاعراب آمنا قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم

"عرب کے بدو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں آپ فرما دیں کہ نہیں تم ایمان نہیں لائے البتہ یوں کہو کہ تم نے اطاعت قبول کرلی ہے ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

یہ اکثریت ان لوگوں پر مشتمل تھی جن میں سے بیشتر کا اسلام دفع الوقتی کا ایک ذریعہ تھا اور جو محض جان بچانے یا سماجی اعتبار سے بے وقار ہونے کے خوف سے اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے۔ اسلام ان کے لیے ایک کڑوا گھونٹ تھا۔ زہر کا پیالہ تھا لیکن انھیں اسے بادل نخواستہ حلق سے نیچے اتارنا پڑا کہ معاشرہ میں ان کی سرداری کی ساکھ برقرار رہے۔

اب بھلا اس بات کو کون عقل مند تسلیم کرسکتا ہے کہ ابو سفیان جیسا اسلام کا بدترین دشمن جس نے فتح مکہ کے آخری دن تک حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت ترک نہ کی اور اسلام دشمنی کی روش پر گامزن رہا۔ راتوں رات اس کی ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ وہ اسلام کے لیے مخلص ہوگیا اور حضورؑ کی نبوت و رسالت پر اسے یقین آگیا اور وہ دل و جان سے اسلام کے نظریات کا گرویدہ اور دین حق کا والہ و شیفتہ ہوگیا۔

ایسے بے شمار لوگ تھے جو غلبہ اسلام کے سبب دھڑا دھڑ مسلمان ہوتے چلے گئے اور اسی میں انھوں نے اپنی عافیت سمجھی اگر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق طیبہ کے سبب یہ لوگ اسلام قبول کرنے پر یکایک آمادہ ہوئے تھے تو کیا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق عالیہ کا کوئی پہلو ان سے ڈھکا چھپا تھا وہ شخص جو اپنے معصوم بچپن اور اپنی بے داغ جوانی کی ساری رعنائیوں اور خوبیوں کے ساتھ انہی لوگوں کے درمیان بھلا بھولا تھا اور جس نے اپنی پاکیزہ زندگی کو چیلنج کے طور پر ان حضرات کے سامنے یہ کہہ کر پیش فرمایا تھا کہ

قد لبثت فيكم عمرا من قبله افلا تعقلون

"میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ تمہارے اندر رہ کر گزارہ ہے کیا تم عقل سے بالکل ہی بے بہرہ ہو۔

ظاہر ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ کے بارے میں انھیں کوئی اشتباہ نہیں تھا اگر انھیں متاثر ہونا ہوتا تو وہ بہت پہلے ہی اس سے متاثر ہو جاتے۔

ابوسفیانؓ کے بارے میں تو کتب حدیث میں آتا ہے کہ اس نے ہرقل کے دربار میں جب وہ تجارتی سفر پر شام گیا ہوا تھا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اخلاقی عظمت کا اعتراف کیا تھا باایں ہمہ اس نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت آخری مرحلہ تک ترک نہیں کی۔

اب فتح مکہ کے فوراً بعد یکایک صورت حالات میں ایسی کونسی اچانک تبدیلی آگئی تھی کہ انپر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبع سامی کے جوہر آشکار ہوئے اور وہ جو ایک دن پہلے خون کے پیاسے تھے جانثار بنگئے اور انکی دشمنی چند لمحوں اور ساعتوں میں محبت میں تبدیل ہوگئی۔

شُتر کینہ قوم

شتر کینگی اور انتقام کی آگ میں جلتے رہنا اور آتشِ انتقام کو فرو کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز ذریعہ استعمال کرنا عربوں کی مزاجی خصوصیت تھی ظاہر ہے صدیوں کی یہ روایت ایک دن میں ختم ہونے والی نہیں تھی اور دیکھتی آنکھوں میں جذبات میں یکسر تبدیلی اور کردار میں مکمل انقلاب کبھی عمل میں نہیں آیا۔

دل میں کسی کے لیے کوئی نرم گوشہ پہلے سے موجود ہو تو چشم زدن میں تعلقات میں حائل دشواریاں دور ہو سکتی ہیں مگر جہاں دشمنی کا پس منظر خاندانی بھی ہو، معاشی بھی ہو، معاشرتی بھی ہو اور سیاسی بھی تو وہاں دلوں کی کدورتیں ڈھلنے میں بڑا وقت صرف ہوتا ہے یہ لمحوں اور ساعتوں کا قصہ نہیں ہوتا خاندانوں اور نسلوں کا معاملہ ہوتا ہے میں نے اپنی پہلی کتاب سیدنا ابن ابی طالبؑ اور ان کے سیاسی حریف" میں خاندان بنی اُمیہ کی اسلام دشمنی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔

یزید کی خاندانی روایات کا تصوّر کیجیے اور پھر عرب قوم کی ذہنی اور سیاسی کیفیت کا جائزہ لیجیے تو ایک بات واضح ہو کر آپ کے سامنے آئے گی کہ یزید نے اپنے عہدِ اقتدار میں جو ظالمانہ اقدامات کیے وہ اس کے خاندان کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا جسے یزید نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا یعنی جو کام یزید کے دادا ابوسفیان سے نہ ہو سکا اور جس کی تکمیل کی حسرت لیے معاویہ دنیا سے رخصت ہو گیا اس کام کو ابوسفیان کے فرزند ارجمند معاویہ کے بیٹے یزید نے پورا کر دکھایا۔

عرب کے شتربانوں میں شتر کینگی کا جذبہ بڑی شدت کے ساتھ کارفرما تھا امتدادِ وقت اور زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ سرد نہیں پڑتا تھا بلکہ دو آتشہ اور سہ آتشہ ہوتا چلا جاتا تھا۔

معاویہ کی ماں اور ابوسفیان کی بیوی ہندہ بنت ربیعہ نے جنگِ احد میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمِ گرامی قدر سید الشہداء حضرت حمزہؑ کی شہادتِ کبریٰ کے بعد جس طرح ان کے جسدِ اطہر کا مثلہ کیا ان کے اعضائے رئیسہ کا ہار بنا کر گلے میں ڈالا ان کے جگر کو دانتوں سے چبایا اور ان کا خون پی کر اپنے انتقام کی آگ بجھائی وہ اسی شتر کینگی کا ایک ناپاک مظاہرہ تھا۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر سوچیے کہ ابوسفیان کو اس امر کا کتنا صدمہ تھا کہ بنو امیہ کے حریف قبیلہ بنو ہاشم کے ایک فردِ فرید نے مدینۃ المنورہ جا کر اپنی قوت کو مجتمع کیا اور اس قوت کے بل پر مکہ فتح کر لیا اور ابوسفیان کی سرداری حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی اس کی رئیسانہ عظمت ملیامیٹ ہو گئی اور بنی امیہ کی شان و شوکت حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں کی

ٹھوکر کے سامنے ریت کا گھروندہ ثابت ہوئی۔

عرب کی بساط سیاست و اقتدار پر ابوسفیانؑ اور اس کے قبیلے کے لوگوں نے جو شہ مات کھائی اسکا انتقام اسی طرح لیا جاسکتا تھا کہ نہ صرف حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کو تہ تیغ کیا جائے بلکہ مدینہ کے باسیوں کا بھی قتل عام کیا جائے اور حضور کی امداد و اعانت کے صلہ میں ان کی بہو بیٹیوں کی عصمت و ناموس کو بے دریغ لوٹا جائے اور آئندہ بنو ہاشم کے کسی فرد کو مسند اقتدار پر متمکن ہونے کے تمام مواقع ختم کردئے جائیں۔

ابوسفیانؑ کے اس ناپاک منصوبہ کو اس کے پوتے یزیدؑ ملعون نے عملی جامہ پہنایا اور ثابت کردیا کہ بنوامیہ کا قبول اسلام محض ایک فریب اور دھوکہ تھا۔

کیا ابوسفیانؑ اور معاویہؑ اور خاندان بنوامیہ کے دیگر افراد نے نام نہاد خلافت راشدہ کے دورکم سواد میں خانوادۂ بنو ہاشم کے درپئے آزار ہونے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت کیا۔

کیا عرب کے سب سے چھوٹے قبیلۂ بنوتیم ... اور اس کے چھٹ بھیا بنوعدی کے افراد کو مسند اقتدار پر لانے اور اور پھر ان دونوں کے ذریعے اقتدار کو بنی امیہ کی جانب منتقل کرنے کی ساری کارروائی کے پس پشت اسی خاندان بنوامیہ کی دسیسہ کاریوں کا دخل نہیں تھا کیا سیدنا علیؑ ابن ابی طالبؑ کو خلافت سے محروم کرنے میں عمر ابن خطاب نے جو کردار ادا کیا اس کے پس پردہ بنی امیہ کی شہ نہیں تھی۔

اصلی مجرم

اس مکر وفریب کی سیاست اور اس بد دیانتی اور بے ایمانی کی حکمت عملی کو اختیار کرنے میں معاویہ ہی نے تو سبقت نہیں کی اس کا اصل سہرا تو ان خلفائے ثلاثہ کے سر بندھتا ہے جنھوں نے جانتے بوجھتے ہوئے حق کو حق دار تک نہ پہنچنے دیا۔

عقل وخرد سے بے بہرہ لوگ ایک دلیل کو شرعاً پیش کیا کرتے ہیں اور اسے دور کی کوڑی سمجھ کر اس کا عموماً چرچا کرتے ہیں کہ صاحب اگر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت علیؑ کو خلافت مل جاتی تو لوگ کیا کہتے کہ اپنے داماد کو حکومت کی مسند پر بٹھا کر چلے گئے اور اس طرح حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر خویش پروری اور اقربا نوازی کا الزام لگ جاتا۔

کوئی ان احمقوں سے پوچھے کہ ابوبکر وعمر کے خلیفہ بننے سے کیا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس الزام سے بچ جاتے ہیں الٹا اس سے تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر بھی حرف آتا ہے اور ان خلیفوں کی قلعی بھی کھل جاتی ہے کہ ان دونوں نے اپنی لڑکیاں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم کے عقد میں وہی ہی اس لیے تھیں کہ آپ کے بعد آپ کی بگڑی ہوئی گدی پر براجمان ہو سکیں یہ گویا شادی بیاہ کا قصہ نہیں تھا بلکہ عائشہؓ اور حفصہؓ کی شکل میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سیاسی رشوت پیش کی گئی تھی (والعیاذ باللہ) اور تیسرا خلیفہ بھی تو آپ کے قول کے مطابق داماد تھا بلکہ ڈبل داماد تھا۔

عجیب طرفہ تماشہ ہے کہ سسرے مسند خلافت پر بیٹھیں تو یہ خویش پروری نہیں ہے تیسرا خلیفہ بھی دامادی کے اعزاز کے ساتھ اس مسند پر قبضہ کرے تب بھی یہ اقربا نوازی نہیں ہے صرف سیدنا علیؑ علیہ السلام کے خلیفہ بننے سے یہ الزام حضورؐ پر عائد ہوتا ہے۔ سبوخت عقل ز حیرت ایں چہ بوالعجبی است اسی بات کو گھما پھرا کر خلیفہ دوم نے ایک اور پیرایہ میں بیان کیا تھا انھوں نے کہا تھا ذرا تیور ملاحظہ ہوں۔

کرھنا ان تجتمع النبوۃ والخلافۃ لھذا البیت

"ہم نے یہ بات گوارا نہیں کی اور ہمیں یہ پسند نہیں تھا کہ نبوت اور خلافت ایک ہی گھرانہ میں یعنی بنو ہاشم جمع ہو جائے"۔

ایک اور موقع پر یا ایک اور روایت میں عمر ابن خطاب نے اپنے جذبات بغض و عناد کا اظہار ان الفاظ میں کیا

کرھت قریش ان تجتمع لکم النبوۃ والخلافۃ فتجمعوا الناس جبفا فنظرت لانفسھا فاختارت ووفقت فاصابت

(قریش کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ نبوت اور خلافت دونوں تمہارے یعنی بنو ہاشم کے حصہ میں آجاتی اور تم لوگوں کو ستانے اور تنگ کرنے لگے اس لیے قریش نے اپنے لیے غور و فکر کے بعد دوسری راہ پسند کی اور یہ صحیح

فیصلہ کیا، عمر ابن خطاب کی یہ گفتگو عبداللہ ابن عباسؓ سے ہو رہی . انھوں نے اس کے جواب میں فرمایا " جہاں تک قریش کی پسند ناپسند کا تعلق ہے تو ان کو تو نزول وحی کا سلسلہ بھی ناگوار گذرا تھا. قرآن مقدس نے اس کی گواہی دی ہے کہ ذلك بانھم کرھوا ما انزل اللہ فاحبط اعمالھم. انھیں تو یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ وحی خداوندی کا نزول ہو اور اسی لیے ان کے سارے اعمال رائیگاں ہوئے .

اور پھر قریش کی پسند و ناپسند کا قصہ بھی خوب ہے . عبداللہ بن عباسؓ نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا قرآن مقدس تو کہتا ہے وربك یفعل ما یشآء و یختار ما کان لھم الخیرۃ "

تیرا پرورگار جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے پسند فرلیتا ہے ان لوگوں کو اس کا کوئی اختیار نہیں ہے ."

اللہ تعالٰی نے قبیلہ قریش میں سے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جس اعزاز کے لیے منتخب فرمایا کیا وہ قریش مکہ کی مرضی کا انتخاب تھا اس لیے آپ کا یہ کہنا کہ قریش کا فیصلہ صحیح ہے کچھ حقیقت نہیں رکھتا اس کا فیصلہ تب صحیح ہوتا کہ وہ اسی گھرانہ پر نظر انتخاب ڈالتا جسے اللہ تعالٰی نے منتخب فرمایا تھا ."

اس پر عمر ابن خطاب کافی بدمزہ ہو گئے ان حضرت کی خودپسندی کا یہ عالم تھا کہ اپنی رائے کے خلاف کوئی بات سننے کے روادار نہ تھے اور تنک مزاجی کا یہ حال تھا کہ بات بات پہ لوگوں کو کاٹنے کو دوڑتے تھے . . .

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

مجھے اس عورت کا تبصرہ نہیں بھولتا جسے خلیفۂ دوم نے شادی کا پیغام بھیجا تھا اور حضرت عائشہ نے بھی اس عورت سے ان کی سفارش کی تھی اور اس نے کہا تھا۔ اند خشن العیش شدید علی نسار دلا حاجۃ فی فیہ۔ "اس کی زندگی میں ترش روی اور تنگ مزاجی اور خشونت کے سوا رکھا ہی کیا ہے؟ اور اسی بنا پر عورتوں کے ساتھ اس کا برتا انتہائی کرخت ہے۔

مدائنی کا کہنا ہے کہ ان صاحب نے ام ابان نامی ایک عورت سے بھی رشتۂ ازدواج کی سلسلہ جنبانی کی تھی اس پر اس نے یہ کہہ کر اس رشتے کو مسترد کر دیا۔

یغلق بابہ ویمنع خیرہ ویدخل عابسا ویخرج عابسا۔

"مجھے یہ شخص سخت ناپسند ہے۔ دروازہ بند کیئے رکھتا ہے (کہ کہیں کوئی مہمان نہ آجائے) خیر کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ گھر میں آتا ہے تو تیوری چڑھی ہوئی ہوتی ہے۔

(طبری ج ۳ ص ۲۷۰)

یہ ام ابان معاویہؓ کی حقیقی خالہ ہے یعنی عتبہ بن ربیعہؓ کی بیٹی اور ہندہؓ کی سگی بہن اہل بیت کے دشمنوں کی دیانت طبع کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اس قسم کے بدمزاج انسان کے بارے میں یہ افواہ اڑائی گئی اور اس جھوٹ کو اتنا فروغ دیا گیا کہ سیدنا علی علیہ السلام کی دختر اور حضرت سیدۃ فاطمہ سلام اللہ علیہا کی چھوٹی صاحبزادی حضرت اُمّ کلثوم آٹھ برس کی عمر میں خلیفہ دوم کے عقد میں آئی تھیں اور یہ شادی حضرت علیؑ کی مرضی سے طے پائی تھی (عیاذ باللہ)

ابوہریرہ اور اسی قماش کے دوسرے جھوٹے راویوں کی تمام من گھڑت روایتیں ایک طرف اور خانوادۂ نبوتؐ پر یہ رکیک اتہام و افترا ایک طرف

طبری اصابہ اور الاستیعاب میں اس سراسر غلط واقعہ کی جو رپورٹنگ کی گئی ہے وہ اتنی شرمناک ہے کہ کوئی شریف انسان کسی شریف خاندان کی بہو بیٹیوں کے متعلق اس کا تصوّر تک نہیں کر سکتا چہ جائیکہ وہ خانوادۂ نبوت ہو۔ واقعہ کی مختصر روداد حسب ذیل ہے۔

عمر ابن خطاب نے سیدنا علی علیہ السلام سے ام کلثوم کا رشتہ مانگا حضرت علیؑ نے فرمایا وہ تو ابھی چھوٹی بچی ہے۔ عمر نے اصرار کیا اور کہا کہ اسے میرے عقد میں دے دو جتنا میں اس کا خیال رکھوں گا دوسرا کوئی نہیں رکھ سکتا اس پر حضرت علیؑ نے فرمایا کہ اچھا میں اسے تمہارے پاس بھیجوں گا اگر تم نے اسے پسند کر لیا تو میں اس کی شادی تم سے کر دوں گا چنانچہ حضرت علیؑ نے ایک چادر دے کر حضرت ام کلثومؑ کو عمر ابن خطاب کے پاس روانہ کیا اور بچی سے کہا کہ عمر سے جا کر کہنا کہ یہ چادر مجھے پسند ہے اللہ تمہیں خوش رکھے اس کے بعد عمر ابن خطاب نے اس بچی کی پنڈلی سے کپڑا اٹھا کر اس پر اپنا ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا اس پر ام کلثوم بولیں یہ کیا کر رہے ہو اگر تم امیرالمومنین نہ ہوتے تو میں تمہاری ناک توڑ دیتی۔ پھر وہ اپنے والد کے پاس آئیں اور انھیں ساری بات سنائی۔

ے جس طرح عثمان بن عفان کو مسخ کر کے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو بیٹیوں کا شوہر قرار دیا گیا اور اس بات کو اس درجہ ہوا دی گئی اور اس جھوٹ کا اتنا چرچا گیا کہ لوگوں نے اسے سچ سمجھنا شروع کر دیا بعینہ اسی انداز میں سیدنا علیؑ کی دختر سیدہ ام کلثوم کے عمر ابن خطاب کے حبالۂ عقد میں آنے کی خبر گھڑی گئی اور اسے مسلسل پھیلایا جاتا رہا حتیٰ کہ ہمارے اس

اور کہا "آپ نے مجھے ایک بدکردار بڈھے کے پاس بھیج دیا" یہ سُن کر حضرت علیؑ نے فرمایا۔ "بیٹی وہ تمہارا شوہر ہے" اس کے بعد عمر مہاجرین کی ایک مجلس میں گئے۔ جو روضۂ نبوی میں تھی اور جس میں بڑے بوڑھے مہاجر شریک ہوتے تھے وہاں بیٹھ کر عمر نے کہا کہ آج تو میری شب زفاف ہے

باقی حاشیہ

دور میں بھی بعض بدنہاد مولویوں نے اس موضوع پر کتابیں لکھیں جن میں طبری، اصابہ، اسدالغابہ، اور الاستیعاب کے حوالہ سے اس نکاح کو ثابت کرنیکی ناپاک کوشش کی لیکن پوری روایت درج کرنے کا ان لوگوں کو بھی حوصلہ نہیں ہوا کہ اس سے خلیفۂ دوم کے اس شرمناک کردار کی قلعی کھلتی تھی جو انھوں نے ایک معصوم بچّی کے ساتھ روا رکھا۔ حالانکہ محولہ بالا سب کتابوں میں یہ واقعہ اسی شرمناک تفصیل کے ساتھ درج ہے۔

گوئیبلز ہٹلر کے وزیر اطلاعات نے کہا تھا کہ جھوٹ اس کثرت اور تسلسل سے بولو کہ جھوٹ پر سچ کا گمان ہونے لگے اور اس پر چودہ سو برس سے ہمارے خودفروش فقیہوں اور مولویوں نے عمل کر کے ایک مثال قائم کر دی۔

سنیت نے دماغ اس درجہ سُن کر دیے ہیں کہ ہر سُنی سنائی بات پر بلا تامل آمنا وصدقنا کہتے چلے جا رہے ہیں۔ حالانکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کفیٰ بالمرء کذباً ان یحدث بکل ما سمع۔ "انسان کے جھوٹا ہونیکے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سُنی سنائی بات کو بیان کرنے لگے۔

ہدایت عقل اور کامن سنس سے محروم لوگ تاریخ اسلامی کے انہی شرمناک واقعات سے اپنے عقائد کی دنیا آباد کیے ہوئے ہیں اور نہیں سوچتے کہ وہ کس سراب اور کس فریب نظر کا شکار ہیں۔

لوگوں نے پوچھا کس سے ؟ عمر نے کہا علیؑ ابن ابی طالبؑ کی بیٹی ام کلثومؑ سے میری شادی ہو گئی ہے اور میں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ آپؐ فرماتے تھے کہ ہر رشتہ ناطہ اور تعلق قیامت کے دن منقطع ہو جائے گا۔
بجز میرے رشتے ناتے اور تعلق کے میرا رشتہ اور تعلق تو پہلے سے قائم تھا اب دامادی کا ناطہ بھی طے پا گیا ہے۔" اور یہ عمر ابن خطاب جسے سیدنا علیؑ ابن ابی طالبؑ کا داماد ثابت کرنے کی ناپاک کوشش کی جا رہی ہے اس کا طرز عمل سیدنا علیؑ کے ساتھ اس درجہ معاندانہ تھا کہ وہ ان لوگوں کے رشتہ داروں کو جو حضرت علیؑ کی تیغ خارا شگاف سے حالت کفر میں قتل ہوئے تھے حضرت علی کے خلاف بھڑکاتے رہتے تھے اور ان کے جذبات میں حضرت امام کے خلاف زہر گھولنا اس کا دل پسند مشغلہ تھا جیسا کہ سعید بن العاص کے معاملہ میں اس کا اظہار ہوا۔

سعید بن العاص کا باپ جنگ بدر میں حضرت علیؑ کے ہاتھوں قتل ہوا تھا ایک مرتبہ وہ عثمان بن عفان کے ساتھ عمر ابن خطاب کی مجلس میں موجود تھے اور عمر ابن خطاب نے حضرت علیؑ کو بیٹھا دیکھ کر از خود سعیدؓ بن العاص کے والد کے قتل کا قصہ چھیڑ دیا اور کہنے لگے۔

- تمہارا خیال ہے کہ میں نے تمہارے باپ کو قتل کیا ہے یہ تو علیؑ تھے جنہوں نے اسے خاک و خون میں تڑپایا تھا۔ سیدنا علی علیہ السلام نے خلیفہ دوم کی یہ بات سنی تو فرمایا۔

کفر و اسلام کی کشمکش کے دوران جو ہوا سو ہوا اب کیوں گڑے مُردے اکھاڑ رہے اور لوگوں میں میرے خلاف پروپیگنڈہ کر کے ان کے جذبات میں میرے خلاف اشتعال پیدا کر رہے ہو۔" اس پر عمر ابن خطاب کو سانپ سونگھ گیا لیکن سعید بن العاص نے یہ کہہ کر اس تلخ بحث کو ختم کر دیا۔

،ما انہ ما کان یسوءن ان یکون قاتل ابی غیر ابن عم علی ابن ابی طالب۔"

"بہرحال مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میرے باپ کا قاتل میرے باپ کے ابن عم علیؑ ابن ابی طالبؑ کے سوا اور کوئی نہیں۔"

"اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی" کے مصداق جھنگ کے ایک بزرجمہر نے ایک عدد کتاب "رحما بینہم" تالیف کی ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے کہ حضرت علیؑ سے ابوبکر وعمر اور دوسرے بڑے صحابہ کے تعلقات نہایت خوش گوار تھے۔ کیا تعلقات کی خوش گواری اسی کا نام ہے کہ ایک دوست دوسرے دوست کو رسوا کرے اور اس کے درپے آزار ہو۔ اور وہ بھی اس بھونڈے طریقے سے کہ خود صاحب واقعہ بھی اس پر شرما جائے

بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ خاندان نبوتؐ پر جو افتاد پڑی اور اہل بیت اطہار کو جن گوناگوں حوادث ومصائب سے دوچار ہونا پڑا ان تمام کی اصل ذمہ داری بالخصوص خلیفہ دوم پر عائد ہوتی ہے انھوں نے ہی خاندان نبوت کے دشمنوں کو سر چڑھایا ان کے لیے حکومت تک رسائی کی راہ ہموار کی ابوسفیان کے بیٹوں کو انھوں نے یہ موقعہ فراہم کیا کہ وہ شام کے اہم نہایت زرخیز خود کفیل اور سیاسی اور فوجی اعتبار سے انتہائی حساس علاقہ پر اپنا علیحدہ شخصی اقتدار قائم کریں۔ معاویہ نے جو فصل کاٹی اسے خلیفہ دوم نے بڑی چابک دستی سے خود اپنے ہاتھوں بویا تھا ایک نے پودا لگایا دوسرے نے اس کا پھل کھایا اور خاندان نبوت کو برباد کر دیا ابوبکر وعمر کی مکروہ چالوں اور خفیہ تدبیروں کے ذریعے جب قرعۂ خلافت عثمان بن عفان کے نام نکلا تو ابوسفیان کے بارے میں تاریخ وسیر کی کتابیں شہادت،

دیتی ہیں کہ وہ اس وقت اندھا ہو چکا تھا۔ تاہم وہ ایک شخص کو جو یقیناً معاویہ ہوگا یا بنی امیہ کے خاندان کا کوئی دوسرا بے غیرت فرد اسے ساتھ لے کر سید الشہدا حضرت حمزہؑ کی قبر مقدس پر گیا اور اسے ٹھوکر ماری اور کہا۔

جو بات ہمارے تمہارے درمیان وجہ نزاع تھی آج اس پر ہمیں کلی تصرف حاصل ہو گیا ہے۔

حضرت سید الشہدا کی قبر اطہر کو ٹھوکر مارنے کا ثواب بھی یقیناً خلیفہ دوم کے نامۂ اعمال میں درج ہو گا کہ انھیں کی ملی بھگت سے اسلام کو یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔

اسلام کی نام نہاد خلافت راشدہ نے جس کے سرخیل ابوبکر جس کے سرغنہ عمر ابن خطاب اور جس کا مرکزی کردار عثمان بن عفان تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا نام تو اس میں محض برائے وزن بیت ہے، اپنے دور حکومت میں جو روایات قائم کیں جس حکمت عملی کو اپنایا اور جس نہج پر اپنے فکر و عمل کی اساس رکھی اسے دو لفظوں میں محض "دنیا داری کی سیاست" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سیاست کا وہ رائج الوقت تصور و مفہوم جس کا چلن آج کے روز بازار سیاست میں عام ہے یعنی مطلب برآری کے لیے دروغ، اف، کذب بیانی، شاطرانہ چالیں حریفوں کو زیر کرنے اور مخالفوں کو کچلنے اور دبانے کے نت نئے ہتھکنڈے، دھونس دھاندلی دھوکہ، دباؤ مکر و فریب اس خلافت راشدہ کی وہ امتیازی خصوصیات ہیں جن سے کوئی مورخ انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

کیا تاریخ آج تک اس نافرمانی اور بدعہدی کا کوئی جواز پیش کر سکتی ہے کہ جیشِ اسامہؓ جس کی وضع و ترتیب خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سرانجام دی تھی اس کے دو دادتی اسپاہیوں کو یہ اختیار کہاں سے مل گیا

کہ ان میں سے ایک خلیفہ بن بیٹھا اور دوسرا خلیفہ گر بن گیا۔ حضرت اسامہؓ نے ان کو فارغ کر دیا تھا کیا حضور نبی اکرم نے کوئی ایسا اشارہ دیا تھا کہ اگر ان کا وصال ہو جائے تو ان دونوں کو جیش اسامہ میں شرکت سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ اگر یہ دونوں پیغمبر کے سچے وفادار تھے تو ان کی وفاداری کا تقاضا کیا تھا اور نافرمانی اور بدعہدی کا صاف اور صریح مطلب یہ نکلتا ہے کہ ان لوگوں کی ظاہری وفاداریاں صرف حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی تک حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھیں اور ادھر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھیں بند ہوئیں اور ادھر انھوں نے حکم عدولی اور سرتابی کا آغاز کر دیا اور من مانی کرنے لگے۔

ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وصال سے قبل ہی اس امر کی اطلاع مل گئی تھی کہ اب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وقت آخر قریب ہے۔ اور اس اطلاع پر جس نے ٹسوے بہائے تھے وہ ان دونوں شخصیتوں ہی میں سے ایک صاحب تھے اور دوسری جانب حضور کے ترتیب دیے ہوئے لشکر میں سے ان دونوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواہش اور مرضی کے علی الرغم حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کی پابندی سے خود کو بری الذمہ قرار دے لیا آخر کس بنیاد پر کونسی دلیل تھی ان کے پاس اور کیا وجہ جواز تھی ان لوگوں کے پاس کہ اب وہ لشکر اسامہؓ میں شرکت کے پابند نہ رہے تعجب ہے کہ جن لوگوں کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جیش اسامہؓ میں کوئی معمولی عہدہ بھی نہیں دیا اور جو عام سپاہیوں کے زمرہ میں شامل تھے خود ہی حکم چلانے لگے اور حاکم وقت بن بیٹھے۔

پیغمبر علیہ وآلہ الصلوٰۃ والسلام کی اس صریحاً حکم عدولی پر ان کے خلاف

خلاف ضابطہ کی کارروائی ہونی چاہیئے تھی لیکن انھیں خلافت کی مسند پر فائز کر دیا گیا اور تاریخ کی زبان اس موٹے سے سوال پر گنگ رہی صرف اس ایک واقعہ کو ان لوگوں کی قرار واقعی حیثیت سے متعارف ہونے کیلئے معیار قرار دیا جا سکتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کی وفاداریاں کس قدر بودی کھوکھلی اور بے بنیاد تھیں لوگ معاویہؒ کا رونا روتے ہیں اور یزیدؒ کی بدکرداریوں کا ماتم کرتے ہیں لیکن خلافت راشدہ کے ان دو ستونوں پر بھی تو ایک نگاہ ڈالیں کہ ہ

" ستون آپ ہیں چشم بد دور دیں کے "

انھوں نے کیا گل کھلائے ہیں اور کیسی کیسی دھاندلیاں روا رکھیں۔

کیا دنیا کے کسی مہذب معاشرہ میں، کسی ملک کی سیاسی وضع میں کسی قوم کی اخلاقی اقدار میں کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ فوج کے دو ادنیٰ اور معمولی سپاہی اٹھیں اور اٹھ کر حکومت واقتدار پر قبضہ جمالیں جبکہ اس قوم کے بانیٔ، اس معاشرہ کے موسس اور اس ملک کے دینی اور سیاسی پیشوا کی کوئی اخلاقی تائید بھی ان دونوں کو حاصل نہ ہو۔

اردو زبان کی مشہور کہاوت ہے " بابا تیرے تین نام پرسا پرسو پرس رام " اس کہاوت کے پس منظر میں عرب کی اس خاتون کے ریمارکس کو پڑھیں جو اس نے خلیفۂ دوم کے منہ پر دیے تھے اس نے کہا تھا " یا عمر عہدنا بک وانت یقال لک عمیر ثم بالتشت ان قالوا لک عمر ثم لم نلبث ان اصبحت امیر المومنین فاتق اللہ فی الرعیتہ واعلم انہ من خاف الوعید قرب علیہ البعیدہ ومن خاالموت خشی الفوت:

" اے عمر! جب سے ہمارا واسطہ تم سے پڑا ہے اس وقت سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ پہلے لوگ تمہیں عمر کی بجائے عمیر یعنی ننکو عمر کہہ کر پکارتے تھے پھر ایک وقت آیا (اور وہ غالباً ابوبکر کی خلافت کا دور تھا) لوگ تمہیں عمر کہنے لگے اور اب

یہ نوبت آگئی کہ تم امیر المومنین عمر کہلانے لگے ۔ اپنے اس پس منظر کے ساتھ اب رعایا کے باب میں خدا کے خوف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ نہ دینا اور یہ بات یاد رکھنا کہ جو شخص عذاب خداوندی سے ڈرتا رہا وہی بیگانوں سے حسن سلوک کر سکتا ہے اور جسے موت کا دھڑکا لگا رہا وہ لوگوں کے حقوق کے ضیاع کے اندیشہ میں مبتلا رہا۔

یہ شخص جسے لوگ عمر کے بجائے عمیر یعنی اسم تصغیر کے ساتھ پکارتے تھے جس کی اسلامی معاشرہ میں کوئی وقعت نہیں تھی جس کے بارے میں عورتیں بھی جانتی تھیں کہ ایک چھوٹا آدمی اونچی مسند پر براجمان ہو گیا ہے وہ کبھی پیغمبر کے خاندان کو آنکھیں دکھاتا ہے کبھی اس کے بارے میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ اس کی رائے کو پیغمبر کی رائے پر خود خدا نے کئی مرتبہ فوقیت دی اور یہ جھوٹ گھڑنے والوں نے کیا کیا جھوٹ نہ گھڑا تاکہ عمر سے عمیر کہلانے والا شخص ایک بلند و بالا شخص نظر آئے اور تاریخ کا مذاق اڑایا جاتا رہے

لیکن تاریخ نے کب کسی کو معاف کیا ہے جو اس قماش کے لوگوں کو معاف کرتی آج دنیا کی آبادی کا بہت بڑا حصہ اور انسانوں کی ایک کثیر تعداد اس امر سے خوب واقف ہے کہ یہ خود ساختہ امیر المومنین ایک غاصب، ظالم بدخو اور ستم گر انسان تھا جس نے محسن کشی کی روایت قائم کی اور اس کے ظلم و ستم کا نشانہ سب سے پہلے اس کے پیغمبر کا خاندان بنا اور جوں جوں علم و تہذیب و آگہی کی روشنی پھیلتی چلی جائے گی بہت سے بھیانک چہرے بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے اور تب دنیا کو اندازہ ہو گا کہ وہ جن بتوں کو خدا سمجھ کر ان کی پوجا کر رہے تھے وہ مٹی کے خود تراشیدہ بت تھے جو علم و معرفت کی ایک ہی ٹھوکر سے ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئے ہیں ۔

وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

کتب حدیث وسیر میں ایسی روایات بکثرت موجود ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دین اسلام کے مستقبل کے بارے میں سب سے زیادہ تشویش بنی امیہ کی جانب سے تھی۔ نعیم الدین بن حماد نے اپنی کتاب الفتن میں حضرت عبداللہ ابن مسعود کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ

لکل دین آفت وآفتہ ھذا الدین بنوامیہ۔

ہر دین کے لیے تباہی کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے اسلام کی تباہی وبربادی کا سبب بنوامیہ ہوں گے۔ اس سلسلے کی دوسری بہت سی روایتوں کو جو مستدرک حاکم اور دیگر کتب حدیث میں متعدد صحابہ سے مروی ہیں ترک کرکے صرف ترمذی کی اس روایت کو لیتے ہیں جس میں عمران بن حصین روایت کرتے ہیں کہ

مات النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وھو یکرہ ثلاثہ احیاء ثقیف وبنی حنیفہ وبنی امیہ۔

اپنی وفات کے آخری لمحہ تک حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جن قبیلوں سے نفرت تھی وہ یہ تین تھے۔

بنو ثقیف

بنو حنیفہ اور

بنو امیہ

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے علماء نے وضاحت کی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ان قبائل سے نفرت کرنا اس بنیاد پر تھا کہ بنو ثقیف میں حجاج یوسف ثقفی جیسا ظالم پیدا ہوا۔ بنو حنیفہ میں مسلیمہ کذاب

پیدا ہوا اور بنوامیہ میں عبیداللہ ابن زیاد ہوا علماء کی اس تشریح پر تنقید کرتے ہوئے شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی مشہور کتاب اشعتہ اللمعات میں لکھا ہے۔

"عجیب است ازیں قائل کہ یزید را نہ گفت" کہ امیر عبداللہ بن زیاد بود ہرچہ کرد بہ امروی ورضائے دی کرد وباقی بنوامیہ ہم از کارہائے خود تقصیر نہ کردہ اند یزید وعبیداللہ راچہ گویند (ج ۴ باب مناقب قریش وذکر القبائل) یعنی بنوامیہ کے ذکر میں عبیداللہ بن زیاد کا ذکر تو کیا لیکن تعجب ہے کہ یزید جس نے عبیداللہ بن زیاد کو مقرر کیا اس کا ذکر یہ لوگ گول کر گئے جب کہ عبیداللہ بن زیاد نے جو کچھ کیا وہ یزید کے حکم اور اس کی رضامندی ہی سے کیا۔ اور پھر بنوامیہ کے دوسرے لوگوں نے کونسی کمی کی تھی کہ صرف یزید اور عبیداللہ بن زیاد ہی کو مورد الزام قرار دیا جائے۔"

تاریخ کے ادنیٰ طالب علم سے ہمارا سوال صرف یہ ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ناپسندیدہ قبیلہ کو امت پر مسلط کرنے والا کون تھا۔ وہ پہلا خلیفہ جس نے یزید بن ابی سفیان کو دمشق کا گورنر مقرر کیا یا وہ دوسرا خلیفہ جس نے یزید کے مرنے کے بعد اس کے چھوٹے بھیا معاویہ کو پورے شام کی حکمرانی سونپ دی۔ اور جس نے بنی امیہ کے ایک اور شخص عثمان بن عفان کی خلافت کی راہ ہموار کی اور جس کی ریشہ دوانیاں سے بنوامیہ کو اسلام کے نظام حکومت پر قبضہ جمانے کا موقع ملا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پسند وناپسند کو ٹھکرانے والے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواہشات کو پامال کرنے والے ہی اگر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین ہیں تو کہاں کا اسلام اور کہاں کی مسلمانی۔

مولائے کائنات

"من کنت مولاہ فعلی مولاہ" جس کا میں مولیٰ ہوں علیؑ بھی اس کا مولیٰ ہے کے معنوں میں آج جو تاویل و تحریف کی جارہی ہے۔ کیا یہ تاویل القول بما لایرضیٰ بہ القائل کہنے والے کی مرضی کے برعکس بات کا مفہوم مراد لینا، کی، کی بدترین صورت نہیں ہے۔

مسلمانوں کے معاشرہ میں ایسا کون تھا جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کو اپنا دوست رکھنے کا دعویٰ نہیں کرتا تھا اس لیے علیؑ ابن ابی طالبؑ کے لیے دوست داری کے جذبات کی اپیل کرنا ایک لایعنی سی بات ہے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منشاء مفہوم واضح تھا وہ اس اعلان کے ذریعے سیدنا علیؑ کی خلافت و ولایت کا اعلان کر رہے تھے لیکن بنوامیہ اور اس کے حلیف قبائل کے زبردست دباؤ اور ابوبکر و عمر کے ساتھ ان کی ملی بھگت اور دیگر منافقین کی ساز باز سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واضح فرمان کو پسِ پشت ڈال دیا گیا۔

حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

سیدنا علیؑ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

ضغائن فی صدور الاقوام لا یبدونہا لک الا من بعدی

(کنزالعمال ج ۶ ص ۴۰۸ و ریاض النضرہ ص ۲۱۰)

بہت سے قبیلوں کے دلوں میں کینہ اور کپٹ چھپا ہوا ہے وہ تمہارے معاملہ میں اس بغض و عداوت کا اظہار میرے جانے کے بعد کریں گے چنانچہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد یہ بغض و کینہ اپنی عملی شکل میں نمودار ہوا اور اس میں ہر ایک نے اپنے اپنے ظرف کے مطابق حصہ لیا لیکن یہ جاننے کے لیے بہت زیادہ فہم و دانش کی ضرورت نہیں ہے کہ اس بغض و حسد کے اظہار میں خاندان بنی امیہ کا حصہ سب سے زیادہ تھا اور ابوبکر و عمر بنی امیہ اور اس کے حلیف قبیلوں کے آلہ کار تھے۔

بنی امیہ کی اسلام دشمنی

جہاں تک بنی امیہ کی اسلام دشمنی اور خانوادۂ بنی ہاشم کے ساتھ انکی درپردہ اور علانیہ عداوت و مخالفت کا تعلق ہے تو یہ بات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم واطلاع میں تھی اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس امر کا بخوبی احساس تھا کہ یہ قبیلہ گو بہ ظاہر مسلمان ہو چکا ہے مگر ان کے دل نہ اسلام کی طرف سے صاف ہیں نہ مسلمانوں کے لیے ان کے اندر خیر خواہی کا جذبہ ہے نہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت سے ان کی دشمنی میں کچھ کمی آئی ہے اور اس میں خاندان بنو امیہ کے کسی فرد کی تخصیص نہیں ہے اور کوئی استثنا بھی نہیں ہے جس کا عثمان بن عفان کی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ قرابت کا اتنا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک ان کی کیا اوقات تھی اس کا اندازہ جبیر ابن مطعم کی اس روایت سے ہوتا ہے جسے بشتر محدثین نے جن میں بخاری، ابوداؤد، نسائی اور شافعی شامل ہیں اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

عن جبیر بن مطعم قال مشیا انا و عثمان بن عفان الی النبی

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقلنا اعطیت بنی المطلب من خمس خیبر وترکتنا ونحن بمنزلۃ واحدۃ منک فقال انما بنوھاشم وبنو المطلب شیئی واحد قال جبیر ولم یقسم النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لبنی عبد شمس وبنی نوفل شیئا۔

(رواہ البخاری)

جبیر بن مطعم کہتے ہیں۔ میں اور عثمان بن عفان حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ نے بنی المطلب کو تو خمس خیبر میں سے حصّہ دیا ہے اور ہمیں یعنی بنی اُمیّہ اور بنی نوفل کو کچھ نہیں دیا حالانکہ قرابت کے اعتبار سے ہم سب ایک ہی دادا کی اولاد ہونے کے ناطے سے آپ کے لیے یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔

اس پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا
بنو ہاشم اور بنو مطلب ایک ہی چیز ہیں۔

جبیر جو بنی نوفل سے تعلق رکھتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہماری اپیل مسترد فرما دی اور مجھے اور عثمان کو یعنی بنی نوفل اور بنی عبد شمس کو خمس خیبر سے کچھ حصّہ نہ دیا۔" (بخاری)

عبد مناف ؑ کے چار لڑکے تھے۔ ہاشم ؑ۔ مطلب ؑ۔ نوفل اور عبد شمس
جبیر اور عثمان بن عفان بالترتیب نوفل اور عبد شمس کی اولاد میں سے تھے اور عبد شمس بنی اُمیّہ کا مورث اعلیٰ ہے۔

انھیں جبیر بن مطعم کی ایک اور روایت جو زیادہ واضح ہے حسب ذیل ہے۔

عن جبیر بن مطعم قال لما قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سھم ذوی القربیٰ بین بنی ھاشم وبنی المطلب اتیتہ وعثمان بن عفان فقلنا یارسول اللہ! ھٰولاء اخواننا من بنی ھاشم لاننکر فضلھم کانک ولذی وضعک اللہ منھم ارایت اخواننا من بنی المطلب اعطیتھم وترکتنا وانما قرابتنا وقرابتھم واحدۃ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم انما بنوھاشم وبنو المطلب شیٔ واحد ھکذا وشبک بین اصابعہ (رواہ الشافعی)

وفی روایۃ ابی داؤد والنسائی نحوہ وفیہ انا وبنو عبدالمطلب لانفترق فی جاھلیۃ ولا اسلام وانما نحن وھاشم شیٔ واحد وشبک بین اصابعہ۔

جبیر بن مطعم کہتے ہیں جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے قرابت داروں کا مخصوص حصّہ بنی ہاشم اور بنی مطلب کے درمیان تقسیم فرمایا تو میں اور عثمان بن عفان بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یارسول اللہ! جہاں تک ہمارے بھائیوں بنی ہاشم کے خاندان والوں کا تعلق ہے تو ہمیں ان کی عظمت وفضیلت سے انکار نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ نے اسے اس خاندان میں آپ کو مرتبۂ عظیم سے نوازا ہے لیکن بنی مطلب کے بارے میں ہمیں یہ کہنا ہے کہ آپ نے انھیں بھی سہم ذوی القربیٰ (خانوادۂ رسالت کا مخصوص حصہ) سے عطا فرمایا ہے لیکن آپ نے ہمیں نظر انداز فرمادیا حالانکہ ہماری اور ان کی آپ کے ساتھ رشتہ داری میں کوئی فرق نہیں ہے اس پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"بنو ہاشم اور بنو مطلب تو ایک ہی چیز ہے اور آپ نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم یک دگر پیوست کرکے اس قرابت کی مضبوطی کا اظہار

فرمایا۔

ابو داؤد اور نسائی کی روایت میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"میں اور بنی مطلب نہ جاہلیت میں الگ تھے نہ اسلام میں الگ ہوئے ہیں ہم اور وہ تو ایک ہی شے ہیں اور پھر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دستہائے مبارک کی انگلیوں کو آپس میں پیوست فرما کر بتایا۔"

محدثین نے ایک ہی دادا کی اولاد میں اس فرق کو روا رکھنے کی جو توجیہ پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ جب قریش مکہ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سوشل بائیکاٹ اور مقاطعہ کیا تو بنو ہاشم اور بنو مطلب نے حضور کا ساتھ دیا جب کہ بنی نوفل اور بنی امیہ اس بائیکاٹ میں شریک ہوئے۔

شعب ابی طالبؑ میں سوشل بائیکاٹ کے وہ کٹھن سال جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے رشتے داروں نے گزارے اس مشکل وقت میں نہ ابوبکر نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دیا نہ عمر نے نہ عثمان نے صرف حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کے افراد اس پر آشوب دور میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شریک حال رہے اور بنی مطلب نے بھی مصیبت کے اس وقت میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دیا تھا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس رفاقت کا اس درجہ پاس کیا کہ ابو طالبؑ کو دوسرے اسی درجہ کے قرابت داروں کے معاملہ میں خصوصی شرف و امتیاز کا مستحق قرار دیا لیکن آج اہل سنت کے علماء دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ حضرت ابو طالبؑ جو اس سوشل بائیکاٹ کا اصل ہدف بنے وہ

توجہنم میں جائیں گے اور افضل البشر بعد الانبیاء پہلے ابوبکر ہیں پھر عمر ہیں اور پھر عثمان ہیں۔ اسے کہتے ہیں "مان نہ مان میں تیرا مہمان"۔ انگریزی کا ایک عام محاورہ ہے۔

A FRIEND IN NEED IS A FRIEND INDEED

دوست وہ جو مشکل میں کام آئے۔

لیکن اہل سنت کا علم الکلام ایک نیا فلسفہ پیش کرتا ہے کہ

"دکھ بھریں بی فاختہ اور انڈے کوے کھائیں۔"

دکھ جھیلیں سیدنا ابوطالبؑ اور اعزاز پائیں ابوبکر جن کو دو راتیں غار میں رہنا پڑا تو یوں پریشان ہو گئے گویا غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے اور پیغمبرؐ کو سختی سے کہنا پڑا کہ "لاتحزن ان اللہ معنا"۔ غم مت کرو کہ اللہ تعالٰی ہمارے ساتھ ہے اور سیدنا ابوطالبؑ تین برس تک شعب ابی طالبؑ میں اپنے بھتیجے کے ہر دکھ میں برابر کے شریک رہے تو انھیں یہ کمینے لوگ اس کا یہ صلہ دیتے ہیں کہ ایک جعلی من گھڑت اور سراسر جھوٹی روایت وضع کر لی گئی کہ خدا نخواستہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عم بزرگوار حضرت ابوطالبؑ کے بارے میں فرمایا ہے۔ والعیاذ باللہ۔

"سب سے کم عذاب ابوطالبؑ کو ہوگا کہ ان کے پیروں میں آگ کی جوتیاں پہنائی جائیں گی جن سے ان کا دماغ یوں کھولنے لگے گا جیسے چولہے پر ہنڈیا کھولتی ہے۔"

وہ پیغمبرؐ جس نے رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے جنازہ میں شرکت کی ہو اور محض اس کے مسلمان بیٹے کی دلجوئی اور دل داری کی خاطر، وہ اپنے چچا کو اس کی عمر بھر کی کمائی کا یہ صلہ دیتا ہے کہ اسے آگ کی جوتیاں پہنا رہا ہے

اور نہ اپنے عم زاد اور داماد علیؑ ابن ابی طالبؑ کا اسے لحاظ آتا ہے نہ اپنی اس چچی سیدہ فاطمہ بنت اسد کا جس کے بارے میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"مجھ پر میری اس چچیؑ سے زیادہ احسانات کسی اور کے نہیں ہیں"

احسان فراموشی کی اس سے بری مثال بھی اور کوئی ہو سکتی ہے کہ جس چچا نے پالا پوسا۔ جس نے بچپن میں یتیمی کی حالت میں سرپرستِ شفقت رکھا، جس نے سفر و حضر میں اپنے سے جُدا نہ کیا، جس نے زندگی کی کڑی دھوپ میں سایۂ رحمت بن کر بھتیجے کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھا۔ جس نے نبوت کے دشوار گزار مراحل میں قدم قدم پر ساتھ دیا اور تن تنہا سارے عرب کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو گیا اور کارِ نبوت اور تبلیغ دین میں کسی کو رکاوٹ نہ بننے دیا جو سارے عرب کی آنکھ کا تارا اور حرم کعبہ کے نگراں کی حیثیت سے مکّہ کا معزز سردار تھا مگر اس بھتیجے کی خاطر اس نے پورے شہر اور سارے قبیلے سے دشمنی مول لی وہ بھتیجا اس محسن غمگسار اور جان سے زیادہ عزیز رکھنے والے چچا کے بارے میں اس قسم کے کلمات بد کہے پیغمبرؐ کا مقام تو بہت بلند ہے وہ تو تمام احساسات لطیف کا مالک اور لغزش بشری کی ہر آلائش سے مُبرّا ہوتا ہے۔ ایک عام شریف انسان بھی ایسی بد لحاظی اور بے مروتی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔

مگر جن لوگوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھیں بند ہوتے ہی آپؐ کے اہل خاندان کے ساتھ بے مروتی اور بدسلوکی کا مظاہرہ کیا ہو وہ لوگ البتہ اس قسم کی باتیں گھڑ سکتے ہیں اور ایسے لوگوں کو ماننے والے بھی بے مروتی کے اس انداز کو گوارا کر سکتے ہیں کوئی شریف النفس انسان ایسی بے مروتی کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس دین حق کے علمبردار بن کر تشریف لائے تھے اس میں اخلاق کی پاسداری کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی بلکہ حضورؐ نے تو اسے اپنی بعثت کا مقصد اول قرار دیا اور ارشاد فرمایا۔

انما بعثت لا تمم مکارم الاخلاق میری بعثت ہی اس لیے ہوئی کہ میں اخلاق کریمانہ کو حد کمال تک پہنچادوں پھر کیا اخلاق کا یہی تقاضا تھا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے سیدنا ابو طالبؑ کے لیے کلمۂ خیر کی بجائے ایسا غیر شریفانہ کلمہ صادر ہوتا ابوبکر جس نے ہجرت کے موقعہ پر بھی اونٹنی کی قیمت وصول کر کے دوستی کی لاج رکھی اس کے بارے میں تو سپاس گزاری کا حال ہو کہ حضورؐ اسے "امن الناس علی فی صحبتہ ومالہ ابوبکر (اپنی سنگت اور اپنے مال کے اعتبار سے مجھ پر سب سے زیادہ احسان کرنے والا) کہیں اگرچہ یہ حدیث بھی سراسر موضوع ہے لیکن بالغرض اسے درست بھی تسلیم کرلیں۔ تو کیا سیدنا ابو طالبؑ کے احسانات ابوبکر سے بھی کم تھے کہ انھیں جنّت کی بشارت دی جارہی ہے اور انھیں جہنم میں دھکیلا جارہا ہے۔

میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ مسلمان قوم کی پوری تاریخ بے مروتی کی داستانوں سے بھری پڑی ہے اس قوم نے ہمیشہ اپنے محسنوں کے ساتھ بے مروتی اور بد لحاظی کا برتاؤ کیا۔

ابوبکر و عمر نے سیدہ فاطمہؑ بنت محمد سلام اللہ علیہا کے ساتھ جس سرد مہری اور بے مروتی کا معاملہ کیا وہ تاریخ اسلامی کا ایک شرمناک باب ہے اور یہ اسی کی پھٹکار اس قوم پر پڑی ہے کہ بے مروتی اس قوم کی کتاب زیست کا مستقل عنوان بن گئی ہے۔

مورخین نے اپنی کتب سیر میں نورالدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی کے حالات لکھتے ہوئے ایک واقعہ کی جانب اشارہ کیا ہے۔

"صلاح الدین ایوبی ایک معمولی قلعہ دار کا لڑکا تھا نورالدین زنگی نے اس شخص کو معمولی مقام سے اٹھا کر مسند عزت وجاہ پر لا بٹھایا اور اس کا صلہ اس نے اپنے اس محسن کو یہ دیا کہ اس کی زندگی میں اس کو قتل کرنے کی سازش کی وہ تو اس کا باپ آڑے آیا اور اس نے اپنے اس "ہونہار" بیٹے کو سمجھایا کہ بڈھا مرنے والا ہے ہم دونوں نے اس کا نمک کھایا ہے اسے مرنے دو بعد میں جو چاہے کرتے رہنا چنانچہ ادھر نورالدین زنگی کی آنکھیں بند ہوئیں ادھر صلاح الدین ایوبی صاحب نے ان کے جانشین کو زہر دے کر مروا ڈالا۔"

اس سے پہلے ہارون الرشید نے خاندان برامکہ سے بے مروتی کا جو برتاؤ کیا تھا وہ ہماری تاریخ ملی کا ایک شاہکار ہے اور دور کیوں جائیے خود اپنے ہی ملک کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ اس مملکت کے بانی تھے وہ زیارت میں بستر علالت پر ہیں ان کی حالت مخدوش ہوگئی تو انھوں نے کراچی آنے کا فیصلہ کیا ہوائی اڈے پر ہوائی جہاز پہنچا تو وزیراعظم لیاقت علی خاں ہوائی اڈہ سے غیر حاضر تھے ایک قابل مرمت ایمبولینس ملک کے سب سے بڑے عوامی حاکم کو لینے کے لیے ہوائی اڈے بھیجی گئی جو ایک جاں بہ لب مریض کو لے کر روانہ ہوئی تو راستے میں دو گھنٹے تک خراب رہی اور کوئی پرسان حال نہیں ہے۔

اور یہ لیاقت علی قائداعظمؒ کی جوتیوں کے طفیل ہی وزیراعظم بنے تھے ملک میں نہ بیرسٹروں کی کمی تھی نہ نواب زادوں کی لیکن لیاقت علی اس بوڑھے

کے مرنے کا انتظار کر رہے تھے جس نے انھیں تحت الثریٰ سے اٹھا کر اوجِ ثریا تک پہنچایا اور اپنی قائم کی ہوئی مملکت کی تاریخ کا ایک حصہ بنا دیا۔

بعد میں ایک موقعہ پر جب خان سے مصالحت کے لیے سلسلہ جنبانی ہوئی تھی تو لیاقت علی نے صلح کے اس ہاتھ کو یہ کہہ کر جھٹک دیا کہ ایک قائد اعظم سے تو بڑی مشکل سے پیچھا چھوٹا ہے اب ایک دوسرا قائد اعظم خود پر مسلط کر لوں۔

یوں لگتا ہے جیسے لیاقت علی نے بے مروتی کا یہ سبق خلیفہ اول ابوبکر سے سیکھا تھا۔

بنگلہ دیش کا بانی شیخ مجیب الرحمٰن تھا۔ یہ اس قوم کا موسس اور "بابائے قوم" تھا قطع نظر اس طرزِ عمل کے جو شیخ مجیب نے پاکستان کو دولخت کرنے میں اپنے شریکِ کار سیاست دانوں کے ساتھ مل کر اختیار کیا تاہم وہ بنگالی مسلمانوں کا ہیرو تھا لیکن اس کے معتمد ساتھیوں نے اس کا یہ حشر کیا کہ اس کا سلسلۂ نسل تک منقطع کر دیا اور گھنٹوں اس کی لاش سیڑھیوں پر پڑی سڑتی رہی۔

انڈونیشیا کی آزاد سلطنت کے بانی ڈاکٹر احمد عبدالرحیم سوئیکارنو ڈچ استعمار کے خلاف چالیس برس تک مسلسل جدوجہد کرتے رہے اور آزادی کی منزل کو جا لیا لیکن سوئیکارنو کا حشر کیا ہوا اس کے معتمد اور قابلِ اعتماد رفیق جنرل عبدالحارث ناسوشیان کی درپردہ سازش سے ایک تیسرے درجہ کا فوجی سوہارتو دنیا کی اس سب سے بڑی اسلامی سلطنت کا حکمراں بن گیا اور ڈاکٹر سوئیکارنو مرحوم خود اپنے ہی ملک میں اپنے ہی قوم کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو گئے اور جب ان کا انتقال ہوا تو ان کی تدفین اس درجہ خفیہ رکھی گئی کہ ان کے اعزا و لواحقین

کو حکومت سے یہ درخواست کرنی پڑی کہ ان کی قبر کا نشان بتایا جائے۔

جو قوم اپنے پیغمبرؐ کے ساتھ بے مروتی برت سکتی ہے اس سے کسی اور کے بارے میں کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ پیغمبرؐ بستر مرگ پر ایک فرمان جاری کرتا ہے یعنی لشکر اسامہؓ کی روانگی کا اور فوری روانگی کا اسے بھی ٹال دیا گیا۔ پھر وہ ایک اور فرمان جاری کرتا ہے کہ ایک ضروری ہدایت لکھنی ہے اس کے لیے کاغذ قلم لاؤ تو اسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا جاتا ہے کہ پیغمبرؐ ہوش میں نہیں ہے۔

شانِ صحابہ ۔ ایک بے معنی لفظ

یہ ہیں وہ جانشینانِ رسولؐ جن کی عظمت کا صدیوں سے ڈنکا بجایا جارہا ہے اور انھیں یوں بڑھا چڑھا کر پیش کیا جارہا ہے گویا نعوذ باللہ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو پیغمبرؐ کا مشن ہی ناکام ہوجاتا اور اس کی پیغمبری کسی شمار قطار ہی میں نہ ہوتی۔

اب یہ کہا جاتا ہے کہ بھلا ابوبکر و عمر کے اخلاص نیت اور دیانت میں شک و شبہ کا اظہار کیا جاسکتا ہے اور اگر ان کے متعلق کوئی ایسی ویسی بات کی جائے تو خود ذاتِ پیغمبرؐ پر اس سے حرف آتا ہے کہ اس کے اتنے قریبی ساتھی مشکوک کردار کے حامل تھے اور پیغمبرؐ ان کی قرار واقعی حیثیت اور ان کی حقیقت سے واقف نہ ہوسکا۔

یہ اعتراض اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتا کہ پیغمبرؐ کے ساتھیوں کے مشکوک کردار سے پیغمبرؐ کی ذات پر حرف آتا ہے۔ قرآن مقدس نے بہت سے انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے ایک طویل عرصہ تک اپنی قوم کی ہدایت و اصلاح کے لیے بھرپور جدوجہد کی اور ان کی تبلیغی مساعی سے بہت کم لوگ

متاثر ہوئے جیسے حضرت نوح علیہ السلام کہ وہ تقریبًا ساڑھے نوسو برس تک اپنی قوم کو راہ راست پر چلنے کی تلقین کرتے رہے مگر نتیجہ کیا رہا۔ قرآن کہتا ہے۔ وما آمن معہ الا قلیل۔ بہت کم لوگ ان کے ساتھ ایمان لائے۔

قرآن مقدس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بکثرت تذکرہ فرمایا ہے۔ اپنی قوم کی بہتری اور بہبودی فرعون کے مظالم سے نجات دلانے، غلامی کے شکنجے سے آزاد کرانے اور اقوام عالم کی برادری میں اسے باعزت مقام دلانے کے لیے انھوں نے کیسی زوردار جدوجہد کی لیکن جب حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن آزمائش کی گھڑی آئی تو اس قوم نے جو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائی تھی اور جو ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے صحابی ہونے کا شرف رکھتی تھی موسیٰ علیہ السلام کو کیسا ٹکا سا جواب دیا تھا کہ اذھب انت وربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون۔ (موسیٰؑ تم اور تمہارا پروردگار دونوں جاکر دشمنوں کا مقابلہ کرو ہم تو تمہارے ساتھ اٹھنے والے نہیں ہیں) کہ ؎

"پاؤں توڑ کے بیٹھے ہیں پائے بند تیرے"

چھٹے پارے میں موسیٰ علیہ السلام اور ان کے صحابہ کا مکالمہ مذکور ہے اور ان صحابہ کی احسان فراموشی اور بے وفائی کا تذکرہ بھی موجود ہے اور یہ بات بھی قرآن مقدس کے ریکارڈ پر ہے کہ قوم کی اس بے حسی اور منافقت اور اپنے صحابہ کی اس غدارانہ روش کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں فریاد کی تھی۔ قال رب انی لا املک الا نفسی واخی فافرق بیننا وبین القوم الفاسقین۔

(پ ۶۔ مائدہ)

موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا خدایا میں تو صرف اپنی جان کا اور اپنے بھائی، ہارونؑ، کی جان کا نذرانہ پیش کرسکتا ہوں کسی اور کی ذمہ داری نہیں

لے سکتا۔ خدایا ہم دونوں بھائیوں کے اور اس بدکردار قوم کے درمیان جدائی ڈال دے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام صاحب کتاب اور صاحب شریعت پیغمبر ہیں اولوالعزم پیغمبروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

وہ برسہا برس کی صبر آزما جدوجہد کے بعد بھی اپنے کسی صحابی کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور صرف اپنی ذات کو اور اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو بارگاہ خداوندی میں پیش کرتے ہیں۔

ہمارے بہت سے مفسرین نے لکھا ہے کہ قرآن مقدس میں جس کثرت کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ ملتا ہے کسی اور پیغمبرؑ کا اس کثرت سے ذکر نہیں آیا۔ اور اس کی بڑی وجہ دعوت و تبلیغ کی وہ دشواریاں ہیں جن سے ایک ہی طرح کے حالات میں حضور محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو واسطہ پڑا دونوں جلیل القدر پیغمبروں کے درمیان بہت سی مماثلتیں ہیں اور ان مماثلتوں میں ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اپنے مددگار و معاون کے طور پر اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کی امداد و اعانت کی ضرورت محسوس ہوئی اور انھوں نے خدا کے حضور استدعا کی

رب اشرح لی صدری و یسرلی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھو اقولی واجعل لی وزیرا من اھلی ھارون اخی اشدد بہ ازری واشرکہ فی امری کی نسبحک کثیرا ونذکرک کثیرا انک کنت بنا بصیرا قال قد اوتیت سؤلک یاموسیٰ۔

(میرے پروردگار میرا سینہ کھول دے، میرا کام آسان کر دے میری زبان کی گرہ کشائی فرما میرے بھائی ہارونؑ کے ذریعے میرے ہاتھ مضبوط فرما دے اسے میرے اس کام میں میرا شریک کار بنا دے تاکہ ہم بکثرت تیری تسبیح کرسکیں اور بہ کثرت تجھے یاد کرسکیں تو تو ہمارے دل کی کیفیتوں سے بہ خوبی آگاہ ہے)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ درخواست قبول کرلی گئی اور ان کے بھائی ہارونؑ کو ان کا شریک و معاون مقرر کیا گیا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی آغازِ سفرِ نبوت میں ہی بلا طلب کے خصوصی انعام کے طور پر حضرت سیدنا علیؑ ابن ابی طالبؑ کی رفاقت و اعانت سے نوازا گیا۔

دعوتِ عشیرہ کے موقعہ پر جب تمام عمائدِ عرب سربراہان قبائل اور جوانانِ قریش جمع تھے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعوت و تبلیغِ دین کے سلسلے میں لوگوں کو اپنی مدد کے لیے پکارا تمام مجمع پر سکوت مرگ طاری ہوگیا اور پوری محفل پر سناٹا چھاگیا اس سناٹے کو چیرتی ہوئی ایک آواز ابھری انا نصیرک یارسول اللہ (اے اللہ کے پیغمبر میں آپ کا مددگار ہوں۔)

یہ بارہ ۱۲ برس کے ایک نوخیز اور نو عمر بچے کی آواز تھی جس کے مقدر میں یہ بات لکھی جاچکی تھی کہ وہ حق کا سپاہی پیغمبرؐ کا دستِ راست اور اس کی جدوجہدِ رسالت کا امین و محافظ اور اس کی مسند امامت کا ولی و وارث بنے گا یہ آوازۂ غیبی تھا یہ الہامی آواز تھی اور یہ بلامنت سوال ایک عطیۂ خداوندی تھا جس سے پیغمبرؐ آخرالزماں کو نوازا گیا اور یوں جس نعمت سے موسیٰؑ کو طلب وسوال کا منت کش رحمت بنا کر نوازا گیا حق تعالیٰ

نے اپنے محبوب خاص محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ نعمت از خود مرحمت فرمادی۔

اس سے جہاں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے وہاں سیدنا علیؑ ابن ابی طالب کی عظمت کا نقش بھی کمفحہ تاریخ پر مرتسم ہوتا ہے کہ حضرت ہارونؑ کو جو اعزاز ادھیڑ عمر میں ملا سیدنا علیؑ کو عنوان شباب ہی میں اس اعزاز کا مستحق قرار دے دیا گیا

موسیٰ علیہ السلام کو جو شکایت اپنے صحابہ سے تھی کہ وہ راہ عزیمت و استقامت میں ان کے دوش بہ دوش میدان عمل اور مصارف جہاد میں ان کے شریک کار نہیں بنتے تھے اسی قسم کی شکایت حضور نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اپنے صحابہ سے پیدا ہوئی اگرچہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مروت وحیا نے اس کے اظہار سے گریز فرمایا۔

غزوہ خندق (احزاب) میں جب عمرؔ ابن عبدود نے مسلمانوں کو دعوت مبارزت دی تو کیا اس وقت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارد گرد صحابہ کا جم غفیر موجود نہیں تھا کیا وہاں ابو بکر نہیں تھے کیا عمر ابن خطاب موجود نہیں تھے لیکن عرب کے اس نامور سورما کا نام سن کر سب کو سانپ سونگھ گیا صرف ایک آواز تھی جو بار بار اس کی مبارزت کی للکار کے جواب میں بلند ہوتی تھی کہ "انا لہٗ یا رسول اللہ (یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کے مقابلہ پر نکلوں گا) اور جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ جاں نثاری کا دم بھرنے والوں میں سے کوئی ٹس سے مس نہیں ہوتا اور دودھ پینے والے مجنوں جان کی بازی لگانے سے پس وپیش کر رہے ہیں تو پھر وہی عم زاد پیغمبر پروردہ آغوش نبوت مثیل ہارون میدان میں نکلا

اور چشم زدن میں اس نے عرب کے اس ناقابل شکست سورما کا غرور خاک میں ملا کر رکھ دیا اور اسے تہ تیغ کر کے دم لیا۔

اور زندگی کے اس کٹھن اور مشکل دور میں جب ایک طاقت ور حریف کے مقابلہ کے لیے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی پوری فوجی قوت مجتمع کر کے مدینہ منورہ سے کالے کوسوں دور تبوک کا سفر اختیار کرنا پڑا تو اس نازک مرحلہ پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی کا شرف بھی اسی بھائی کو حاصل ہوا جو مثیل ہارونؑ تھا اور جب اس نے شرف جہاد سے اس محرومی پر ملال کا اظہار کیا تو زبان نبوت و وحی نے اما بنعمۃ ربک فحدث (اپنے رب کی نعمت کا برملا اظہار کر) کے ارشاد ربانی کے مطابق اس جان و دل سے عزیز بلکہ یک جان دو قالب بھائی سے فرمایا۔ الا ترضی ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی۔ (کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ تم میرے لیے وہی کچھ ہو جو موسیٰؑ کے لیے ہارونؑ تھے فرق صرف نبوت کا ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا ورنہ وہ تاج بھی تمہارے سر پر رکھا جاتا۔

چت بھی میرا پٹ بھی میرا

جن لوگوں کے دلوں میں سیدنا علیؑ ابن ابی طالبؑ کا بغض ودیعت ہوا ہے اور جو اٹھتے بیٹھتے ان کے حریفان کم سواد و رقیبان روسیاہ کے گن گاتے رہتے ہیں وہ شرف و امتیاز کے ان زریں واقعات کو سن کر جواب میں یہ کہا کرتے ہیں کہ یہ کوئی ایسی ما بہ الامتیاز خصوصیت نہیں کیونکہ حدیث سے ثابت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں غزوات میں شرکت کے موقعہ پر بعض دوسرے صحابہ کو بھی جن میں مشہور نابینا صحابی حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم کا نام بھی آتا ہے اپنا جانشین مقرر فرمایا ہے لیکن کیا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسرے کسی صحابہ کو "بمنزلۃ ہارون من موسیٰ" کی نوید سنائی اور کیا کسی اور صحابی کی بابت من کنت مولاہ فعلی مولاہ (جس کا میں آقا ہوں علیؑ بھی اس کا آقا ہے) کا اعلان فرمایا۔ ایک طرف تو یہ لوگ ابو بکر کے نماز پڑھانے کو ان کی خلافت کے لیے سند جواز کے طور پر پیش کرتے ہیں اور ان کے خلیفہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ ہی یہ پیش کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو اپنے

مصلٰی پر کھڑا کیا حالانکہ اگر یہ کوئی اعزاز ہے تو ابوبکر سے پہلے دوسرے بہت سے صحابہ کو یہ اعزاز مل چکا تھا اس بنا پر خلافت کے لیے ان کو اولیت اور فوقیت دی جانی چاہیئے تھی۔ ان نماز پڑھانے والوں میں ایک نمایاں نام تو عبداللہ ابن ام مکتوم کا ہے اس کے علاوہ حضرت سعدؓ بن عبادہ ابوذر غفاری، ابولبابہؓ، عتاب بن سید اور ایسے ہی دوسرے بہت سے صحابہ کے بارے میں یہ بات مذکور ہے کہ انھوں نے وقتاً فوقتاً حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مصلی پر کھڑے ہوکر نماز پڑھائی اگر اس سے ان کی خلافت متحقق نہیں ہوئی تو ابوبکر کس طرح مستحق خلافت ہو سکتے ہیں۔

جب کہ خود اہل سنت کی ہی کتب حدیث میں اس مضمون کی روایتیں موجود ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ الصلوٰۃ واجبۃ علیکم خلف کل مسلم براکان اوفاجراوان عمل الکبائر۔ (نماز باجماعت) تم پر واجب ہے ہر مسلمان کی اقتداد میں چاہے وہ نیک ہو یا بد اور خواہ وہ مرتکب کبائر ہی کیوں نہ ہو۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

صلوا خلف کل بروفاجر۔ ہر نیک وبد کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرو۔

گویا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مصلی پر کھڑے ہونے سے مسند خلافت تو کیا ملتی ابوبکر کا نیک ہونا بھی ثابت نہیں ہوتا لیکن پروپگنڈے کی تکنیک ہی یہ ہے کہ ایک جھوٹ بے بنیاد اور بے سروپا بات پر پورا زور بیان صرف کر دیا جائے۔ اور اس حد تک اسے دہرایا جائے کہ بہ ظاہر وہ کتنی ہی بے وزن کیوں نہ ہو لوگ اس کی صداقت تسلیم کریں۔

ابوبکر کو اگر خلافت اس لیے ملی کہ انھوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے مصلّٰی پر کھڑے ہو کر نماز پڑھائی تھی تو عمر کو کس خدمت کا اظہار بدانجامی پر یہ دولت میسّر آئی کہ انھوں نے تو کبھی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مصلّٰی کا تذلل سعادت تک استعمال نہیں کیا تھا بلکہ اہل سُنّت کی معتبر و مستند کتب میں بیٹھنا واضح روایت موجود ہے کہ عمر ابن خطاب کے کچھ حامیوں نے انھیں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مصلّٰیؐ پر کھڑا کرنے کی کوشش کی مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس تجویز کی سختی سے مخالفت کی گویا اہل سنت کے علم الکلام کی رو سے جسے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مصلّٰیؐ پر کھڑا کیا ہو وہ بھی خلافت کا مستحق ہے اور جسے کھڑا ہونے سے روک دیا ہو وہ بھی خلافت کا مستحق ہے

اسے کہتے ہیں چت بھی میرا اور پٹ بھی میرا۔

مصلّٰیؐ پر کھڑا ہونے سے خلافت مل سکتی ہے لیکن "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" کے مصداق کا خلافت پر کوئی حق نہیں ہے اور "بمنزلہ ہارونؑ من موسیٰؑ" کی خلافت کے لیے اہل سنت کو کوئی دلیل ہی دستیاب نہیں ہے۔

بے بسی ہائے تماشہ کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے دلی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

ولایت و امامت علیؑ پر ایک مستند سُنّی عالم کی دستاویزی شہادت

یہاں پر ایک بادشاہ اسمٰعیل شہید دہلوی کی کتاب "منصب امامت" سے ایک اقتباس پیش کرنے کو جی چاہتا ہے اور یہ اس لیے کہ آج کل دیوبندی مسلک اور اہل حدیث فرقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ ہی زیادہ تر خارجیت کا پروپیگنڈہ کر رہے ہیں اور مسلک شیعہ کے رو میں زیادہ تر انہی حضرات کی کتابیں دھڑا دھڑ منظر عام پر آرہی ہیں اور یہی لوگ شاہ اسمٰعیل شہید دہلوی کو اسلام کا "بطل جلیل" اور "مجاہد اعظم" قرار دیتے ہیں۔ بہر حال شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

"امام، رسول کے سعادت مند فرزند کے مانند ہے باقی تمام اکابر امت و بزرگان ملت، ملازموں، خدمت گاروں اور جاں نثاروں کی مانند ہیں پس جس طرح تمام اکابر سلطنت و ارکان مملکت کے لیے شہزادۂ والا قدر کی تعظیم ضروری ہے اور اس سے توسل موجب سعادت ہے اسی طرح اس سے

مقابلہ کرنا شقاوت کی علامت اور اس پہ مفاخرت کا اظہار بدانجامی پر دلالت کرتا ہے ایسا ہی ہر صاحب کمال کے حضور میں تواضع اور تذلل سعادت دارین کا باعث ہے اور اس کے حضور میں اپنے علم و کمال کو کچھ سمجھ بیٹھنا دونوں جہان کی شقاوت ہے اس کے ساتھ یگانگی رکھنا رسول سے یگانگی ہے اور اس سے بیگانگی رسولؐ سے بیگانگی کے مترادف ہے خصوصاً اس وقت جبکہ نیابت پیغمبری اللہ رب العزت کی طرف سے اسے تفویض ہو چکی ہو اس بات کو ذیل کی مثال سے سمجھ لیجیے۔ مثلاً ایک بادشاہ کے مقربوں میں سے کوئی امیر جلیل القدر تمام اہل دربار میں خاص خدمت پر مامور اور ایک بلند منصب پر فائز ہو اس کے ہاں ایک نیک بخت بیٹا ہو جو اپنے باپ کے برابر ہنر و لیاقت رکھتا ہو، بادشاہ اور ارکین دربار اس کو عزت و توقیر کی نگاہ سے بھی دیکھتے ہوں یہاں تک کہ باپ کی نیابت کا منصب بادشاہ نے اسے تفویض کر دیا ہو۔ اب اگر اس کے باپ کے رفقا میں سے کوئی اس کے ساتھ مقابلتاً شرکت اور اس کے مقابلہ میں اپنے منصب پر تفاخر کرے تو یقیناً بادشاہ کی طرف سے اس پر نافرمانی اور بغاوت کا الزام عائد ہو گا اور مستوجب عتاب شاہی ہو گا اسی طرح امام وقت سے سرکشی اور روگردانی گستاخی کا باعث ہے امام کے ساتھ بلکہ خود گویا رسولؐ کے ساتھ ہمسری ہے اور خفیہ طور پر خود رب العزت پر اعتراض ہے کہ ایسے ناقص شخص کو کامل شخص کی نیابت کا منصب عطا ہوا الغرض اس کے توسل کے بغیر تقرب الٰہی محض وہم خیال ہے جو سراسر باطل اور محال ہے۔

بے عنایات حق و خاصان حق
گر ملک باشد سیہ گردد ورق

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ حب علیؑ حسنۃ لاتضر معہا سیئۃ وبغض علی سیئۃ لاتنفع معہا حسنۃ (علیؑ سے محبت ایسی نیکی ہے کہ اس نیکی کے ہوتے ہوئے کوئی برائی نقصان نہیں پہنچا سکتی اور علیؑ ابن ابی طالبؑ سے بغض رکھنا ایسی برائی ہے کہ اس برائی کے ہوتے ہوئے کوئی نیکی فائدہ نہیں پہنچا سکتی) اور فرمایا الا ان مثل اھل بیتی فیکم کمثل سفینۃ نوحؑ من رکبہا نجا ومن تخلف عنہا ھلک (یاد رکھو میرے اہل بیتؑ کی مثال تمہارے درمیان کشتی نوح کی سی ہے کہ جو اس میں سوار ہوا وہ بچ گیا اور جو اس سے پیچھے رہ گیا برباد ہو گیا۔ (صنہ ۱۳۱ تا ۱۳۲)

شاہ اسمٰعیل شہید کی یہ تحریر اس امر کی صراحت کرتی ہے کہ جن اکابر و اعیان نے سیدنا علیؑ برحق کی امامت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ انھوں نے رسولؐ سے بھی بغاوت کی اور خدا پر بھی بداعتمادی کا اظہار کیا کیونکہ وہ لوگ خوب جانتے تھے اور انھیں اچھی طرح علم تھا اور وہ اس حقیقت نفس الامری سے بخوبی آگاہ تھے اور انھیں اس بارے میں مکمل واقفیت تھی کہ پیغمبرؐ کی محبوب ترین شخصیت اس کی مسند امامت کا وارث اور اس کے بعد اس کی ولایت کا اولین مستحق بجز ذات سیدنا علیؑ ابن ابی طالبؑ کے اور کوئی نہیں لیکن یہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے انھوں نے ان حقائق کو نظر انداز کیا حضور کی خواہش و وصیت (ﷺ) کو پامال کیا اور "حق بہ حق دار رسید" پر عمل پیرا ہونے کی بجائے مستحق امارت و ولایت و امامت کا حق غصب کیا اور غاصبوں کی حکومت کو خلافت راشدہ کا نام وہی دے سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عقل سلیم سے بے بہرہ اور فکر صحیح سے محروم رکھا ہو۔ من کنت مولاہ فعلی مولاہ (میں جس کا مولا ہوں علیؑ بھی اس کا مولیٰ ہے)، کی روایت کا آج تک کسی مستند

سنی عالم نے انکار نہیں کیا نہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اور نہ انکے لڑکے شاہ عبدالعزیز نے، نہ ان کے پوتے شاہ اسمٰعیل نے نہ کسی اور محدث وعالم نے دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور جنگ آزادی ہند کے نامور رہنما مولانا حسین احمد مدنی نے تو اس حدیث کو اپنے خطبۂ جمعہ میں جسے انھوں نے خود ترتیب دیا ہے حضرت علیؑ کے باب میں بڑے اہتمام سے درج کیا ہے۔ اب اس حدیث کے مفہوم میں کوئی ایسی گنجلک، اور اس کے معانی میں کوئی ایسا ابہام تو ہے نہیں کہ اس کے لیے تاویل کے گھوڑے دوڑائے جائیں ایک معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ مسلمانوں کی پوری جمعیت کے سامنے اس امر کا اعلان اور وہ بھی ایک ایسے موقعہ پر جب کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجتہ الوداع کے اسی خطبہ میں اپنے دنیا سے رخصت ہونے کا اشارہ بھی کیا ہو ولایت مولائے کائنات کا اعلان کیا مفہوم ومعنی رکھتا ہے لیکن حیرت ہے کہ پچھلے چودہ ۱۴ سو برس سے خود فروش مُلّا۔ اس اعلان واجب الاذعان کو غلط تعبیر وتاویل کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں اور حقیقت پر پردہ ڈالنے کی سعی مذموم میں مصروف ہیں۔

ولے تاویل شاں در حیرت انداخت
خدا و جبرئیل و مصطفٰے را

یہاں پھر ایک بار شاہ اسمٰعیل شہید ہی کی منصب امامت سے بعض ایسی حدیثیں نقل کر رہا ہوں تاکہ اہل سنت مطمئن رہیں کہ ؎
انہی کے مطالب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات ان کی

قرآن مقدس کی مشہور آیت کریمہ "وقفوهم انهم مسئولون" (ان کو ٹھہراؤ کہ ان سے سوال ہوگا) کی تشریح کے ضمن میں شاہ صاحب موصوف

لکھتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"انھم مسئولون عن ولایۃ علیؑ" (ان سے علیؑ ابن ابی طالبؑ کی ولایت کے متعلق سوال کیا جائے گا) ص۱۳۰

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا سے فرمایا: "ان اللہ اطلع اھل الارض فاختار اباک و بعلک (منصب امامت ص۱۳۰)

"اللہ تعالیٰ نے باشندگان زمین کا جائزہ لینے کے بعد تیرے باپؑ اور تیرے شوہر کو منتخب و برگزیدہ قرار دیا ہے۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھنا ہوا پرندہ پیش کیا گیا تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا فرمائی کہ "اللھم ائتنی باحب خلقک الیک یاکل معی ھذا الطیر فجاءہ علیؑ فاکل معہ" (ایضاً ص۶۱)

"خداوندا اپنی مخلوق میں جو شخص تجھے سب سے زیادہ محبوب ہے اسے بھیج کر میرے ساتھ شریک ہو کر وہ اس پرندے کا گوشت کھائے اتنے میں علیؑ ابن ابی طالبؑ تشریف لائے اور وہ اس کھانے میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے۔"

منصب امامت ہی سے ایک اور حدیث ان اللہ تبارک وتعالیٰ امرنی بحب الاربعۃ واخبرنی انہ یحبھم قیل یا رسول اللہ! سمھم لنا قال علیؑ منھم، یقول ذلک ثلاثا وابوذر ومقداد وسلمان امرنی بحبھم واخبرنی انہ یحبھم (ایضاً ص۶۹)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے چار آدمیوں سے محبت کا حکم دیا ہے اور مجھے بتایا ہے کہ اللہ بھی ان سے محبت کرتا ہے۔ عرض کیا گیا یارسول اللہ! ان چار آدمیوں کے نام بتائیں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

ان میں سے ایک تو علیؑ ابن ابی طالبؑ ہیں: اس فقرہ کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین مرتبہ دہرایا پھر فرمایا دوسرے تین ابوذر غفاریؓ ہیں مقدادؓ بن الاسود ہیں اور سلمانؓ فارسی ہیں۔ ان... چار سے محبت رکھنے کی حق تعالیٰ نے ہدایت فرمائی ہے اور مجھے اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا ہے کہ وہ بھی ان چاروں کو محبوب رکھتا ہے "

خدا اور اس کے رسولؐ کی محبوب ترین شخصیت کے ساتھ جو سلوک صحابہ نے کیا وہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے اور اس سلوک کو دیکھتے ہوئے کوئی غیرت مند مسلمان جس کے دل کے کسی گوشہ میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کی کوئی چنگاری باقی ہے ان اصحابہ کے بارے میں کوئی خوش گمانی نہیں رکھ سکتا۔ حضرت ابوذرؓ غفاری بھی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبوب شخصیت تھے اور خدا کے محبوب بھی تھے ان کے ساتھ جو بد سلوکی تیسرے خلیفہ نے کی اور انھیں جس طرح جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا وہ بھی ہماری تاریخ ملّی کا شاہکار ہے حالانکہ ابوذرؓ غفاری حضور نبی اکرم صلی اللہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اس دھرتی پر اور "اس آسمان کے نیچے دنیا کے سب سے زیادہ راست باز انسان تھے رضی اللہ تعالےٰ عنہ ورضاہ

جس نکتہ پر میں سب سے زیادہ زور دے رہا ہوں وہ یہ ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد جو لوگ مسند آرائے خلافت ہوئے ان کے دلوں میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کا عنصر مفقود تھا انھوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کے وصال کے بعد وہی سلوک کیا جو ایک بے رحم سیاست داں دوسرے پیش رو سیاست داں سے کرتا ہے عظمت پیغمبری کا کوئی نقش ان کے دل پر مرتسم نہیں تھا ورنہ یہ ممکن

نہ تھا کہ وہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعزا واقارب کے ساتھ وہ معاملہ کرتے جو انھوں نے روا رکھا اس سلسلے میں مجھے عمر ابن خطاب کا وہ فقرہ یاد آتا ہے جو انھوں نے ایک گفتگو کے درمیان حضرت عبداللہ عباسؓ سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کے بارے میں کہا تھا انھوں نے اس حسد و رقابت کو جس کا نشانہ خاندان نبوت بنا تھا خود اسی خاندان نبوت پر چسپاں کرنے کی ناروا جسارت کرتے ہوئے حضورؐ کے عم زاد سے کہا۔

هيهات ابت والله قلوبكم يا بني هاشم الاحسد ايا تحول انتغنا وغشاها يزول (طبری وابن اثیر والاعمر والاول)

"ہائے کتنے افسوس کی بات ہے کہ اے بنی ہاشم تمہارے دلوں سے حسد، کینہ اور کھوٹ دور نہ ہو سکا۔

اس پر حضرت عبداللہؓ ابن عباسؓ نے جواباً فرمایا۔

مهلا یا امیر المومنین لا تصف قلوب قوم اذهب الله عنهم الرجس، طهرهم تطهیرا بالحسد والغش فان قلب رسول الله من قلوب بنی هاشم۔

"عرب کے ایک کندۂ ناتراش اَن پڑھ بدو اور چرواہے کا بیٹا جو محمد عربیؐ وہاشمی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جوتیوں کے صدقے میں خلافت کے منصب بلند پر فائز ہے کس ڈھٹائی، دیدہ دلیری گستاخی اور احسان فراموشی کے ساتھ خاندان نبوت کو مطعون کر رہا ہے وہ خانوادۂ بنی ہاشم جو اس شخص کی چیرہ دستیوں کا زخم خوردہ ہے وہ اس کے ساتھ کی گئی پے در پے ناانصافیوں پر شرمندہ ہونے کی بجائے اسی پر الزام عائد کر رہا ہے کہ اس کے دل میں بغض و حسد کے پنہاں سوتے ہیں اسے کہتے ہیں " زبردست کا ٹھینگا سر پہ اور اسی

سنگ دلی اور قساوت و شقاوت کا نام ہے "زبردست مارے اور رونے نہ دے" اور یہی وہ بد لحاظ شخص ہے جس کے بارے میں ہمارے قصیدہ گو مورخین کہتے ہیں کہ "خلافت علی منہاج النبوت" کی بنیادیں اسی نے مضبوط کیں خاندان نبوت کو سب سے زیادہ آزار پہنچانے والا شخص "منہاج نبوت" کا محافظ یعنی بلی دودھ کی رکھوالی۔ بنو ہاشم سے ان حضرات کے بغض و کینہ کا یہ عالم تھا کہ مرتے وقت جن چھ آدمیوں کو خلافت کے لیے موزوں قرار دیا ان پر اس اندیشہ سے کہ کہیں سیدنا علیؑ منتخب نہ ہو جائیں یہ قدغن لگادی کہ جس طرف عبدالرحمن بن عوف ہوں گے۔ اسی کو ان کا جانشین مقرر کیا جائے گا اور ظاہر ہے عبدالرحمن بن عوف اپنے قریبی رشتے دار سے روگردانی کیوں کرنے لگے تھے لیکن اس پر بھی بے اعتمادی کا یہ عالم کہ ویٹو پاور (VITTO POWER) اپنے بیٹے عبداللہ بن عمر کے سپرد کی کہ اگر ووٹ برابر برابر ہو جائیں تو جس طرف عبداللہ ابن عمر کا ووٹ ہوگا وہی مستحق خلافت ہوگا یہ تھا ان کا منہاج نبوت

ہونٹ پر لا الہ الا اللہ
اور سینے میں زہر کژدم و مار
ے ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

صحابہ سے ہمدردی کا مروڑ کیوں اٹھ رہا ہے؟

میں نے اس موضوع پر کافی کچھ سوچ بچار کیا ہے کہ اسلام کے اس دور انحطاط میں صحابہ سے ہمدردی کا مروڑ لوگوں کے پیٹ میں کیوں اٹھ رہا ہے حتیٰ کہ صحابہ سے ہمدردی کی یہ تحریک خارجیت کی حدود میں داخل ہو چکی ہے اور لوگ صحابہ کے مقابلہ میں اہل بیت نبوتؐ کو ثانوی درجہ (DEGRADE) کیوں دے رہے ہیں۔

خود میں نے تاریخ اسلامی کے ایک غیر جانب دار طالب علم کی تاریخ کے مختلف و متنازعہ فیہ ابواب پر نظر ڈالی ہے اور اس سارے مطالعہ کے دوران میرا مقصد خود اپنے ذہن کو مطمئن کرنا تھا یعنی محض احقاق حق اور ابطال باطل کا نظریہ کارفرما تھا میں نے تاریخی واقعات سے اپنے دل و دماغ کو مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی اور اس بات کو پوری طرح ملحوظ رکھا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات اقدس سے شرف صحابیت کی نسبت رکھنے والے کسی شخص

کی توہین کم از کم میرے قلم سے سرزد نہ ہو میرا یہ جذبہ سراسر اخلاص و دیانت پر مبنی تھا مگر جب اس حزم و احتیاط کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ کرنے کے باوجود بعض ایسے کردار نظر کے سامنے آئے جس قسم کے ناپسندیدہ کردار ہمارے تباہ حال معاشرہ کے سیاسی اور مذہبی حلقوں میں عام ملتے ہیں تو میری اس عقیدت کو سخت دھچکا لگا۔

وہ تاریخی واقعات جنھوں نے مجھے متزلزل کیا اور میرے عقائد کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا مجھے اس اعتراف میں کوئی باک نہیں کہ اس کا سبب ایک مخصوص ذہنی پس منظر ہے اور وہ ہے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس و اطہر کے ساتھ بے پایاں محبت، مجھ ایسے گنہ گار اور فرومایہ انسان کے لیے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کا سرمایہ ہمیشہ حرز دل و جان بنتا رہا، بدعمل اور روسیاہ ہونے کے باوجود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ماثورہ دعائیں ہمیشہ میرا ورد بنی رہیں اور زندگی کی اس طویل مسافت میں جب کبھی مصائب و مشکلات سے دوچار ہوا تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعاؤں کی بروقت دستگیری نے دل و دماغ میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر یقین اور آپؐ سے محبت اس طرح پیوست کر دی کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ کے نام نامی اور اسم گرامی کے تذکرہ سے طبیعت میں اہتزاز کی اور رقت و گداز سے دل کی دنیا میں ارتعاش کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات والا تبار کے ساتھ بے پایاں اور غیر مشروط محبت ہی کی یہ تاثیر تھی کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت قرابت رکھنے والے بھی اس طرح محبت کا مرکز بنتے چلے گئے۔ بلاشبہ صحابہ کو بھی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت ہے اور اہل بیتؑ کو

بھی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت ہے لیکن ان نسبتوں میں واضح فرق ہے ایک نسبت نظریاتی ہے اور بس، دوسری نسبت نظریاتی بھی اور طبعی وجبلّی بھی۔ ظاہر ہے کہ اہل بیت کی نسبت دوہری ہے۔ سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کا عمر بھر کا طرزِ عمل، ان کی زندگی کا انداز، ان کا زہد، ان کے فقر وغنا کی سرگزشت، ان کے صبر ورضا کی کیفیت، ان کے تقویٰ وطہارت کی نوعیت بتاتی ہے کہ وہ نظریاتی طور پر اپنے والد گرامی کے مشن سے تعلق رکھتی تھیں بلکہ والد کے افکار ونظریات ان کے دل ودماغ میں رچ بس گئے تھے اور انھوں نے اپنی زندگی کو اس سانچے میں پوری طرح ڈھال لیا تھا جو ان کے والدِ مقدس نے تیار کیا تھا اس حسن باطنی اور جمال معنوی کے ساتھ ساتھ سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کو ایک اور بے بہا اعزاز اور بیش قیمت شرف بھی حاصل ہے کہ وہ لختِ جگر پیغمبر ہیں اور نسبت قرابت کی بنا پر ان کا مرتبہ ان صحابہ سے یقیناً افضل ہے جو محض ایک نسبت رکھتے خون کا رشتہ ہر رشتے سے مقدم ہے جب کہ اس خون میں خوشبوئے وفا بھی ہو، سیدنا علی ابن ابی طالبؑ اپنے سارے محاسن وکمالات علمی وعملی کے ساتھ ساتھ پروردۂ آغوشِ نبوت بھی ہیں۔ دامادِ رسولؐ بھی حضرت ابو طالبؑ جیسے مشفق وشفیق چچا کے فرزند بھی ہیں اور جاں نثاری ووفاداری کے پیکر بھی اس دوہری نسبت میں ان کا کوئی شریک وہمسر نہیں ہے۔ سیدنا علیؑ اور سیدہ فاطمہؑ کے سنجوگ سے جو اولاد پیدا ہوئی ان سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت بھی ایک فطری تقاضا تھا اور اس باب میں متعدد روایات ہم قبل ازیں پیش کرچکے ہیں۔

اب یہ بالکل بدیہی اور منطقی اور فطری بات ہے کہ میرا کوئی قریبی دوست جس کا مجھ سے تعلق یک جان دو قالب کا ہو۔ اگر میرے لڑکے یا لڑکی

کا حق غصب کرلے اس پر ناروا سختی کرے اسے اس کے جائز ورثہ یا ملکیت سے محروم کرنے کی کوشش کرے تو میرا ردعمل اس باب میں کیا ہوگا ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اس صورت حال پر غور کرے تو اس کا ردعمل یہی ہوگا کہ وہ ایسے دوست سے بات تک کرنے کا روادار نہ ہوگا اور اس سے قطع تعلق کرلے گا تو کیا پیغمبرؐ کی بیٹی اور اس کی اولاد کی وہ اہمیت بھی نہیں ہے جو خود ہماری اولاد کی ہماری نظر میں ہے۔ کیا پیغمبر کے قرابت داروں کی ہماری نظر میں وہ اوقات بھی نہیں ہے جو ہماری نگاہ میں خود ہمارے قرابت داروں کی ہے۔ کیا پیغمبرؐ کی محبوب شخصیتیں ہماری محبوب شخصیتوں کے مرتبہ سے بھی فروتر ہیں کہ ان کے ساتھ بدسلوکی پر ہماری غیرت وحمیت جوش نہیں کھاتی اور ہمارا خون اس بدمعاملگی پر کھولتا نہیں ہے۔

بنتِ پیغمبرؐ سے بدسلوکی

سُنّی اور شیعہ دونوں کی کتابیں اس امر پر متفق ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد سیدہ فاطمہؑ کی ذات اقدس کے ساتھ بدسلوکی کی گئی اہل سنت کے مستند مورخ شبلی نعمانی کی "الفاروق" ہی اٹھا کر دیکھ لی جائے کیا خلیفۂ دوم نے سیدہ فاطمہؑ اور ان کے شوہر گرامی کے ساتھ بدسلوکی نہیں کی اور خلیفۂ اول نے اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا اور جس کسی نے اس دھاندلی کے خلاف آواز اٹھائی اسے بھی تختۂ مشق ستم نہیں بنایا گیا؟

کیا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لختِ جگر کو ان کے حقِ ملکیت سے محروم کر دینا اور ان کے مطالبہ کے باوجود انھیں ان کا جائز حق نہ دینا کوئی برائی نہیں ہے؟ کیا یہ عشقِ رسولؐ کا مظاہرہ تھا کہ دھمکی دی گئی کہ سیدہ فاطمہؑ کے مکان کو نذرِ آتش کر دیا جائے گا۔ خدارا انصاف کیجئے کہ آیا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس صورتِ حال کو پسند فرماتے۔

کیا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعزہ واقارب عربی محاورہ

کے مطابق ۔ لحم علی وضم ۔ چٹان پر گوشت کا لوتھڑا جسے جو چاہے اچک لے، کی طرح تھے کیا محمدؐ عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محض ایک سیاسی لیڈر تھے کہ ادھر ان کی آنکھیں بند ہوئیں اور ادھر دوسرے طالع آزما سیاسی لیڈروں نے ان کی مسند پر قبضہ کر لیا اور یکایک عامۃ الناس کی وفاداریاں تبدیل ہو گئیں ۔ بلاشبہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک زبردست سیاسی رہنما بھی تھے مگر ان کی اصل حیثیت ایک ایسے عظیم الشان اور جلیل القدر پیغمبر کی تھی جو سلسلۂ نبوت و رسالت کی آخری کڑی تھی جس کی نبوت و رسالت ابدی اور عالمی تھی اور جس پر صرف ایمان لانا ہی نہیں بلکہ اپنی جان، اولاد، مال اور اعزا و اقارب سے اور دنیا کے تمام انسانوں سے زیادہ محبوب و دل نشین رکھنا بھی لازمۂ ایمان ہے وہ صرف دین و شریعت ہی کا مرکزی نقطہ نہیں ہے بلکہ محبتوں اور وفاداریوں کا مرکز و محور بھی ہے اس کی اتباع بھی ضروری ہے اور اسے دل کی دھڑکنوں میں بسا کر اس کی محبت میں سرشاری بھی عین تقاضائے ایمان ہے یہاں مجھے ایک شعر یاد آگیا۔

اسی کی ذات ہے ایمان و دین کا مقصود
اسی کے عشق میں زندہ ہے رسم جاں طلبی

اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اسی شان محبوبیت ہی کا یہ ادنیٰ اور اولین تقاضا ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبوب شخصیتوں سے بھی محبت کا لازوال عہد و پیماں استوار کیا جائے ام المومنین عائشہ فرماتی ہیں:

" عورتوں میں سب سے زیادہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کو محبت اپنی بیٹی فاطمہؑ سے تھی اور مردوں میں ان کے شوہر علیؑ ابن ابی طالبؑ سے۔ (ترمذی)

مشہور صحابی انس بن مالک کہتے ہیں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

عنوان صحیفۃ المومن حب علیؑ بن ابی طالبؑ

(تاریخ بغداد۔ طیب ج ۴ ص ۴۱۰)

"مومن کے نامۂ اعمال کا سر مطلع عنوان علیؑ ابن ابی طالبؑ کی محبت ہے"

سیدہ فاطمہؑ۔ سیدنا علیؑ اور ان کے دونوں فرزند حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبوب ترین شخصیتیں ہیں اور اس پر امت کا اتفاق ہے۔

درودِ ابراہیمیؑ

بنا بریں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ محبت جب تک حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیتؑ کی محبت کے ساتھ مربوط نہیں ہو گی ایمان کبھی شرمندۂ تکمیل نہیں ہو سکتا اسی لیے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درودِ پاک کے جو الفاظ ماثور ہیں ان میں حضور نبی اکرمؐ کی ذات کے ساتھ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آل اطہار کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اہل سنت کے ہاں بھی سب سے افضل درود وہ ہے جسے درودِ ابراہیمیؑ کہا جاتا ہے اور جو ان کے ہاں تمام نمازوں میں قعدہ ہائے اخیرہ میں مروج ہے یعنی اللھم صل علی محمدؐ وعلیٰ آل محمدؐ کما صلیت علی ابراھیم وعلیٰ آل ابراھیم انک حمید مجید۔ محمدؐ وآل محمدؐ پر صلوٰۃ وسلام بھیجنے کی ہدایت خود اس امر کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آل کے ساتھ بھی دلی وابستگی کا اظہار ہو۔

درود ابراہیمی کے تذکرہ سے ذہن میں ایک اور نکتہ بھی ابھرا کہ حضور نبی اکرمؐ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اور اپنی آلؑ کے لیے اس قسم کی رحمت وبرکت کی درخواست فرمائی ہے جیسی رحمت وبرکت حضرت ابراہیمؑ اور ان کی آل پر نازل کی گئی۔ آل ابراہیمؑ کے بارے میں تو قرآن پاک نے صراحتاً بتایا ہے کہ واتینا آل ابراھیم الکتاب والحکمۃ واتیناھم ملکا عظیما۔ لیکن جب آل محمدؐ کی نوبت آئی تو انھیں اس درود ابراہیمی کے پڑھنے والوں نے ان کے جائز حقوق سے بھی محروم کردیا اور اب بعض گستاخ، بے ادب، بد لحاظ اور مروت سے تہی مایہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ "آل" سے مراد اہل بیت نبوت نہیں ہیں بلکہ ہر مسلمان آل محمدؐ ہے اور اس مقصد کے لیے انھوں نے دوسری بہت سی موضوع حدیثوں کی طرح یہ حدیث بھی گھڑی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔ کل تقی ونقی فھو آلی ہر پرہیزگار اور پاک صاف شخص میری آل ہے۔

حالانکہ امت کا اس عقیدہ پر اجماع ہے کہ آل محمدؐ سے مراد وہ افراد بنوہاشم ہیں جن پر صدقہ حرام ہے۔ انما آل محمد لا تحل لہ الصدقۃ (بلاشبہ آل محمدؐ کے لیے صدقہ کی کوئی چیز حلال نہیں ہے) اس تعریف کی رو سے ازواج پیغمبرؐ بھی زمرۂ آل میں شمار نہیں ہوتیں جیسا کہ حضرت زید ابن ارقم کی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

یہاں اس امر کا اظہار بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ تمام امت محمدیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام انبیاءؑ سے افضل ہیں انبیاءؑ کی اس فہرست میں حضرت ابراہیم بھی شامل ہیں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضیلت کا کلی تقاضا تو یہ تھا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آل کو ابراہیمؑ سے بھی زیادہ قدر و منزلت اور تکریم و احترام کا مستحق قرار دیا جاتا لیکن حضور

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض نام نہاد صحابہ نے اوران صحابہ کے اندھے مقلدوں نے آل محمد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوان کی قرار واقعی عظمت (Due Respect) سے بھی محروم کرنے کی کوشش کی اور یہ سب کچھ عظمت صحابہ کے نام پر کیا جارہا ہے۔

صحابہ بلاشبہ عظیم ہیں مگراہل بیتؑ کی قیمت پر نہیں کہ اہل بیتؑ کی عظمت کو مجروح کر کے ان کی عظمت کا محل استوار کیا جائے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وفاداری کے لیے آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت نبوتؑ سے وفاداری ایک بدیہی امر ہے اور آج جو لوگ اس کے برعکس سوچتے ہیں۔ ان کے دل محبت رسولؐ سے یکسر خالی ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وفادار صحابی صرف وہ ہے جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی محبت کا دم بھرے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت سے بھی اس کی عقیدت ومحبت غیر متزلزل ہو۔

یہی وہ نکتہ تھا جسے سیدنا عمار بن یاسرؓ نے سمجھا اور اس پر صحابہ کی جماعت کو متوجہ کیا انھوں نے فرمایا تھا

ایھا الناس ان اللہ عزوجل اکرمنا بنبیہ واعزنا بدینہ فانی تصرفون ھذا الامر عن اھل بیت نبیکم (لوگو! جس پیغمبر کے ذریعے ہمیں عزت وسرفرازی ملی اور جس دین برحق نے شرف وامتیاز بخشا اسی کے اہل بیت کو نظم حکومت سے کب تک دور دور رکھے رہو گے (طبری ج ۳ ص ۲۶۴)

صحابہ کی جماعت اس نکتہ سے بے خبر نہیں تھی مگر انکے سرغنوں کو اس میں اپنی موت نظر آتی تھی کہ پیغمبرؐ کے بعد اسکے اہل بیت پیغمبرؐ کی مسند پر متمکن ہوں اور یوں ان کی چودہراہٹ معرض خطر میں پڑ جائے۔

مُجرمانہ ذہنیت کے لوگ

جو لوگ عظمت اہل بیتؑ کی بجائے عظمت صحابہ کا راگ الاپتے ہیں وہ دراصل مجرمانہ ذہنیت کے حامل لوگ ہیں اور اپنے مجرم ضمیر کے لیے عظمت صحابہ کی پناہ گاہ تلاش کرتے ہیں یہ لوگ اپنے جرائم کو سند جواز بخشنے کے لیے صحابہ کی آڑ لیتے ہیں اور اس طرح لوگوں کی نظروں میں اپنے کردار بد کے لیے "سلف صالحین" کے کردار کو بطور ثبوت پیش کرتے ہیں۔

ایسے صحابہ بھی ہیں جنھوں نے اپنی مطلب برآری کے لیے حدیثیں وضع کرنے کا دھندا اختیار کیا صحابہ کے ان نام لیواؤں نے بھی وضعی حدیثوں کے انبار لگا دیے۔

ایسے صحابہ بھی ہیں جنھوں نے زنا کا ارتکاب کیا اور قانون شہادت میں ایک خامی کا سہارا لے کر سزا سے صاف بچ گئے صحابہ کی عظمت کے ان ڈھنڈورچیوں میں بھی ایسے بے شمار لوگ ہیں جو حجروں میں مجرے کراتے ہیں۔ ایسے صحابی بھی ہیں جو علۃ المشائخ کے مریض تھے جیسا کہ حکم بن العاصؓ کے بارے میں مشہور رہے ان صحابہ کے پیروکاروں کی اکثریت علۃ المشائخ میں مبتلا ہے۔

ایسے صحابی بھی ہیں جنھوں نے محض سیاسی جوڑ کی غرض سے اپنے باپ کی ناجائز اولاد کو اپنا جائز بھائی قرار دے دیا آج بھی ان صحابہ کے گن گانے والوں میں بہت سے لوگ ہیں جنھوں نے اپنے نسب میں تبدیلی کرلی تحفظ حقوق اہل سنّت کے عبدالمجید ندیم ڈیرہ غازی خاں کھٹیک برادری سے تعلق رکھتے ہیں مگر پچھلے چند سال سے اپنے نام کے ساتھ بڑے دھڑلے سے سیّد لکھ رہے ہیں اور یہ تو محض ایک نام ہے اس حمام میں بیشمار ننگے نظر آئیں گے ؎

ایسے صحابی بھی ہیں جنھوں نے محمد عربی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیرو کار ہونے کے باوجود سرمایہ دارانہ ٹھاٹھ جمائے حالانکہ اسوۂ رسولؐ کے سراسر منافی ان کا طرز عمل تھا اور آج سرمایہ داروں کے ایجنٹ حضور نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کو چھوڑ کر صحابی کی سرمایہ داری کو بطور استدلال پیش کرتے ہیں ایسے صحابی بھی ہیں جنھوں نے سیاست میں مول تول کا طریق اپنایا اور اس قماش کے لوگ آج محض اپنے اس طرز عمل کو صحیح ثابت کرنے کے لیے صحابہ کا نام جپتے ہیں۔

ایسے صحابہ بھی ہیں جو دوسروں کے "عمل صالح" کا کریڈیٹ خود لیتے رہے ہیں اور اس کی گواہی قرآن نے دی یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا

؎ شاہی مسجد لاہور کے موجودہ خطیب مولوی عبدالقادر آزاد کو بچپن سے جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ "پھرائیں" گوت سے تعلق رکھتے ہیں جو گانے بجانے کا دھندہ کرتے ہیں لیکن اب یہ صاحب دھڑلے کے ساتھ خود کو سیّد کہلواتے ہیں اور ریڈیو پاکستان سے ان کے نام کے ساتھ سیّد کا سابقہ

چاہتے یہ رہے کہ جو کام انھوں نے سرانجام نہیں دیا اس کی تعریف بھی ان کے کھاتے میں ڈال دی جائے، صحابہ کے ماننے والوں میں اس قسم کے لوگوں کا جم غفیر ہے جس نے یہی وطیرہ اپنا رکھا ہے۔

غرضیکہ ہر بدکردار شخص اپنی بدکرداریوں پر پردہ ڈالنے کے لیے صحابہ کی عظمت کا ڈنکا بجاتا ہے کیونکہ ہر صحابی باستثنائے چند کسی نہ کسی گھناؤنے الزام میں ملوث ہے۔

اور مثل مشہور ہے مرگ انبوہ جشنے دارد۔

اگر کبھی اسلام کے نظام زندگی کی بات کی جائے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طرز عمل کو بطور نمونہ پیش کیا جائے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سرمایہ دارانہ طرز حیات کو ناپسند فرمایا ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارتکاز دولت اور اکتناز دولت (CONCENTRATION OF MONEY) کی ممانعت فرمائی ہے اور ضرورت سے زائد دولت کو ضرورت مندوں پر خرچ کرنے کی ہدایت فرمائی ہے اور خود عمر بھر نہ پیسہ جمع کیا نہ سرمایہ دارانہ طور طریق اپنایا بلکہ سادگی اور کفایت شعاری کو اپنایا تو صحابہ کے یہ نام نہاد نام لیوا کبھی عبدالرحمٰن بن عوف کے کروڑ پتی ہونے کا ذکر کرتے ہیں کبھی عثمان بن عفان کے بہت بڑے سرمایہ دار ہونے کا حوالہ دیتے ہیں کبھی کسی صحابی کی عیاشیوں اور اللوں تللوں کو بطور ثبوت پیش کرتے ہیں اور اس طرح حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشن اور آپ کے مقصد بعثت کو سبوتاژ کرنے کی سعی ناپاک کرتے ہیں حالانکہ دین میں حجت اور سند محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی ہے اور انہی کا عمل اسوۂ حسنہ اور نمونہ ہے کسی دوسرے کا خواہ وہ صحابی ہو یا کوئی اور دین کے باب میں کوئی عمل

محبت نہیں بن سکتا لیکن ان بد نہاد لوگوں نے عظمت صحابہ اور فضیلت صحابہ کے خود ساختہ تصور کے تحت صحابہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابل لا کھڑا کیا ہے اور انھیں محض اس بنا پر معیار حق کہنا شروع کیا ہے تاکہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معیارِ حق ہونا مشکوک ٹھہرے اور بحیثیت پیغمبر آخرالزماں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت مجروح قرار دے دی جائے تاکہ ہر شخص من مانی کر سکے۔ چونکہ اہل بیت نبوت " صحابہ کے ان نام لیواؤں کی راہ میں اور ان کی مذموم خواہشات کی تکمیل میں سنگ گراں ہیں اس لیے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ساتھ ان کے اہل بیتؑ کی عظمت کو بھی بطور خاص نشانہ بنایا جا رہا ہے کیونکہ اہل بیتؑ کا ہمیشہ یہ سلوک رہا ہے کہ . حلال محمد حلال الی یوم القیامۃ و حرام محمد حرام الی یوم القیامہ "

(محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حلال کی ہوئی چیزیں قیامت تک حلال رہیں گی اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حرام کی ہوئی چیزیں قیامت تک حرام رہیں گی۔)

صحابہ کے ایک ایک فرد کو مقتدا اور پیشوا بنانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ اپنی غلط کاریوں پر پردہ ڈالا جائے اپنی اسلام دشمنی کو صحابیت کے خوش نما لبادے میں چھپایا جائے اور اسلام میں اباحیت و الحاد کا دروازہ کھولا جائے۔

بریلوی مکتب کی مشہور درس گاہ حزب الاحناف لاہور کے مہتمم مولوی محمود احمد رضوی نے " الصحابۃ کلھم عدول (تمام صحابہ صفت عدل سے متصف ہیں) کے سنی عقیدہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے " عدالت سے مراد وہی وصف

عدالت مراد ہے جو روایت حدیث میں معتبر ہے یعنی عدالت اس کیفیت راسخہ در نفس کا نام ہے جو ملازمت تقویٰ واستعمال مروۃ پر آدمی کو آمادہ رکھے اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ صحابیٔ رسولؐ عادل ہیں۔"

(مکالمہ رضوی گوجروی ص۹ مطبوعہ مکتبہ رضوان گنج بخش روڈ لاہور)

ملازمت تقویٰ اور استعمال مروت کا نام اگر عدل ہے تو ان دونوں صفات سے یکسر محروم طبقہ اگر کوئی ہے تو رضوی صاحب کا یہی ممدوح طبقہ ہے جو لوگ پیغمبرؐ کی اولاد کے ساتھ مروت نہ کر سکے اور جن لوگوں نے خوف خدا سے بیگانہ وار ہو کر اہل حق کو ان کے حق سے محروم کر دیا وہ کیسے متقی اور کتنے بامروت ہوں گے۔ کیا پیغمبرؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عدالت صحابہ کا یہ سرٹیفیکٹ جاری کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔ کتب حدیث میں اس مضمون کی متعدد حدیثیں منقول ہیں کہ صحابہ کی ایک کثیر جماعت کو جہنّم کا ایندھن بنایا جائے گا۔ بخاری میں جسے اہل سنت اللہ کی کتاب کے بعد سب سے صحیح کتاب قرار دیتے ہیں اس کی چند روایتیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ یرد علی یوم القیامۃ رھط من اصحابی فیحلون علی الحوض فاقول یارب اصحابی فیقال لاعلم لک بما احدثوا بعدک انھم ارتدوا فاقول سحقا سحقا لمن غیر بعدی۔

(بخاری کتاب الرقاق)

"قیامت کے روز میرے صحابہ کا ایک گروہ مجھ تک پہنچے گا تو انھیں حوضِ کوثر سے دور ہٹا دیا جائے گا میں عرض کروں گا۔ خدایا یہ میرے صحابی ہیں تب مجھ سے کہا جائے گا کہ آپؐ کو علم نہیں ہے کہ انھوں نے آپؐ کے بعد کیا گل کھلائے ہیں، یہ مرتد ہو گئے تھے چنانچہ میں کہوں گا تباہی اور بربادی ہو ان لوگوں کے لیے جنھوں نے میرے بعد اپنی روش تبدیل کر لی۔

۲۔ یجاء برجال من امتی فیوخذ بہم ذات الشمال فاقول یارب اصحابی فیقال انک لاتدری ما احدثوا بعدک فاقول کما قال العبد الصالح وکنت علیہم شہیدا مادمت فیہم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیہم۔ (بخاری ص۶۶۵)

میری امت کے بہت سے لوگوں کو لایا جائے گا اور انھیں بائیں جانب یعنی جہنم کی سمت دھکیل دیا جائے گا میں کہوں گا خدایا یہ تو میرے بہت قریبی صحابی ہیں۔ جواب میں مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ نہیں جانتے کہ انھوں نے آپ کے بعد کیا کرتوت کئے ہیں۔ یہ سن کر میں وہی بات کہوں گا جو خدا کے ایک نیک بندے (حضرت عیسیٰؑ) نے کہی تھی کہ "میں جب تک ان کے درمیان رہا ان کا نگراں رہا جب تو نے مجھے دنیا سے اٹھالیا تو پھر تو ہی ان کا نگہبان تھا۔

۳۔ انا فرطکم علی الحوض لیرفعن الی رجال منکم حتی اذا اھویت لاناولہم اختلجوا دونی فاقول اے رب اصحابی فیقول لاتدری ما احدثوا بعدک۔

"میں حوض کوثر پر تمہارا انتظار کر رہا ہوں گا کہ تم میں سے کچھ لوگ میرے سامنے لائے جائیں گے میں جب انھیں پاس لانا چاہوں گا تو انھیں مجھ سے دور دھکیل دیا جائے گا۔ یہ دیکھ کر میں کہوں گا اے پروردگار یہ تو میرے صحابی ہیں حق تعالیٰ فرمائے گا تم نہیں جانتے کہ انھوں نے تمہارے بعد کیا حرکتیں کی ہیں۔

اس مضمون کی اگرچہ اور بہت سی دوسری حدیثیں بھی ہیں جو صحاح ستہ میں مذکور ہیں مگر ہم نے صرف ان تین روایتوں پر اکتفا کیا ہے ان سے اندازہ

کرلیں کہ عدالت صحابہ کا جو ڈھنڈورہ پیٹا جارہا ہے اس کی حقیقت کیا ہے. پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک صحابہ کی وہ حیثیت ہرگز نہیں جو مسلمانوں نے اپنے ذہنوں میں اُن کے لیے وضع کر رکھی ہے. یہ سراسر خود ساختہ اور فرضی عظمت کا ایک ڈھونگ ہے جسے ناپاک مقاصد کے لیے رچایا گیا ہے.

یہاں اس حقیقت کو بھی ذہن نشین رکھیئے کہ صحابی کا جو مفہوم آج اصطلاحی طور پر مسلمانوں میں رائج ہے وہ بہت بعد کی ایجاد بندہ ہے. حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک اس کے لغوی معنی مراد ہیں اور صحابی جو صاحب کی بگڑی ہوئی شکل ہے ایسے دوست کو کہتے ہیں جو شب و روز کا ساتھی ہو اور بخاری کی روایتوں میں بعض جگہ "اصیحابی" آیا ہے جس کے معنی بہت عزیز اور پیارے صحابہ کے ہیں جب ایسے بہت عزیز صحابی بھی جہنم کا ایندھن بن جائیں گے تو عام صحابہ کی تو حقیقت ہی کیا ہے اور اصطلاحی صحابہ کی وہاں کیا اوقات ہے لیکن صدیوں سے صحابہ کا کابوس لوگوں کے سینوں پر سوار ہے اور وہ انھیں ملائکہ اور انبیا کی طرح معصوم بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں.

سو آج کل اور اس سے پہلے کے ادوار میں بھی جن لوگوں نے فضیلت صحابہ کا خود ساختہ اور فرضی تصوّر پیش کیا ہے اسلام میں اس کی کوئی حقیقت وحیثیت نہیں ہے اور یہ ان لوگوں کی ذہنی اختراع ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کو اپنے ناپاک مقاصد کے لیے تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور اسلام میں چور دروازے پیدا کر کے اسلام کو موم کی ناک بنا دینا چاہتے ہیں کہ اسے جدھر چاہا موڑ لیا.

صحابی پیغمبرؐ سے بھی افضل ہیں

اہلِ سنّت کا عقیدہ

چنانچہ صحابہ کے مقابلہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغمبرانہ حیثیت کو مجروح اور کم تر کرنے کی شعوری کوششیں قرنِ اول ہی میں شروع ہو چکی تھیں ہم یہاں بخاری اور مسلم کی ایک روایت پیش کرتے ہیں ہمارے نیک نام، راوی ابو ہریرہ کہتے ہیں

صلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صلوٰۃ فقال ان الشیطان عرض لی فشد علی لیقطع الصلوٰۃ علی فامکننی اللہ منہ فذعتہ

(بخاری ج ا کتاب الصلوٰۃ مسلم ج ا ص ۲۰۴)

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھی اور فرمایا شیطان میرے آڑے آگیا تھا اور اس نے میری نماز توڑنے کی بڑی کوشش کی لیکن اللہ تعالٰے نے مجھے اس پر قابو دے دیا اور میں نے اسے پرے دھکیل دیا۔

اب بخاری ہی کی ایک اور روایت سنیئے جس میں یہ دون کی لی گئی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس قریش کی کچھ عورتیں بیٹھی بلند آواز سے باتیں کر رہی تھیں کہ اتنے میں عمر ابن خطاب آ گئے وہ عورتیں بھاگ کر پردہ کے پیچھے چلی گئیں اس پر حضور ہنس پڑے عمر ابن خطاب نے کہا یا رسول اللہ! اللہ آپ کو خوش رکھے فرمایا مجھے تعجب ہے ان عورتوں پر کہ تمہاری آواز سُن کر فوراً چھپ گئیں. عمر ابن خطاب نے عرض کیا یا رسول اللہ! انھیں آپ سے ڈرنا چاہیئے تھا پھر عمر ابن خطاب نے ان عورتوں سے مخاطب ہو کر کہا اے اپنی جان کی دشمن عورتوں مجھ سے ڈرتی ہو اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نہیں ڈرتیں. عورتوں نے کہا ہاں کیوں کہ تم حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں بہت سنگ دل اور بد اخلاق ہو اس پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ کی قسم اے عمر شیطان تمہیں جس راستے پر چلتا ہوا دیکھ لے وہ فوراً اپنا راستہ تبدیل کر لیتا ہے.

ان دونوں روایتوں کا تقابلی جائزہ لیجئے اور سوچیے کہ ایک طرف حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے کہ نماز کے دوران بھی شیطان ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور دوسری طرف عمر ابن خطاب کی شخصیت ہے جسے دور سے دیکھ کر شیطان بھاگ جاتا ہے.

بخاری ایک بدنہاد محدث

یہ بخاری ہے جسے صحیح بخاری کہا جاتا ہے اور جس کی کتاب کو "اصح الکتب بعد کتاب اللہ (اللہ کی کتاب کے بعد سب سے صحیح کتاب) کا درجہ دیا جاتا ہے اس میں ایسی بیسیوں روایتیں مذکور ہیں جن سے پیغمبرانہ عظمت مجروح ہوتی ہے اس پر بھی اسے "امام بخاری" کے بھاری بھرکم لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ وہی بخاری ہے جس نے اپنی کتاب میں سیدنا علیؑ پر علانیہ سب وشتم کرنے والے لوگوں کی روایتیں تو بلا تکلف قبول کرلی ہیں اور اہل بیت نبوتؐ کی کسی روایت کو رطب ویابس کے اس مجموعہ میں شامل نہیں کیا۔

آخر یہ کہاں کی دیانت وشرافت اور یہ کیسی دین داری اور تقویٰ شعاری ہے کہ بخاری عمرانؑ بن حطان جیسے ملعون اور خبیث الفطرت خارجی کی روایت کو اپنی کتاب میں جگہ دیتے ہوئے ذرہ بھر نہیں ہچکچاتا اور یہ عمران بن حطان وہی شخص ہے جس نے سیدنا علی علیہ السلام کے قاتل عبدالرحمان ابن ملجم کی تعریف اپنے اشعار میں کی تھی اور اسے اس کے اس فعل بد پر داد دی تھی بخاری کے راویوں میں مروانؑ کا نام بھی ملتا ہے اور حریزؓ بن عثمان کا بھی جس کا معمول یہ

تھا کہ مسجد سے اس وقت تک نہیں نکلتا تھا جبتک ستر مرتبہ حضرت علیؑ پر "عیاذاً باللہ" لعنت نہیں بھیج لیتا تھا بخاری کے ان راویوں میں ایک نام اسحاق بن سوید العدوی البصری کا بھی ہے جو حضرت علیؑ پر لعن طعن کرتا تھا ایک اور نام عبدالرحمٰن بن ابراہیم کا ہے جو دحیم شامی کے عرف سے معروف تھا اور جو یہ کہتا تھا کہ "جو شخص یہ کہتا ہے کہ معاویہ کی فوج باغی فوج تھی وہ حرامی ہے" اس نام نہاد امام بخاری نے اس ملعون کی روایت بھی قبول کی ہے اور اسے اپنی "صحیح" میں جگہ دی ہے اس طرح زیاد بھی بخاری کا راوی ہے۔ اور اگر روایت قبول نہیں کی تو حضرت سیدنا امام جعفر صادق علیہ السلام کی اس لیے کہ وہ بخاری کے مقرر کردہ معیار صداقت پر پورے نہیں اترتے اور بخاری کا معیار روایت کیا ہے اس کی اوقات خود اسی کے مداحوں سے سن لیں جنھوں نے اپنی کتابوں میں بخاری کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

رُبَّ حديث سمعته بالبصرة كتبته بالشام ورب حديث سمعته بالشام كتبته بمصر

(ابن حجر اسقلانی شرح بخاری)

"بہت سی حدیثیں میں نے بصرہ میں سنیں اور شام میں جاکر لکھیں اور شام میں بہت سی حدیثیں سنیں جنھیں مصر جاکر لکھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جتنا نقصان اسلام کو بخاری کے اس مجموعۂ حدیث نے پہنچایا ہے اور نبی آخرالزماں محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عظمت جتنی اس کتاب سے مجروح ہوئی ہے شاید ہی کسی اور کتاب سے ہوئی ہو راقم الحروف نے رسوائے زمانہ کتاب "ستیہ رتھ پرکاش" کا چودھواں باب بالاستیعاب پڑھا ہے جسے پڑھ کر ایک مسلمان کا خون کھول جاتا ہے اس کے کم وبیش سارے حوالے بخاری کی اسی نام نہاد "صحیح" سے لیے گئے ہیں۔

تعجب ہوتا ہے کہ ایک طرف تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت وعشق کا دعوئ کیا جاتا ہے دوسری طرف ایسی تحریروں کو عقیدہ وایمان قرار دیا جارہا ہے جن سے صراحتاً حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین کا پہلو نکلتا ہے اور لوگوں کے ذہنوں پر ایسی غفلت ومدہوشی طاری ہے کہ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی سے عاری ہوچکے ہیں مثلاً اردو کے مشہور روزنامہ "نوائے وقت" لاہور کے شمارہ ۹ جون ۱۹۷۷ء میں یہ عبارت پڑھ کر حیرت ہوئی کہ مسلمانوں کے ذہنوں میں کیا غلاظت بھری جارہی ہے اور انھیں کس طرف دھکیلا جارہا ہے عبارت یہ تھی کہ

"ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ سیدنا صدیق اکبرؓ کا وجود نہ ہوتا تو تاریخ اسلام کا دھارا کسی اور ہی طرف مڑا ہوتا۔"

گویا اسلام حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شبانہ روز جدوجہد کا رہین منت نہیں بلکہ ابوبکر نے اسے غلط راستہ پر جانے سے روکا ورنہ اگر ابوبکر نہ ہوتے تو اسلام کا "بولورام" ہوچکا ہوتا۔

یہ بھی بالکل اس نوع کی بات ہے جیسی کہ تمام کتب حدیث میں مذکور ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلیفہ دوم عمر ابن خطاب کے درمیان بعض دینی امور پر اختلاف رائے ہوگیا اور حق تعالیٰ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں عمر ابن خطاب کی رائے کو ترجیح دی اور وحی الٰہی نے عمر ابن خطاب کے فیصلہ کی توثیق کردی یعنی پیغمبرؐ تو محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور آسمان پر فیصلے ان کے صحابہ کی منشا کے مطابق کیے جارہے ہیں۔ تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو۔

حرامیوں کی پہچان

عرصہ گزرا کسی کتاب میں عربی کے یہ دو شعر نظر سے گذرے تھے۔

قسما ببکۃ والحطیم وزمزم
والرافصات وسعیھن الی منیٰ
لبغض الوصی علامۃ مکتوبۃ
کتبت علی جبھات اولاد الزنا

سرزمین حرم مکہ کی قسم، مقام حطیم اور آب زمزم کی سوگند، تیز رو گھوڑوں کی اور ان کی تیز رفتاری کی قسم جب وہ منیٰ کی جانب پیش قدمی کر رہے ہیں۔ وصی رسولؐ یعنی سیدنا علی ابن ابی طالبؑ سے دل میں بغض رکھنا حرامی بچہ ہونے کی واضح نشانی ہے جو اولاد زنا کی پیشانیوں پر ثبت ہو کر رہ گئی ہے۔

میں اسے شاعرانہ نکتہ آفرینی سمجھتا رہا لیکن اہل سنت کے مشہور محدث محب الدین طبری نے اپنی مشہور و مستند کتاب "الریاض النفرہ" میں جناب ابوبکر خلیفہ اول کے حوالہ سے ایک روایت نقل کی ہے جس سے اس مضمون کی تصدیق ہو گئی۔

عن ابی بکر الصدیق قال رائیت رسول اللہ خیم خیمۃ وھو متکی علی قوس عربیۃ وفی الخیمۃ علی وفاطمۃ والحسن والحسین فقال معشر المسلمین انا سلم لمن سالم اھل الخیمۃ حرب لمن حاربھم ولی لمن والاھم یحبھم الا سعید الجد طیب المولد ولا یبغضھم الا شقی الجد ردی المولد۔

"ابوبکر روایت کرتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خیمہ میں دیکھا آپؐ ایک عربی کمان کا سہارا لیے ہوئے تھے اس خیمہ میں حضرت علیؑ بھی تھے حضرت سیدہ فاطمہؑ بھی تھیں اور ان کے دونوں صاحبزادے حضرات حسنؑ و حسینؑ بھی اس موقعہ پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اے مسلمانوں کے گروہ! میری صلح ہے ان لوگوں کے ساتھ جو ان اہل خیمہ کے ساتھ صلح و محبت کے ساتھ رہیں اور میں سراپا جنگ ہوں ان لوگوں کے خلاف جو اہل خیمہ کے ساتھ برسرپیکار رہے ہوں میں دوست ہوں ان کا جو ان کے ساتھ دوستی رکھیں ان لوگوں کے ساتھ وہی شخص محبت کریگا جو نیک بخت اور پاکیزہ نسب والا ہو گا اور ان سے وہی شخص بغض رکھے گا جو بدبخت اور بدنسب ہو گا۔ (ج ۲ ص ۱۸۹)

عرب روایات میں نسب کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور نسب کی چھان بین بڑی تحقیق کے ساتھ کی جاتی تھی۔ سیدنا علیؑ علیہ السلام کے سب سے بڑے حریف معاویہ بن ابی سفیان کی ماں ہندہ کے بارے میں اور خود معاویہ کے بارے میں کتب تاریخ میں مذکور ہے۔

وکانت ھند تذکر فی مکۃ بفجور و عھد وقال زمخشری فی کتاب ربیع الابرار کان معاویہ یعزی الی اربعۃ الی مسافر ابن ابی

عمرو والی عمارة بن الولید بن مغیرة والی العباس والی الصباح۔
(شرح ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۱۲۳)

مکہ میں ابوسفیان کی بیوی اور معاویہ کی ماں ہندہ کی زنا کاری اور بدکرداری کا چرچا عام تھا زمخشری علامہ جار اللہ صاحب تفسیر کشاف نے اپنی کتاب "ربیع الابرار" میں ذکر کیا ہے کہ معاویہ کا نطفہ چار آدمیوں کی جانب منسوب کیا جاتا تھا مسافر ابن ابی عمرو۔ عمارہ بن ولید بن مغیرہ۔ عباس اور صباح نامی شخص۔

سیدنا علی کا دوسرا بڑا حریف عمرو بن العاص تھا۔ اس شخص کی ماں نابغہ کے نام سے معروف تھی اصل نام اس کا لیلیٰ غزیہ تھا۔ ایک مرتبہ اروی بنت حارث نے عمرو بن العاص سے مخاطب ہو کر کہا

وانت یا ابن النابغہ۔ متکلم و امک کانت اشھر امرأة تغنی وآخذ من اجرة اوی خمسہ نفر من قریش فسئلت امک عنہم فقالت کلہم اتانی فانظروا اشبہم بہ فالحقوہ بہ فغلب علیک شبہ العاص بن وائل فلحقت بہ (عقد الفرید ج ۱ ص ۲۲)

اروی بن حارث نے عمرو بن عاص سے کہا کہ نابغہ کے بیٹے کیا بڑھ چڑھ کر باتیں بنا رہا ہے تیری ماں مکہ کی مشہور گانے بجانے والی عورت تھی اور باقاعدہ اس کی اجرت وصول کرتی تھی۔ قریش کے پانچ آدمیوں نے تیرے بارے میں بیک وقت یہ دعویٰ کیا کہ تو ان کا نطفہ ہے تیری ماں سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو اس نے تصدیق کی کہ ہاں ان پانچوں نے مجھ سے زنا کیا ہے لیکن لڑکے کا چہرہ دیکھ کر طے کر لو کہ کس پر اس کی شکل گئی ہے جس سے اس کی مشابہت ہو اسی کا اس کو بیٹا قرار دے دو چنانچہ تمہاری شکل عاص بن وائل سے ملتی جلتی تھی اس لیے تمہیں اس کا بیٹا قرار دے دیا گیا۔ یہ پانچ آدمی

جن سے بدکاری کا عمرو بن العاص کی ماں نے خود اعتراف کیا حسب ذیل تھے۔
عاص بن وائل۔ ابولہب۔ امیہ بن خلف۔ ہشام بن مغیرہ اور ابوسفیان بن حرب۔ زیاد بن ابیہ کے حرام زادہ ہونے پر تو ساری اُمّت کا اتفاق ہے اور معاویہ نے اس حرامی بچے کو اپنا حقیقی بھائی قرار دے کر اپنے اور اس کے نسب کے مشکوک ہونے کا خود ہی اعتراف کر لیا کہ اول بہ آخر نسبتے دارد۔

ابن زیاد کا لڑکا عبداللہ ابن زیاد تھا جس نے یزید پلید کے ایما پر حضرت سیدنا حسین علیہ السلام اور ان کے اہل بیت اور ان کے انصار و اعوان کو دشت کربلا میں شہید کیا اور تو اور خلیفہ دوم کے بارے میں بھی نسابین نے انہی شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے اور ان کے نسب کی صحت کو متہم قرار دیا ہے مگر ہم یہاں اس کی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتے کیونکہ ہمارا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کی رو سے ہر وہ شخص جس کے دل میں حضرت علیؑ حضرت فاطمہؑ حضرت حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ کے لیے بغض و کینہ کے جذبات پنہاں ہوں اس کا نسب مشکوک اور اس کا حسب ملعون قرار پاتا ہے۔

میرے برادر نسبتی سید ابوذر بخاری جو سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے بڑے فرزند ہیں انھوں نے جب یوم معاویہ اور یوم مروان منانے کا ہر سال اہتمام کیا تو میں نے گھر میں کہا کہ میں یہ بات حلفاً کہہ سکتا ہوں کہ عطاء اللہ شاہ بخاری خانوادہ سادات میں سے نہیں ہے کیونکہ کوئی صحیح انسان سید معاویہ و مروان کی تعریف میں رطب اللسان نہیں ہو سکتا خاندانی غیرت و حمیت ایک بالکل فطری و طبعی تقاضا ہے اور جو اپنے جد اعلیٰ کے حریفان روسیاہ کی منقبت سرائی کرے اسے بدنسب اور بدگوہر ہی کہا جائے گا۔

اسی بنا پر شیخ عبدالقادر جیلانی جن کا مزار بغداد میں ہے اہل تحقیق کے نزدیک سادات میں سے نہیں ہیں کیونکہ انہی کا ایک مرید خاص اور خصوصی تربیت خلیفہ شیخ عدیؒ من مسافر (متوفی ۵۵۲ ھ ۱۳۱۰ء) جو اموی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور یزید اور معاویہ کے فضائل و مناقب کی خصوصی مجالس منعقد کرتا تھا اور اس بدبخت نے یزید کو صحابی وغیرہ کے درجہ تک پہنچانے کے لیے زبردست تحریک شروع کی اور شیخ عبدالقادر جیلانی نے اسے ایک مرتبہ بھی نہیں روکا (اعلام الزرکلی ج ۵ ص۱۱) شیخ عبدالقادر جیلانی نے ویسے خود بھی سید ہونے کا دعویٰ نہیں کیا یہ تو ان کے پوتے نصر بن ابوبکر بن عبدالقادر جیلانی نے پہلی مرتبہ اپنے سید ہونے کا اعلان کیا اور پھر یہ بات مشہور ہو گئی اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے خود ہمارے دور میں بلکہ ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے بعض لوگ سید بن گئے اور اب ان کے سید ہونے پر کسی کو بھی شک نہیں رہا ہے۔ ضلع کیمبلپور (اٹک) میں نقش بندی سلسلہ کی ایک مشہور خانقاہ ہے جسے چورہ شریف کہتے ہیں بابا نور محمد اور بابا فقیر محمد اس خانقاہ کے بزرگان طریقت تھے ان میں سے کسی نے بھی بلکہ ان کے بعد بھی ان کی اولاد میں سے کسی نے اپنے سید ہونے کا دعویٰ نہیں کیا لیکن اس خاندان کے ایک چلتے پرزے شخص نے اپنے نام کے ساتھ سید اور شاہ کے الفاظ استعمال کرنے شروع کئے اور اب اس مردکم سواد کے سلسلہ میں ایک اشتہار نظر سے گذرا جس میں سالانہ عرس کی خبر دی گئی تھی اور اس کا عنوان تھا۔

" عالی جناب، سپہر رکاب، صاحب خلق حسن، مظہر فیض اتم فخر السالکین عمدۃ العارفین تاج دار اقلیم علم و حلم الحاج ابوالکلیم صاحبزادہ سید محمد خادم حسین

شاہ صاحب مدظلہ العالی نقشبندی مجددی نوری زیب سجادہ درگاہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ نوریہ چورہ شریف۔

عرس کا یہ اشتہار ۲، ۳، ۱ اپریل ۱۹۷۷ء مطابق ۲۰، ۱۲ جمعیت کی بابت ہے اور اسے ناظم جماعت نقشبندیہ مجددیہ نوریہ لائل پور نے شائع کیا ہے اگر ارتقاء و تہذیب کے اس ترقی یافتہ دور میں۔ دروغ گویم برروئے تو' یہ واردات روز روشن میں ہو سکتی ہے تو آج سے سات آٹھ سو برس قبل کے دور میں جبکہ نہ ذرائع مواصلات تھے نہ ابلاغ عامہ کے اتنے وسائل، کسی شخص کا اپنے نسب میں تبدیلی کر لینا کوئی مشکل امر نہیں تھا۔ اور یہ تو صرف ایک مثال پیش کی ہے ایسے بے شمار واقعات راقم الحروف کے علم میں ہیں جنھیں آئندہ کسی کتاب میں تفصیل اور شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔ ویسے اس سے پہلے مجلس تحفظ حقوق اہل سنت کے جنرل سکریٹری عبد المجید ندیم نامی ایک مولوی کا ذکر ہم کر چکے ہیں جو دیکھتی آنکھوں کھٹیک سے سیّد بن گیا اور ابھی تک بنا ہوا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے بد اصل لوگوں سے توقع رکھنا کہ وہ خانوادہ نبوت و رسالت سے کوئی جذباتی وابستگی رکھیں گے اور ان میں خاندانی عزت وحمیت کا کوئی شائبہ ہو گا ایک عبث اور بیکار توقع ہے۔ ورنہ کیا یہ حیرت واستعجاب کی بات نہیں کہ دنیا میں کروڑوں کی تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ذکر حسینؑ اور ذکر اہل بیت اور مصائب خانوادہ نبوت پر اپنے آنسو ضبط نہیں کر سکتے اور گریہ و بکا اور ماتم عزا کے ذریعے اپنے جذبات محبت و غم کا برملا اظہار کرتے ہیں حالانکہ ان کا کوئی خاندانی اور نسبی تعلق اہل بیت سے نہیں ہے لیکن اس کے برعکس خود کو ہاشمی اور قبیلہ سادات سے متعلق کہنے کے باوجود ایسے بدبخت غدار بھی ہیں جو معاویہ اور اس کی ذریت کی مدحت سرائی میں شب و روز

مصروف ہیں عبداللہ ابن زبیر کے بارے میں عمر ابن شبتہ ابن مکبی واقدی اور دیگر مورخین نے لکھا ہے کہ جس زمانہ میں اس شخص نے رسوائے خلافت کیا اور یہ کل مدت دس ماہ کے لگ بھگ ہے پورے چالیس جمعہ تک اس شخص نے کسی جمعہ میں بھی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام نہیں پڑھی اور جب اس سلسلے میں اس سے استفسار کیا گیا تو اس نے کہا

لا یمنعنی من ذکرہ الا ان تشمخ رجال بآنافہا۔

(مجھے پیغمبر کے ذکر سے جو چیز مانع ہے وہ یہ ہے کہ اس ذکر سے ان لوگوں کی ناک اونچی ہو جاتی ہے اس کا اشارہ خاندان نبوت کی جانب تھا۔

شاید یہ اسی کا اثر ہے کہ اہل سنت کے ہاں صلوٰۃ وسلام میں اہلبیت محمد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر سرے سے غائب ہوتا ہے کسی بھی مستند کتاب میں صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لکھا ہوا نظر نہیں آئے گا درود وسلام میں سے آل پیغمبر کا تذکرہ حذف کر دینا سوائے بدبختی اور فرومائیگی کے اور کیا ہے لیکن پچھلے چودہ سو برس سے یہ معمول سواد اعظم نے اختیار کر رکھا ہے اور اس پر بھی محبت رسولؐ کی اجارہ داری اسی گروہ کے پاس ہے۔

میں جب تک فقہ جعفریہ کے مطابق نماز کی کیفیت سے واقفیت نہیں رکھتا تھا یہ سمجھتا تھا کہ نماز کی یہ صورت مالکیہ سے ملتی جلتی ہے ان کے ہاں بھی ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھی جاتی ہے اور تکبیرات میں رفع یدین بھی بہت سے ائمہ کے مسلک میں متداول ہے لیکن جب اس نماز کی جو شیعان علیؑ کا معمول ہے اس حقیقت سے مجھے آگاہی ہوئی کہ وہ ہر رکن میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و آل محمد علیہم السلام پر صلوٰۃ وسلام بھیجتے ہیں تو دل پر وجد اہتزاز کی کیفیت طاری ہوگئی اور میں نے

نماز کے اس طریقے کو اپنا معمول بنا لیا جو فقہ جعفریہ کا طریقہ ہے رکوع میں سجود میں قعدہ میں صلوٰۃ پر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وآل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ الزام و اہتمام انہی لوگوں کا مقدر ہے جن کے دل اللہ رب العزت نے محبت پیغمبرؐ و آل پیغمبرؐ سے سرشار کر دیئے ہیں مجھے علم ہے مسلمانوں کے سواد اعظم میں اور اہل سنت والجماعت میں ایسے بدنہاد لوگ بھی گذرے ہیں اور ہیں جن کے خیال میں نماز میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تصور آجانے سے نماز باطل ہو جاتی ہے لیکن اس گروہ کی خوش بختی کا کیا ٹھکانہ جنھوں نے پیغمبرؐ اور آل پیغمبرؐ کے تذکرے کو ورد دل و زباں بنا لیا ہے اور محبت کی معراج یہی ہے کہ ؎

" بنا لیا ہے ترے غم کو جاوداں میں نے "

شیعی مکتب فکر اور فقہ جعفریہ کے خلاف پروپگنڈہ کا ایک طوفان بدتمیزی ایک عرصہ سے بپا ہے لیکن اب سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کے تہتر فرقوں میں سے جس ایک فرقہ کے ناجی ہونے کا یقین دلایا ہے وہی فرقہ شیعان علیؑ ہیں کہ انھوں نے اپنا مرکز محبت صرف حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کی ذریت طیبہ کو بنایا ہے ورنہ سواد اعظم کی کم سوادی کا تو یہ عالم ہے کہ انھوں نے ایک پارچہ باف کو امام اعظم بنا لیا ہے حالانکہ امامت عظمیٰ کی خوش نصیبی اگر کسی کی قامت موزوں پر راست آسکتی تھی تو وہ سیدنا علیؑ کی ذات گرامی تھی یا پھر شہید گلگوں قبا سیدنا حسین علیہ السلام اور ان کی آل اطہار کے لیے لقب موزوں تھا لیکن زمانہ کی ستم ظریفی اور وقت کی کج ادائی دیکھیئے کہ ہندوؤں کے ۲۳ کروڑ دیوی دیوتاؤں کی طرح مسلمانوں کے ہاں

بھی امامت بازاری جنس بن کر رہ گئی اور بلاشبہ ہزاروں کی تعداد میں ان کے ہاں امام ملتے ہیں۔ جنس امامت کی یہ ارزانی خود اس گروہ کی فرومایگی پر دلالت کرتی ہے ان میں کوئی یہودی الاصل ہے جیسے بخاری کوئی عجمی نژاد ہے جیسے ابوحنیفہ کوئی مجہول النسب ہے جیسے ابن تیمیہ جس نے کہا تھا کہ " عصای خیر من محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تنفع ولا ینفع (میری چھڑی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہتر ہے کہ یہ فائدہ تو دیتی ہے لیکن محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی فائدہ اور نفع نہیں مل سکتا) ان میں کوئی ایران کا ہے تو کوئی توران کا کوئی ہندوستان کا ہے تو کوئی ترکستان کا خانوادۂ امامت تو صرف اور صرف خانوادۂ نبوت ہی کا شرف و امتیاز تھا جس پر غیروں نے ہاتھ صاف کردیا۔

گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے

اور اس کوشش مذموم کا سہرا معاویہؓ کے سر ہے جس نے امام برحق سیدنا علیؑ کے خلاف بلاوجہ محاذ آرائی کی پالیسی اختیار کی مجھے یہاں معاویہؓ کے بیٹے یزیدؓ کے فرزند معاویہ کا وہ خطبہ یاد آیا جس میں اس نے اعتراف کیا ہے کہ سیدنا علیؑ سے معاویہ کا برسرِ پیکار ہونا ایک غلط اور بیہودہ حرکت تھی اور یہ خطبہ اس موقعہ کا ہے جب یزید ملعون کے مرنے کے بعد حکومت کا تاج اس کے سر پر رکھا گیا۔

ایہا الناس ضعفت عن امرکم فاختاروا من اجبتم ایہا الناس ان جدی معاویۃ نازع الامر اھلہ ومن ھو احق بہ منہ لقرابتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وھو علی ابن ابی طالب ورکب بکم ما تعلمون حتی اتتہ منیۃ فصار فی قبرہ رھینا بذنوبہ واسیرا لخطایاہ ثم قلد ابی الامر فکان غیر اھل لذلک ورکب ھواہ واخلفہ الامل وقصر عنہ الاجل وصار فی قبرہ رھینا بذنوبہ واسیرا بجرمہ ثم بکی حتی جبرت دموعہ علی خدیہ ثم قال ان من اعظم الامور علینا علمنا بسوء مصرعہ وبئس منقلب

وقد قتل عترة رسول الله صلے الله علیہ وآلہ وسلم واباح الحرم و خرب الکعبۃ وما انا بالمتقلد ولا بالمتحمل تبعاتکم فشانکم امرکم واللہ لئن کانت الدنیا خیرا فقد نلنا منہا حظا ولئن کانت شرا فکفیٰ ذلـہ لابی سفیان ما اصابوا منہا (النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر والقاہرہ، تالیف جمال الدین ابی المحاسن یوسف بن تغری)

"لوگو! میں اس کار حکومت کا بار اٹھانے کی سکت نہیں رکھتا اس لیے تم اپنا کوئی ایسا امیر چن لو جو تمہیں پسند ہو۔ لوگو! میرے دادا معاویہ نے حکومت کے سلسلے میں اس شخص سے لڑائی جھگڑہ کیا جو اس منصب کے لیے سب سے زیادہ مستحق اور حقدار تھا کیونکہ اس شخصیت کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے قرابت کا تعلق تھا اور وہ شخصیت علی ابن ابی طالبؑ کی تھی۔ معاویہ نے تمہیں جس روش پر چلایا تم اس سے بخوبی آگاہ ہو بالآخر موت نے اسے آلیا اور آج وہ اپنی قبر میں اپنے جرموں اور گناہوں کی سزا بھگت رہا ہے اس کے بعد میرے باپ نے اقتدار پر قبضہ کیا وہ اس منصب کا بالکل اہل نہ تھا وہ اپنی خواہشات کا غلام بنا رہا اس کی خواہشات نفسانی نے اسے کہیں کا نہ چھوڑا بالآخر اس کو بھی زیادہ مہلت نہ ملی اور آج وہ بھی اپنی قبر میں اپنے گناہوں اور اپنی غلط کاریوں کی سزا پا رہا ہے۔ سب سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ ہمیں اس کے بارے میں بخوبی علم ہے کہ اس کا انجام نہایت برا اور اس کی عاقبت نہایت خراب ہوئی ہے کیونکہ یہ وہی شخص تھا جس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کو شہید کروایا۔ حرم کی بے آبروئی کی کعبۃ اللہ کو اجاڑا سو میں اس کام کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہوں اور نہ تمہاری حکمرانی کا متحمل ہو سکتا ہوں اس لیے تم

تم اپنے لیے کوئی دوسرا آدمی ڈھونڈو۔ اللہ کی قسم اگر دنیا کی اس چار روزہ حکومت پر خیر کا کوئی پہلو تھا تو اس سے ہم نے اپنا حصّہ وصول کر لیا ہے اور اگر اس میں شر کا عنصر غالب تھا تو ابوسفیان کی اولاد کو اس شر میں سے جو کچھ حاصل ہو گیا ہے وہی اس کی بدبختی کے لیے کافی ہے؛

مثل مشہور ہے کہ "گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے" تو معاویہ کے پوتے اور یزید کے بیٹے کی اس شہادت کے بعد جو لوگ معاویہ کے فضائل ومناقب پر طبع آزمائی کرتے اور کتابیں لکھتے ہیں انھیں شرم آنی چاہیے کہ وہ تاریخ کے اس اٹل فیصلہ کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں جو معاویہ اور اس کے خاندان کی شقاوت اور بدبختی کے بارے میں صادر ہو چکا ہے۔

آج بعض بدنہاد لوگ شیعان علیؑ کو تبرائی کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں لیکن انھوں نے کبھی سوچا کہ تبرّائی رسم بد کا آغاز تو معاویہ نے کیا تھا اور تاریخ کی تمام کتابیں اس پر متفق ہیں کہ معاویہ نے اپنے دور کے خود فروش مُلّاؤں اور اپنے بے ضمیر گورنروں کو ہدایت کی تھی کہ وہ سیدنا علی علیہ السلام پر زبان طعن دراز کریں۔

چنانچہ اس دور کے خطیبان بدنہاد اور حکومت وقت کے وفاداران فرماد، یہ سیّدنا علیؑ پر علانیہ سب وشتم کرتے رہے تبرائی کہلانے کے مستحق تو وہ لوگ ہیں جو معاویہ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور اس کی منقبت سرائی کرتے ہیں۔ مشہور صحابی رسولؐ حضرت حجرؓ بن عدی کو اس بدبخت اور بدنہاد شخص نے محض اس جرم کی پاداش میں قتل کروا دیا اور اس بھیانک طریقے پر کہ انسانیت آج تک اس پر لرزہ براندام ہے کہ انھوں نے سیّدنا علیؑ پر سب وشتم

کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ارشاد فرمایا تھا۔

ان الصبر علی حد السیف لا یسیر علینا مماتند عونا اللہ ثم القدوم علی اللہ وعلی نبیہ وعلی وصیہ حب الینا س دخول النصاد۔

"تلوار کے وار کو برداشت کرنا میرے لیے زیادہ آسان ہے بہ نسبت اس جرم کے ارتکاب کے جس کا تم مجھ سے تقاضا کر رہے ہو۔ اور آخر کار تو اللہ اور اس کے رسول اور پیغمبرؐ کے وصی علی ابن ابی طالبؑ کے حضور حاضر ہونا ہے اور سرخ روئی کے ساتھ ان کی بارگاہ میں حاضری جہنّم میں داخل ہونے سے بہر حال بہتر ہے۔"

معاویہ بن ابی سفیان

یوں تو اہل بیتؑ کے ساتھ دشمنی اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بغض وعناد رکھنے کے سلسلے میں بڑے بڑے "جلیل القدر" صحابہ ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اور اس حمام میں بڑے بڑے نامی گرامی ننگے نظر آتے ہیں لیکن دو شخصوں کو اس میں اولیت کا منفرد شرف و اعزاز حاصل ہے ایک عمر ابن خطاب اور دوسرا معاویہ بن ابی سفیان اول الذکر کے بارے میں تو آپ بہت کچھ پڑھ اور سن چکے ہیں معاویہ کے باب میں اگرچہ تفصیلات حد بیان سے باہر ہیں لیکن یہاں ہم صرف ایک واقعے کے ذکر پر اکتفا کریں گے۔

زبیر بن بکار نے "الموفقیات" میں مغیرہ بن شعبہ کے لڑکے مطرف کے حوالہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ مطرف کہتا ہے اپنے باپ (مغیرہ بن شعبہ) کے ساتھ امیر معاویہ کے ہاں آنا جانا تھا میرا باپ تو معاویہ کے ہاں اکثر و بیشتر جاتا رہتا تھا اور اس سے دیر تک گفتگو رہتی تھی میرے والد مجھ سے اکثر معاویہ کی عقل و دانش اور اس کی فہم و فراست کا ذکر کرتے تھے اور اس سے بہت

متاثر تھا ایک روز رات کو جب وہ معاویہ سے مل کر آئے تو انھوں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت پریشان اور غمگین ہیں میں نے کچھ دیر تو انتظار کیا کہ شاید وہ خود ہی کچھ کہیں اور جس واقعہ سے وہ ملول ہیں اس کا از خود اظہار فرمائیں۔ آخر میں نے پوچھ ہی لیا کہ میں آپ کو آج پریشان اور غمگین دیکھ رہا ہوں اس کا سبب کیا ہے؟ اور اس آزردگیٔ خاطر کی کیا وجہ ہے! اس پر میرے والد بولے۔

بیٹے! میں ایک ایسے شخص کے ہاں سے اٹھ کر آیا ہوں جو بدترین کافر اور خبیث ترین انسان ہے۔

میں نے پوچھا کیا ہوا۔ مغیرہ بن شعبہ بولا۔ رات میں میں نے تنہائی میں معاویہ سے کہا کہ اب تم بوڑھے ہو چکے ہو آخر عمر کے اس موڑ پر عدل وانصاف سے کام لو اور اپنے بھائیوں یعنی قبیلۂ بنو ہاشم کے افراد کے ساتھ حسن سلوک کرو اور صلہ رحمی کا رویہ اختیار کرو تو زیادہ بہتر رہے گا کیونکہ اب ان کے پاس کوئی ایسی طاقت بھی نہیں رہی جس سے تمھیں کسی قسم کا اندیشہ ہو اس لیے اگر تم ان کے معاملہ میں اپنا رویہ تبدیل کر لو تو اس سے تمہیں بھی اجر ملے گا اور تمہاری نیک نامی بھی ہوگی اس پر معاویہ بولا۔ افسوس کونسی نیک نامی کی امید مجھے ہو سکتی ہے۔ بنو تیم کے قبیلہ کے ایک فرد یعنی ابو بکر نے حکومت کی اور عدل وانصاف سے حکومت کی لیکن آج مراکل دوسرا دن اب اس کی یاد بھی باقی نہیں رہی زیادہ کسی نے کہا تو ابو بکر کا نام لیا اور قصہ ختم پھر بنی عدی کے قبیلہ کے ایک شخص یعنی عمر ابن خطاب نے حکومت کی اور کافی کدو کاوش سے دس برس گزار دئے وہ مرا تو اب اس کا بھی کوئی نام لیوا باقی نہیں رہا لیکن ابن کبشہ[1] یعنی حضور سرورِ کائنات محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام دن میں پانچ مرتبہ چیخ چیخ کر لیا جاتا

(1 حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

ہے اور اشہد ان محمد رسول اللہ کی آواز اذان میں، بلند ہوتی ہے۔ اس صورت میں کسی عمل کے باقی رہنے اور کس یاد کے زندہ رہنے کی آرزو کی جا سکتی ہے مغیرہ اب تو صرف موت میں مر جانے کا عمل باقی رہ گیا ہے کہ مریں اور مٹی میں مل جائیں۔

یہ تھا نظریہ معاویہ بن ابی سفیان کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں جس کو آج بعض بدنہاد لوگ حضرت امیر معاویہ کہتے ہیں۔ صحابہ کی عظمت کے گن گانے والے لوگ معاویہ کی اس خباثت کا اندازہ کریں کہ اس کا یار غار اور اس کا محرم راز مغیرہ خود اس کو اکفر اور اخبث (بہت بڑا کافر اور نہایت خبیث) کہہ رہا ہے لیکن ہمارے ہاں اسی اکفر اور اخبث انسان کی یاد میں دن منائے جاتے ہیں اور دن منانے کا یہ سلسلہ انھوں نے شروع کیا ہے جو مسلک سے دیوبندی ہونے کی بنا پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یوم ولادت منانے کو بھی بدعت قرار دیتے رہے ہیں۔

لاہور کے ایک دین فروش مُلّا مولوی احمد علی لاہوری نے جسے اس کے مریدان کم سواد شیخ التفسیر کہتے ہیں اس نے خدام الدین کے نام سے ایک پرچہ نکالا۔ اس پرچہ کے سرورق پر یہ اپیل شائع کی گئی کہ ۲۲ رجب کو معاویہ کا دن منایا جائے کیونکہ وہ مسلمانوں کا ماموں ہے (یہ شمارہ

لے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن توہین وتضحیک کی نیت سے آپؐ کو اس کنیت سے یاد کرتے تھے اسی سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں معاویہ کے خبث باطن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام لینے کی بھی توفیق نہیں ہوئی اور وہ حضورؐ کا ذکر توہین آمیز انداز میں کرتا ہے۔

رجب ۱۳۹۸ھ کے کسی ہفتہ کا ہے)

اگر معاویہ مسلمانوں کا ماموں ہے تو ام المومنین حضرت صفیہ کا باپ حیّ بن اخطب جو یہودی تھا وہ تو مسلمانوں کا نانا ہوا اس کا دن کیوں نہیں مناتے اہل سنت کا یہ عجیب و رر خاکہ دار ہے کہ اپنے ماموں کی یہ عزت افزائی اور اپنے نانا سے یہ بے رخی اور کج ادائی نانا کا حق تو بہر حال ماموں سے زیادہ ہوتا ہے ویسے عربی زبان میں ایک کہاوت ہے ” الخال خال “ ماموں کا دل محبت سے خالی ہوتا ہے البتہ اگر اسے پنجابی زبان کا ” ماماں “ کہہ لیا جانا تو کوئی مضائقہ نہیں۔ خیر یہ تو اپنے اپنے مقدر کی بات ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جشن ولادت منانا بدعت قرار پائے عبدالقادر جیلانی کی گیارہویں کا ختم دلانا شرک سمجھا جائے اور ماموں معاویہ کا یوم وفات منانے کی باقاعدہ مہم چلائی جائے۔

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

صحابہ کو اتنی اہمیت اس لیے بھی دی جا رہی ہے کہ ایک مدت سے ملاؤں کا طبقہ آمد و خرچ کے باب میں عثمان بن عفان کی روش پر عمل پیرا ہے۔

مدرسے اسی لیے قائم کیے جاتے ہیں کہ ان کے ذریعے زکوٰۃ و صدقات و خیرات کی جو آمدنی ہو اسے بے دریغ اپنی ذات پر حلال و حرام کی پرواہ کیے بغیر خرچ کر دیا جائے۔

زید بن ارقم مشہور صحابی رسولؐ نے عثمان بن عفان کو بیت المال میں خیانت مجرمانہ کا مرتکب پایا تو اس پیر فرتوت خلیفہ سے کہا تھا۔

• مجھے یوں لگتا ہے کہ تم نے جو پیسے راہِ خدا میں صرف کیے تھے اب

بیت المال سے بمع سود کے اس دولت کو واپس لے رہے ہو تم نے مروان کو بیت المال سے اتنی رقم دی اپنے داماد کو اتنا روپیہ دیا تمہارے پیے اس کا کیا جواز ہے" دینی مدارس کے مہتمم حضرات نے اس گر کو پلّے باندھ لیا چونکہ اہل سنّت ہیں اس لیے خلیفۂ سوم کی سنّت پر بڑی فراخ دلی سے عمل پیرا ہیں اور دنیا ہی میں جنّت کے مزے لوٹ رہے ہیں۔

ہم ایسے بہت سے لوگوں کو ذاتی طور پر جانتے ہیں جو ان مدرسوں کی آڑ میں شکار کھیل رہے ہیں کاریں ہیں، کوٹھیاں ہیں اور وہ بھی ایر کنڈیشنڈ۔ لائل پور میں مفتی زین العابدین کے پاس کار بھی ہے ایر کنڈیشنڈ بنگلہ بھی ہے اللّے تللّے بھی ہیں اور ذریعہ معاش کیا ہے اس کا اپنے مدرسے دار العلوم اسے کہتے ہیں۔ حلوائی کی دکان دادا جی کا فاتحہ، ظاہر ہے کہ خلیفہ سوم کی سنت پر کاربندی کے بغیر زندگی کے یہ مزے کہاں مل سکتے تھے۔ جماعت اسلامی کا ایک صف اول کا رہنما مولوی گلزار احمد پراچہ ہے علماء اکیڈمی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور اس نام پر بیرون ملک سے لاکھوں روپے چندہ کر کے لایا پھر کوٹھی لی کار بھی خریدی خود اس اکیڈمی کا صدر بنا لڑکے کو اس کا سکریٹری بنایا اور خوب داد عیش دے رہا ہے اور جماعت اسلامی کی آشیر داد اسے حاصل ہے حالانکہ سب جانتے ہیں کہ یہ شخص بد دیانت ہے پہلے جمعیتہ اتحاد العلماء کا ڈھونگ رچا کر گل چھرے اڑاتا رہا اب علماء اکیڈمی کے فراڈ پر گزر اوقات کر رہا ہے اور یہ وہی جماعت اسلامی ہے جو خلافت راشدہ کا نظام ملک پر نافذ کرنا چاہتی ہے ۔

تو درون درجہ کردی کہ برون خانہ آئی

مجھے یاد ہے بہت عرصہ پہلے کی بات ہے راولپنڈی کا نام نہاد شیخ القرآن

جو قرآن پڑھتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے قرآن کو کند چھری سے ذبح کر رہا ہو. وہ اپنے مدرسہ تعلیم القرآن راجہ بازار راول پنڈی کے سالانہ جلسہ میں شرکت کی دعوت لے کر مرحوم سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے پاس گیا اور یہ سن اکاون ۵۱ء کا واقعہ ہے. شاہ جی نے مولوی غلام خاں سے کہا جبتک تم ان پچاس ہزار روپوں کا حساب نہیں دو گے جس سے تم نے حضرو میں زمینیں خریدی ہیں میں تمہارے مدرسے کے جلسہ میں شریک نہیں ہوں گا.

میاں چنوں ہیں مولوی ابراہیم جگراتوی کا مدرسہ ہے آج کل اس کا مہتم اسی کا لڑکا مولوی رشید ہے اس نے مدرسہ کی آمدنی سے ٹریکٹر خریدا اور خود مجھے بتایا کہ چونکہ مدرسہ کے فلاں مدرس کو اس واقعہ کا علم ہے اس لیے اس مدرس سے مجھے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں وہ اس خبر کو عام نہ کر دے اور میرے تقدس کا بھرم نہ نکل جائے یہ رقم ساٹھ ہزار سے زیادہ تھی. مفتی محمود مرحوم قاسم العلوم ملتان کا ایک معمولی مدرس تھا آج لاکھوں میں کھیلتا ہے اس دور میں اگر کسی شخص کی ماہانہ تنخواہ ہزار روپیہ بھی ہو تو وہ ایسے ٹھاٹھ کبھی نہیں جا سکتا جیسا کہ سیاست و مذہب کے اس پیر تسمہ پا نے جار رکھے ہیں.

سنو یہ لوگ بھی سچے ہیں ان کی نظریں اگر بار بار معاویہ اور عثمان کی جانب اٹھتی ہیں تو اسی اندیشہ سے کہ ان کی بدعنوانیوں کو ان اسلاف کی بدعنوانیوں کے پردہ میں چھپایا جا سکے.

دامن یار خدا ڈھانپ لے پردہ تیرا

ہر بدعنوانی کو سند جواز کہاں سے مل سکتی ہے صرف صحابہ سے اگر کسی عالم دین نے زنا کا ارتکاب کیا تو مغیرہ بن شعبہ کی مثال موجود ہے

جیسے حرامی بچہ زیادؔ کی مشکوک گواہی کی بنا پر شک کا فائدہ دیتے ہوئے خلیفۂ دوم نے سزا سے صاف بچالیا۔

اگر قومی سرمایہ میں گڑبڑ گھٹالا ہو تو عثمان جب خلیفۂ راشد بھی تو یہی کچھ کرتا رہا اور مولوی صاحب نے یہ حرکت کرلی تو کیا برا کیا۔

اگر کوئی خوب رو لونڈے کا تعاقب کرتا ہوا پکڑا جائے تو اظلع کا مرض بھی تو یہی تھا۔ یقین نہ آئے تو لائل پور کے تاج محمود مولوی اور بہاول پور کی جامعہ مدنیہ کے مہتمم مولوی غلام مصطفٰے سے پوچھ لیجئے کہ کسی لڑکے کو دعوتِ گناہ دینے کے بعد موقعہ پر پکڑے جانے کی صورت میں اسے کہاں پناہ مل سکتی ہے۔ مرواؔن کا باپ حکمؔ بھی تو اس علت کا مریض تھا۔
(حیوۃ الحیوان دمیری[۱])

مجھے خلیفۂ دوم کے زمانہ کا وہ خوب رو جوان نصر بن حجاج یاد آتا ہے جو

---

[۱] "روپ بہروپ" کے عنوان سے ایک کتاب عنقریب شائع کی جارہی ہے جس میں پاکستان کی دینی قیادت کے ان بدکردار نمائندوں کے "اسرار درون خانہ" کی بھرپور انداز میں نقاب کشائی کی گئی اور ان کی عیاشیوں، بدمعاشیوں، بدکرداریوں، ضمیر فروشیوں اور حجروں میں مجروں کی تمام داستانیں بھی تفصیل سے یکجا کردی گئی ہیں۔

پاکستان میں اس وقت جتنی دینی اور مذہبی جماعتیں سرگرم عمل ہیں ان کے صفِ اول کے تمام مقتدر رہنماؤں کی "ذوق عجم" کی کوچہ و بازار میں پھیلی ہوئی داستانیں گھر کے ایک بھیدی نے طشت از بام کی ہیں اور یوں ان بہروپیوں کی لنکا ڈھانے کی سعادت بھی اس کتاب کے مصنف ہی کو حاصل

(حاشیہ کا باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

قابو نہ آسکا تو پہلے اس کا سر منڈا دیا گیا اس پر بھی جب اس کا حسن ماند نہ پڑا تو اسے مدینے سے نکال باہر کیا کہ اچھا اگر ہمارے کام کے نہیں ہو تو کسی اور کے کام بھی کیوں آسکو الزام اس کا یہ لگا کہ لڑکیاں اسے دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتی ہیں۔

یہ ذوقِ جمالیات سے محرومی تھی یا احساس محرومی کی خلش اس کا فیصلہ تو خود صاحبِ واقعہ ہی کر سکتا ہے ہم کون ہیں کہ خلافتِ راشدہ پر لبِ تنقید وا کریں۔

ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

اگر باپ اپنے نااہل بدقماش اور بددیانت بیٹے کو اپنے مدرسے کی مسندِ اہتمام پر بٹھانے کی تدبیر کرتا ہے تو یہاں بھی صحابی کا طرز عمل سند ہے کہ معاویہؓ نے اپنے بدنہاد بیٹے یزیدؓ کو اسی دن کے لیے پالا پوسا تھا تاکہ اُمت کے علما اس کی پیروی کرسکیں۔

ایسے لوگوں کا ہیرو اگر معاویہؓ نہیں ہوگا تو اور کون ہوگا کہ۔

اول بہ آخر نسبتے دارد

سو صحابہ کے گن گانے ہی میں سب کا فائدہ اور بھلا ہے کہ ہر بدکار

ہوئی ہے کہ وہ ان رہنماؤں کی نجی زندگیوں کا بہت قریب سے اور بہت گہری نظر سے مطالعہ کرتا رہا ہے۔ دینی قیادت اور اس کی ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے راقم الحروف نے اس کتاب میں ان جملہ خرابیوں کا مفصل جائزہ لیا ہے جن کی وجہ سے دین اور حاملین دین پر سے لوگوں کا اعتماد یکسر اٹھ گیا ہے۔

اور بدنہاد انسان کو کسی نہ کسی صحابی کے دامن میں منہ چھپانے کا موقعہ تو مل جاتا ہے صحابہ کا اس سے اچھا مصرف اور کیا ہو سکتا ہے۔ عظمت صحابہ کے ہم بھی قائل ہیں مگر ان صحابہ کے جنھوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حق و باطل کی کش مکش میں حق کا ساتھ دیا ایسے تمام صحابہ ہماری سر آنکھوں پر ان پر خدا کی لامحدود رحمتیں نازل ہوں لیکن صحابہ کا وہ طالع آزما گروہ جس نے حق کو حق مانتے ہوئے باطل کو سینے سے لگایا اور حق کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا وہ کوئی خدا کی جناب سے حقوق یافتہ طبقہ نہیں ہے کہ اس کی غلط کاریوں پر گرفت نہ کی جائے۔

تاریخ نے کب کسی کو معاف کیا ہے کہ صحابیت کا دم چھلا لگنے سے روسیاہ اور بدکار لوگ معاف کر دیئے جائیں اور ان کے بارے میں زبان اور قلم کو جنبش نہ آئے۔

کیا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس لیے دنیا میں تشریف لائے تھے کہ ایک لاکھ بیس ہزار کے لگ بھگ صحابہ کو عصمت انبیاء کا سرٹیفکیٹ دے کرامت کے سروں پر مسلط کر جائیں کہ دیکھنا ان کو برا بھلا مت کہنا۔

چاہے یہ کچھ بھی گل کھلاتے رہیں
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

خواہ ان کی اس بدعنوانی کا نشانہ خود پیغمبر کی ذات اور ان کے خاندان کے وہ قریبی افراد ہی کیوں نہ بنتے رہیں جن سے محبت کا پیغمبر نے خود حکم دیا ہے بلاشبہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کو برا کہنے سے منع فرمایا ہے۔ مگر کیا کسی صحابی کے علانیہ مجرم ثابت ہو جانے کے بعد بھی اس کے جرم پر پردہ ڈالنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ کیا یہی اسلامی عدل و

انصاف کا تقاضا قرآن مقدس میں کتنی آیات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ میں ہر معیار کے لوگ موجود تھے۔ وہ بھی جن کے دامن تقدس پر فرشتے نماز پڑھیں اور وہ بھی کہ "انھیں دیکھ کے شرمائیں یہود" ان میں ایسے گستاخ اور منہ پھٹ صحابی بھی تھے جو کہتے تھے" جیسا شک حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے بارے میں مجھے حدیبیہ کے روز ہوا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا"

ان میں ایسے چیڑ قنا تیے بھی تھے جو بارگاہ نبوت میں ہونے پر خود کو فرشتوں سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کرتے اور جب وہاں سے اٹھتے تو "الوسواس الخناس" بن جاتے۔ جو میدان جنگ سے بھگوڑے بن کر راہ فرار اختیار کرتے لیکن میدان جنگ سے باہر ایک پر یوں دھونس جماتے جیسے اگر یہ نہ ہوتے تو اسلام کو تو بس سر چھپانے کی بھی جگہ نہ ملتی۔ خدا کے واسطے پنج انگشت یکساں نہ کرد۔ انسانوں کا ایک جم غفیر اور ان میں ہر ایک کانٹے پر تلا ہوا یہ عملاً ممکن نہیں ہے اور اس لیے قرآن پاک نے بارہا ان کے ڈھول کا پول کھولا جو صحابیت کے شرف سے مشرف تو ہو گئے تھے مگر جنھیں انسان بننے کا ابھی تک سلیقہ نہیں آیا تھا۔ اسلام میں ترش رو اور تنک مایہ لوگوں کا مذہب نہیں ہے مگر صحابہ میں ایسے ایسے بدمزاج لوگ پائے جاتے تھے۔ جن سے مرد تو رہے ایک طرف عورتیں بھی ان سے وحشت کھاتی تھیں۔

ان میں ایسے فرد اور چاپلوسی قسم کے صحابہ بھی تھے جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں ایک صحابی کو سب سے بڑا اعزاز ملنے پر سب سے پہلے مبارک باد دیں اور جب حضور نبی اکرم دنیا سے رخصت ہو جائیں تو اس اعزاز پانے والے صحابی کی زندگی اجیرن کر دیں اسے محض چند غنڈوں کی پشت پناہی

کی بنا پر آنکھیں دکھائیں اور اس کی جان اور عزت کے لاگو ہو جائیں اور جب ذرا اقتدار مل جائے تو اپنے ہی ساتھیوں اور ہم جنسوں پر غرانے لگیں اور ان کا جینا حرام کر دیں ۔لہ

سو اپنی سمجھ میں تو یہ بات نہیں آتی اور نہ کسی معقول انسان کی سمجھ میں یہ بات آئے گی کہ کسی معاشرہ میں تمام لوگ سراسر نیک اور پاک ہو جائیں اور ان میں برائی کا عنصر بالکل ہی مفقود ہو جائے ایسا تو اللہ تعالے نے بھی نہیں کیا کہ سب کی فطرت کو سلیم بنا دیتا پیغمبرؐ کیوں ایسا کر سکتا تھا۔ شرف صحابیت بہت بڑا اعزاز ہے مگر انہی لوگوں کے لیے جنھوں نے اس شرف و مجد کی قدر کی اور اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوئے مگر وہ ٹٹ پونجیے اور خبیث لوگ جنھوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھیں بند ہوتے ہی طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کے درپئے آزار ہو گئے تو اس قماش کے لوگ کسی احترام کے مستحق نہیں ہیں اور ان کی کوئی حیثیت و وقعت نہیں ہے ایسے صحابہ پر تو خود قرآن مقدس اور احادیث نبویہ نے لعنت بھیجی ہے اس لیے انھیں ملعون قرار دینا قرآن و سنت کی ترجمانی ہے۔

لہ خلیفہ دوم کے زمانہ میں بڑے بڑے صحابہ پر پابندی عاید تھی کہ وہ مدینہ سے باہر نہ جائیں تاکہ اسلام کے نام پر اور اسلامی حکومت کی آڑ میں جو ستم رانی کا سلسلہ جاری تھا اس پر کوئی صدائے احتجاج بلند نہ کر سکے۔ بالخصوص شام میں جس طرح اسلام دشمنی کی تحریک کو تقویت بہم پہونچائی جا رہی تھی اس پر پردہ پڑا ہے۔

کسی مومن کو بے قصور قتل کر دینا جیسا کہ معاویہ نے اس جرم کا بار بار ارتکاب کیا. کیا اسے قرآن مقدس کی آیت کریمہ کا مصداق نہیں بنا دیتا کہ

ومن یقتل مومنا متعمد انجزاءہ جہنم خالدا فیہا وغضب اللہ علیہ ولعنہ واعدلہ عذابا عظیما.

"اور جو شخص کسی اہل ایمان کو جان بوجھ کر قتل کرتا ہے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس پر خدا کا غضب ٹوٹے گا اور اس پر خدا کی پھٹکار پڑے گا اور خداوند تعالےٰ نے اس کے لیے بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے سیدنا امام حسنؑ کو زہر دے کر شہید کر دینا مالکؓ اشتر کو زہر آلود شہد کھلا کر موت کے گھاٹ اتار دینا. حجرؓ بن عدی کو دردناک طریقے سے قتل کروا دینا محمد بنؓ ابی بکر کو آگ میں بھون دینا اور اسی قبیل کے جلیل القدر اکابر کے خون سے ہولی کھیلنا کیا معاویہ اور اس کے حواریوں کے لعنتی ہونے کے لیے کافی نہیں ہے.

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمارؓ بن یاسر کو برا بھلا کہنے والے کو بھی لعنتی قرار دیا تھا. اور معاویہ نے تو اس عظیم انسان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ لیے تو کیا وہ اس گھناؤنے جرم کی بنا پر مستحق لعنت نہیں ہے؟

دنیا میں آنکھوں کے اندھوں کی طرح عقل کے اندھوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے بلکہ تناسب کے اعتبار سے عقل کے اندھوں کی بہتات ہو گی جانتے بوجھتے ہوئے ایک شخص کی بدکاریوں اس کی خباثتوں، اس کی بدنہادیوں اور... وسیہ کاریوں کے علی الرغم اسے اپنا مقتدا اور پیشوا ماننا اس کی عزت و تکریم کرنا اس کی عظمتوں کے قصیدے پڑھنا یہ ہے وہ سرمایۂ افتخار جو سواد اعظم کو نصیب ہوا ہے گویا جیسے "سواد الوجہ فی الدارین" (دونوں جہان میں

میں منہ کالا) کہا جاتا ہے وہ اس سواد اعظم کا طرۂ امتیاز ہے۔
علیؑ کی خلافت بھی برحق ہے اور معاویہ کی بغاوت۔ میرے دونوں ہاتھ نکلے کام کے۔ یہ کونسا فلسفہ اخلاق اور ضابطۂ افکار ہے کہ دو متحارب قوتیں برسرِ پیکار ہوں رزم گاہ کا سماں ہو زندگی سے زندگی آپس میں ٹکرا رہی ہو حق و باطل کی کش مکش کا منظر عیاں ہو لیکن عقل کے اندھوں کا ایک بہت بڑا گروہ جسے اپنی اکثریت پر ناز ہے اس ساری صورت حال کا جائزہ یوں لیتا ہے جیسے یہ کفر و اسلام کی جنگ نہیں تھی۔ کرکٹ یا ہاکی کا میچ تھا کہ دونوں ٹیموں نے سپورٹس مین سپرٹ کا خوب مظاہرہ کیا اس لیے دونوں ہی داد کے قابل ٹھہریں یعنی بقول میرؔ ؎

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

خلیفۂ دوم کی شراب نوشی

عہد خلافت راشدہ کی ایک جھلک

خلیفۂ دوم عمر ابن خطاب کے بارے میں کتب حدیث میں تصریح آئی ہے کہ حضرت شراب کے رسیا تھے اور شراب بھی کیسی ۔

وہ مئے تند کہ ہوش آئے نہ تا یوم حساب

عن عمر انہ کان یشرب النبیذ الذی اذا شرب بہ رجل اخر ذھب عقلہ

"عمر کے متعلق یہ روایت ہے کہ وہ ایسی تند و تیز "بنیذ" (شراب کی ایک قسم) پیتے تھے کہ اگر دوسرا کوئی اسے پی لیتا تو اس کے ہوش و حواس ٹھکانے نہ رہتے۔

یہ ایک بہت بڑے دیوبندی عالم مولوی حسین علی کی "تحریرات حدیث" کی عبارت ہے جو انھوں نے صحاح ستہ کی روایات کی چھان پھٹک کر کے مرتب کی ہے۔ کتاب کا پورا نام ہے "تحریرات حدیث علی اصول التحقیق" مطبوعہ یونین پریس ملتان۔ شعبان سنہ ۱۳۶۲ھ مطابق اگست ۱۹۹۳ ص ۱۰۲

مولوی حسین علی کس پایہ کے عالم تھے اس کا اندازہ ان کے شاگردوں

کی شہرت سے کیا جا سکتا ہے ان کے تلامذہ میں شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان اور پیر طریقت سید عنایت اللہ شاہ بخاری جیسے جلیل القدر علماء شامل ہیں۔

اور یہ بات تو تاریخ کے ادنیٰ طالب کو بھی معلوم ہے کہ خلیفۂ دوم جب ابو لولو فیروز مجوسی کے سہ دھارے خنجر سے بسمل ہوئے تو انھیں جو مشروب پلایا وہ یہی شراب خانہ خراب "بنیذ" تھی جو ان کے حلق میں انڈیل دی گئی اور زخموں کے راستے نکل گئی اور تب ان کے تیمارداروں کو یقین ہو گیا کہ اب ان کی زندگی آخری دموں پر ہے۔

پاکستان کے ایک سابق اور مرحوم وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے لاہور کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے جب علانیہ یہ اعتراف کیا کہ وہ مسلسل کئی گھنٹے کام کرنے کے بعد تھوڑی سی شراب نوشی کر لیتے ہیں۔ تو ان کے مخالفین نے جو نظام مصطفےٰ اور نظام خلافت راشدہ کے علمبردار تھے اس بات کو خوب اچھالا اور ان پر اخبارات و جرائد میں اور بر سر عام تقریروں میں لعن طعن کی گئی کہ ایک اسلامی مملکت کا وزیر اعظم کھلے بندوں شراب نوشی کا اعتراف کرتا ہے۔

لیکن خلافت راشدہ کا ہیرو نمبرا معمولاً شراب نوشی کرتا تھا اور شراب بھی وہ کہ دوسرا پیئے تو ہوش و خرد سے بیگانہ ہو جائے لیکن اس کے بارے میں زبان طعن دراز کرنا کفر کے مترادف قرار پائے۔ یک بام و دو ہوا کی اس سے بہتر یا بدتر مثال کہیں اور مل سکتی ہے۔

اور یہ مغیرہ بن شعبہ جو معاویہ کا یار غار تھا جس نے اسے یزید کی راہ ہموار کرنے کا مشورہ دیا خود کیا تھا خلیفۂ دوم کے زمانۂ خلافت میں

جب یہ کوفہ کا گورنر تھا زنا کے جرم میں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا چاروں گواہ موجود تھے مگر ایک گواہ نے آخری مرحلہ پر خلیفہ دوم کے تیور دیکھ کر کتمان شہادت کیا اور اس طرح یہ شخص سزا سے بچ گیا۔ شرابی خلیفہ نے زانی گورنر کو شرعی حد سے بچالیا اور صحابیت کی دستار شرف دونوں کے سروں پر جمی رہی امیرالمومنین علی علیہ السلام جو آیہ تطہیر کی پاکیزگیوں اور معصومیتوں کے حامل تھے ان کے عہدِ اقتدار میں ایسوں کی دال کہاں گل سکتی تھی اور ان کی عیاشیوں کو سندِ جواز کہاں سے مل سکتی تھی اسی لیے یہ لوگ عمر بھر ان کی مخالفت میں پیش پیش رہے۔

ایک معصوم اور مقدس انسان سے نفرت کے لیے مجرمانہ ذہنیت شرط لازم ہے قرآن مقدس نے کیا خوب کہا ہے۔

وکذلک جعلنا لکل نبی عدوا من المجرمین

ہم نے ہمیشہ جرائم پیشہ لوگوں ہی میں سے ہر پیغمبر کے دشمن پیدا کیے۔ سو جو نبیؐ کی مسندِ امامت کا وارث ہو ضروری ٹھہرا کہ اس کے دشمن بھی اسی قماش کے لوگ ہیں۔

علی ابن ابی طالبؑ کے دشمنوں میں سے ایک کی زندگی کا سرسری نظر سے جائزہ لیجیے صرف مجرم ضمیر ہی ان کے خلاف صف آرا ملیں گے اور ایک بلند و بالا انسان کی عظمت کے لیے یہ بات بس کرتی ہے کہ گھناؤنے کردار کے لوگ اس کے در پے آزار ہو جائیں۔

عرب شاعروں نے اسی مضمون کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے

لقد زادنی حبا لنفسی اننی
بغیض الی کل امرئ غیر طائل

مجھے اپنی زندگی اس لیے بھی پیاری ہے کہ ہر بے ہودہ شخص اپنے دل میں میرے خلاف بغض کے جذبات رکھتا ہے ایک شاعر نے اسی مضمون کو یوں باندھا ہے۔

واذا اتتك مذمتی من ناقص
فھی الشھادۃ لی بانی کامل

جب کسی ناقص انسان سے میری برائی سنو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ میں ایک کامل انسان ہوں لیکن ایک اور شاعر نے بات کو برملا کہنے کا ایک نیا اسلوب بخشا وہ کہتا ہے۔

حسنا ببکۃ والحطیم وزمزم۔ والراقصات بعیھن الی منی
بغض الوصی علامۃ مکتوبۃ۔ کتبت علی جبھات اولاد الزنا

ترجمہ ان اشعار کا قبل ازیں گزر چکا ہے۔

امیر المومنین سیدنا علی علیہ السلام کے خلاف مغیرہ بن شعبہ نے جو کردار ادا کیا وہ اپنی جگہ کتنا ہی گھناؤنا ہو۔ اس کے اس طرز عمل کو دیکھا جائے جو اس نے اسی "اکفر و اخبث" معاویہ کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے اختیار کیا تو ایسے شخص کو صحابی کہنا تو بجائے خود رہا اسے انسان کہنا بھی انسانیت کی توہین ہے۔

یہ شخص اپنی گورنری کے دور میں کس قدر سفاک ظالم اور خونخوار تھا اس کا ثبوت صرف اس ایک واقعہ سے مل سکتا ہے اگرچہ اس کے گھناؤنے کردار کے لیے ایک سیاہ دفتر درکار ہے۔

معینؓ بن عبداللہ حضرت علیؑ کے طرف داروں میں سے تھے معاویہ اور مغیرہ کی نگاہوں میں کسی مسلمان کا امام علیؑ کا نام لیوا ہونا ایک ایسا جرم تھا جس کی سزا صرف موت ہوسکتی تھی چنانچہ معین بن عبداللہ کو پا بہ جولاں مغیرہ کے حضور پیش کیا گیا مغیرہ نے معاویہ کو اس کے بارے میں اطلاع دی اور پوچھا کہ معین بن عبداللہ سے کیا سلوک کیا جائے؟

معاویہ نے لکھا ہے کہ اگر معین میری خلافت کا اقرار کرلیں تو انھیں چھوڑ دیا جائے۔ مغیرہ نے معین بن عبداللہ سے پوچھا، کیا تم اس امر کی شہادت دیتے ہو کہ معاویہ خلیفہ اور امیرالمومنین ہے؟

معین بن عبداللہ نے جواباً فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ رب العزت برحق ہے قیامت کا آنا برحق ہے جس میں کوئی شک نہیں اور میں اس امر کی بھی شہادت دیتا ہوں کہ مرنے کے بعد جی اٹھنے کی بات بھی برحق ہے۔ اس پر مغیرہ نے معین بن عبداللہ کے قتل کا حکم دیا اور انھیں تہ تیغ کردیا گیا۔

(الکامل الابن اثیر)

اور کوئی پوچھے اس دوسرے "حضرت مغیرہ ابن شعبہ سے معاویہ کے خبث باطن اور اس کی بے ایمانی اور کفر کا اس کو اسی روز پتہ چلا جب وہ اپنے دور کے سب سے عظیم انسان سے برسر پیکار تھا اور مغیرہ اس کی دسیسہ کاریوں اور بدکرداریوں میں اس کا برابر کا شریک تھا اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ "ذات شریف" کون ہے اور وہ خود کس مقام پر کھڑا ہے؟ معاویہ کے اس طرز گفتگو اور انداز بیان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضور سرور کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اذان میں پانچ مرتبہ نام لیا جانا بھی اسے گوارہ نہیں اور اسے کتنی حسرت

ہے کہ اس کا نام تو مٹ جائے گا لیکن اس کے مرنے کے بعد بھی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام اسی عزت وتکریم سے لیا جاتا رہے گا جس پر اس کے باپ کو بھی تکلیف تھی اس کی ماں بھی جلتے توے پر دانہ اسپند کی طرح رقص کرتی رہی اور خود بھی انگاروں پر لوٹتا رہا۔

اور حضورؐ اقدس کی ذات تو "ورفعنا لك ذكرك" "ہم نے آپ کے ذکر کو سرفرازی عطا کی) کے وعدۂ خداوندی سے بطور خاص نوازی گئی تھی اس لیے اس نام کو تو خاندان بنی امیہ کے عثمان بن عفان سے لے کر اس بدنہاد خانوادے کے کسی دوسرے فرد تک کی پے در پے کوششوں سے مٹایا نہیں جاسکتا تھا وہ تو اپنے حریف کے نام کی عظمت کو بھی نہ مٹا سکے کہ آج امت مسلمہ کی ایک کثیر تعداد جس کا شمار کروڑوں سے متجاوز ہے اذان میں "اشہد ان علیا ولی اللہ وصی رسول اللہ وخلیفتہ بلا فصل" کے کلمات بھی دن میں پانچ مرتبہ دہراتی ہے اور دنیا کے ہر گوشہ میں علیؑ، علیؑ کا نعرہ بلند ہوتا ہے اور کوئی ہے جو اس نعرہ کی آب وتاب اور اس کی گھن گرج اور اس کی گونج پر قدغن لگا سکے۔

یہاں مجھے عربی کے ایک نامور شاعر اور شام کے سرکردہ ادیب استاد محمد مجذوب کے وہ اشعار یاد آئے جن میں انھوں نے سیدنا علیؑ ابن ابی طالب سے معاویہ بن ابی سفیان کا تقابل کیا ہے اس قصیدہ کا عنوان ہے۔

"علی قبر معاویہ" (معاویہ کی قبر پر)

شاعر کہتا ہے ؎

این القصود ابا یزید ولهوها
والصافنات وزهوها والوُرّد

اے معاویہ اے یزید کے باپ وہ محلات کیا ہوئے اور وہ لہو و لعب کے تماشے کہاں گئے وہ گھوڑے وہ فخر و غرور اور وہ سرداری کیا ہوئی۔

این الدھار بحرت غربہ علی
اعتاب دنیا سحرھا لاینفد

وہ شاطرانہ چالیں جنھیں تم نے دنیا کی چوکھٹ پر برباد کردیا اب کہاں ہیں اور وہ دنیا اس کا طلسم تو کبھی نہ ختم ہونے والا ہے۔

اثرت فالدنیا علی الحق الذی
ھو لو علمت علی الزمان مخلد

دنیا کی مٹ جانے والی لذتوں کو تو نے اس سچائی اور حق پر ترجیح دی جو سچائی ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔

تلك البهارج قد صفت بلبيها
وبقيت وحدك عبرة تتجدد

وہ جھوٹی شان و شوکت جس کے ٹھاٹھ تم نے جائے تھے رخصت ہوئی اور اب تم عبرت کا نشان بن کر رہ گئے ہو۔

ھذا اقبر بجك لو بصرت بنوسہ
لا سال معك المصير الا سود

یہ تمہاری قبر اس کی خستہ حالی اور ویرانی کو کاش تم دیکھ سکتے تو اپنے انجام بد پر تمہارے آنسو بہ نکلتے۔

کتل من الترب البین نجربۃ
سکرا لذباب بہا فواح یعربد

ایک ویرانے میں مٹی کا ایک ڈھیر ہے جس پر مکھیاں ناچ رہی ہیں اور بدمستی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔

خضبت معالمها علی زوارها
فکانها فی مجهل لا یقصد

آنے جانے والے کسی شخص کو مٹی کے اس ڈھیر کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہے یہ گویا ایک مجہول الحال قبر ہے جس کا کوئی رخ نہیں کرتا۔

ومشت بها رکب البلی فجدارها
عار یکاد من الضراعة یسجد

جس حجرے میں یہ قبر پنہاں ہے زمانہ کے حوادث نے اسے اس طرح پامال کیا ہے کہ اس کی دیواریں باعثِ ننگ ہیں اور قریب ہیں کہ گر پڑیں۔

والقبة الشماء نکس طرفها
فبکل جزء للفناء بها ید

اس کا بلند قبہ بھی بوسیدہ ہو چکا ہے اور اب اس کا ایک ایک حصہ فنا کی دستبرد کا شکار ہو چکا ہے۔

تهمی السحائب من خلال شقوقها
والریح فی جنباتها تتردد

اس قبہ کی دراڑوں میں بارش کا پانی ٹپکتا ہے اور ہوا یہاں سے یوں گزرتی ہے جیسے آوارہ روح۔

حتی المصلی مظلم فکانت

من کان لم یجتزبہ متعبد

اس قبہ سے ملحق عبادت گاہ بھی تاریکی میں ڈوبی ہوئی ہے یوں لگتا ہے جیسے یہاں سے کبھی کسی عبادت گزار کا گذر ہی نہیں ہوا۔

أبایزید لذلك حكمة خالق

تجلی علی قلب الحکیم فیرمشد

اے معاویہ اے یزید کے باپ یہ پروردگار عالم کی حکمت ہے جس سے ایک دانشور کو بہرہ ملتا ہے اوران حکمتوں سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔

ارأیت عاقبة الجموح ونزوة

اودی بلبك غیها المتردد

حرص وحوس کے جس گھوڑے پر تو سوار تھا اس کا اوراس کی اچھل کود کا انجام تودیکھ لیا؟ اس حرص وہوس کی گمراہ کن حرکت ہی نے تیری عقل کو اندھا کردیا تھا۔

اغرتك بالدنیا فرخت تشنها

حربا علی الحق الصواح وتوقد

یہ عقل کا اندھا پن تھا جس نے تجھے دنیا کے فریب میں مبتلا کردیا اور تو نے اس دنیا کی خاطر حق وصداقت سے تصادم مول لیا۔

أابایزید وساء ذلك عثرة

ماذا اقول وباب سمط

اے یزید کے باپ! تیرے اس گھناؤنے انجام پر تجھ سے کیا کہوں کہ تیری

قوت سامعہ حق سننے سے ہمیشہ محروم رہی۔

قم وارمق النجف الشریف بنظرہ

یرتد طرفک وھو باک ارمد

اٹھ اور ایک نظر نجف اشرف کی جانب دیکھ تو اپنے جلیل القدر حریف کی عظمت کے انداز دیکھ کر تیری آنکھیں خون کے آنسو روئیں گی۔

تلک العظام اعز ربک قدرھا

فتکاد لولا خوف ربک تعبد

نجف اشرف کے مرقد مقدس میں محو خواب شخصیت کو خدائے بزرگ نے کس اعزازات سے نوازا کہ اگر شرک کا اندیشہ نہ ہوتا تو لوگ اس مرقد کی پرستش کرتے۔

ابداً تباکرھا الوفود یحثھا

من کل حدب شوقھا المتوقد

یہاں زائرین کا ہر دم تانتا بندھا رہتا ہے جنھیں اس مزار مقدس کی محبت دنیا کے کونے کونے سے کھینچے لیے چلی آرہی ہے۔

نازعتھا الدنیا ففزت بوردھا

ثم انطوی کالحلم ذالک المورد

نجف اشرف کی اس مقدس شخصیت سے تو نے دنیا کی خاطر لڑائی مول لی وہ دنیا تجھے مل بھی گئی مگر اب وہ دنیا ایک خواب و خیال بن کر رہ گئی ہے۔

وسعت الی الاخری ناسیح ذکرھا

فی الخالدین وعطف ربک اخلد

اگر طلحہ اور زبیر اور ام المومنین عائشہ سچی تھیں تو آپ بھی انہی کی بات پر اعتقاد رکھیں اور تسلیم کریں کہ واقعی قتل عثمان میں حضرت علیؑ کا ہاتھ تھا اس صورت میں ان کا خلیفۂ راشد ہونا ایک مضحکہ خیز بات ہے کیونکہ کوئی خلیفۂ راشدہ کسی دوسرے خلیفۂ راشدہ کو قتل کروانے کے بعد خلافت راشدہ کے منصب پر فائز نہیں رہ سکتا اور اس لیے شرافت و اخلاق و انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ حضرت علیؑ کو خلافت راشدہ کے دائرہ سے خارج کر دیں۔

اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اول الذکر تینوں اصحاب اپنے دعوی اور موقف میں جھوٹے تھے تو آپ انھیں سیدھی طرح باغیوں کے زمرہ میں شمار کریں اور ان کے لیے وہی سزا تجویز کریں جو اسلام نے باغیوں کے لیے مقرر کی ہے تب آپ کو ان باغیان خلافت راشدہ کے جنتی ہونے کا ڈھنڈورہ پیٹنا بند کرنا پڑے گا اور ان کے تقدس کی تشہیر ترک کرنی پڑے گی لیکن عجیب خرد ماغ گروہ ہے یہ کہ نہ طلحہ و زبیر و عائشہ کو باغی کہتا ہے نہ حضرت علیؑ کے خلیفہ راشد ہونے کا انکار کرتا ہے ان بھلے مانسوں سے کوئی پوچھے کہ تم زیادہ معتبر ہو یا ام المومنین اور طلحہ و زبیر زیادہ معتبر ہیں قاضی ابوبکر بن العربی نے شیعیت کے رد میں ایک بڑی زوردار کتاب لکھی ہے نام اس کتاب کا "العواصم من القواصم" ہے اس کتاب کو اہل سنت و شیعیت کے بارے میں حرف آخر سمجھتے ہیں اور اس کے مصنف کو جو مشہور خارجی مصنف ابن تیمیہ کا ہمعصر ہے ابن تیمیہ پر فوقیت دیتے ہیں اس کتاب کا حاشیہ محب الدین الخطیب نامی ایک غالی خارجی نے لکھا ہے

اب ذرا "العواصم من القواصم" کا بیان اور اس پر محشی کا تبصرہ دونوں پڑھیے اور عقل کے ان دشمنوں کو داد دیجیے۔ ابوبکر بن العربی کہتا ہے۔

ہیں اور ان کے اس فعل خبث کو اجتہادی غلطی سے تعبیر کرتے ہیں۔

اور ان گالیوں کا نشانہ بننے والی شخصیت کون تھی وہ انسان جس کے بارے میں اُمت کا متفقہ فیصلہ یہ تھا کہ وہ احب الخلق الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (ساری کائنات میں حضورؐ کی محبوب ترین شخصیت) تھے میں کبھی کبھی اہل سنت والجماعت کے اس ذہنی تضاد پر سوچتے ہوئے حیرت زدہ رہ جاتا ہوں کہ یہ کیسی قوم ہے کہ جس نے سوچنے اور سمجھنے کی اپنی ساری صلاحیتیں ضائع کردی ہیں کہ اب کوئی معقول بات ان کے دماغ میں سماتی ہی نہیں ہے اس قسم کا تضاد پاگلوں اور دیوانوں کے پاس تو شاید نظر آجائے لیکن کوئی عقل سے بہرہ مند انسان کیسے ان باتوں پر کیسے یقین کرسکتا ہے لیکن صحابہ کے باب میں ان احمقوں کی مت ایسی ماری گئی ہے کہ ان کے سیاہ کو بھی سفید کہنے پر مصر ہیں اور ان کی ہر غلط بات کی بھی ایسی تاویل کریں گے جس کا نہ کوئی عقلی جواز ہے نہ منطقی نہ اخلاقی فلسفہ اس کی تائید کرتا ہے نہ شرعی استدلال اس کو صحیح قرار دے سکتا ہے۔

مثال کے طور پر قتل عثمان ہی کا واقعہ لے لیجئے ام المومنین عائشہ کہتی ہیں کہ قتل عثمان میں حضرت علیؑ کا ہاتھ تھا عشرہ مبشرہ کی فرضی روایات کے دو ہیرو طلحہ اور زبیر بھی یہی کہتے ہیں اور اسی بنا پر جنگ جمل بھی لڑی گئی موقعہ پر موجود تین بڑی شخصیتیں تو قتل عثمان کا سارا الزام حضرت علیؑ کے سر تھوپیں اور ان کے ہزاروں معتقدین جن میں صحابہ بھی تھے اور تابعین بھی اس جنگ میں ان تین بڑوں کی بھرپور اور عملی حمایت میں جنگ میں براہ راست حصہ لیں لیکن اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت علیؑ کا اس قتل میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔

ہیں کہ عبد اللہ ابن زبیر نے اپنے کسی لڑکے کو حضرت علیؑ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے سنا تو عبد اللہ ابن زبیر نے اپنے لڑکے سے کہا۔

یا بنی انہ واللہ ما بنیت الدنیا شیئاً الا ھدمہ الدین وما بنی الدین شیئاً فھدمتہ الدنیا اما تری علیا وما یظھر بعض الناس من بغضہ ولعنتہ علی المنابر فکانما واللہ یاخذون بناصیتہ رفعا الی السماء وما تری بنی مروان وما یندبون بہ موتاھم من المدح بین الناس فکانما یکشفون عن الجیف۔ (ابن عبد ربہ الاندلسی فی العقد الفرید: ج۲ ص۹۱)

بیٹے! اللہ کی قسم قاعدہ یہ رہا ہے کہ دنیا نے جو کچھ تعمیر کیا دین نے اسے منہدم کر دیا لیکن دین نے جو تعمیر قائم کی اسے دنیا کبھی منہدم نہ کر سکی۔ علیؑ ابن ابی طالب ہی کی شخصیت کو دیکھ لو کہ ان کے خلاف کیا کچھ بغض اور دشمنی کا مظاہرہ نہیں ہوا اور کس طرح محراب و منبر سے ان پر سب و شتم نہیں کیا گیا لیکن یوں لگتا ہے کہ ان ساری مذبوحی حرکتوں سے وہ سیدنا علیؑ کے سر عظمت و افتخار کو اور زیادہ بلند کر رہے ہیں اس کے برعکس بنی مروان نے اپنی اولاد اور اپنے خاندان کی تعریف کے لیے کیا کچھ جتن نہیں کیے مگر جب بھی ان لوگوں کا تذکرہ آتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے کسی مردہ لاش کو کسی نے چوراہے پر لا کر رکھ دیا ہے کہ تعفن اور سڑاند کے بھبھوت اٹھ رہے ہیں۔ اور تبرا کی یہ رسم بد شروع کس نے کی اور وہ کون بدبخت تھا جس نے اسلام کے ایک خلیفۂ راشد کو جس کی خلافت راشدہ میں کسی اہل سنت کو کوئی کلام نہیں منبر و محراب سے گالیاں دینے کا باقاعدہ حکم جاری کیا؟ اس میں بھی کسی کو اختلاف نہیں کہ وہ معاویہ ابن سفیان تھا جس نے اپنی قلمرو سلطنت میں سب و شتم کی اس ملعون رسم کا آغاز کیا لیکن عقل کے کچھ اندھے اس پر بھی معاویہ کی فضیلت و منقبت کا چرچا کرتے

سیدنا علیؑ پر سب وشتم اور لعنت کرنے کا حکم دینے والا انسان شرافت واخلاق کے کسی معیار کے مطابق مسلمان کہلائے جانے کا مستحق ہو سکتا ہے؟ اور اب ایک اور واقعہ ایک اور مخالف کا سنیئے۔

عبداللہ ابن زبیر کو تو آپ جانتے ہوں گے اس کے پورے زمانۂ اقتدار میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام بھیجنے کے رجحان کو دبایا گیا اور وہ خود کبھی بھولے سے کبھی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام نہیں بھیجتا تھا اس کا کہنا تھا کہ لا یمنعنی من ذکرہ الا ان تشمخ رجال بآنافہا۔ مجھے صلوٰۃ وسلام بھیجنے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تذکرہ کرنے سے یہ امر مانع ہے کہ اس ذکر سے کچھ لوگوں کی ناک اونچی ہوتی ہے ظاہر ہے اس کا اشارہ خاندان بنو ہاشم کی جانب تھا۔

اسی عبداللہ ابن زبیر کے لڑکے عامر کی روایت ہے کہ عبداللہ ابن زبیر نے اپنے کسی لڑکے کو حضرت علی علیہ السلام کی شان میں گستاخی کرتے سنا تو انھوں نے اس سے سنا۔ یا بنی اباك وذکر علی رضی اللہ عنہ فان بنی امیہ تنقصۃ ستین عاما فما زادہ اللہ بذالك الا رفعتہ۔

(البیہقی فی المحاسن والمساوی ج ۱ ص ۳۹)

بیٹے! حضرت علیؑ کی توہین کا ارتکاب مت کرو بنی امیہ کے افراد نے ساٹھ برس تک ان کی توہین وتنقیص میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا لیکن اس کے باوجود سیدنا علیؑ کی عظمت ورفعت شان اتنی ہی زیادہ نمایاں ہوتی چلی گئی۔

عبداللہ ابن زبیر کے ایک دوسرے لڑکے حمزہ بن عبداللہ بن زبیر کہتے

ابن الکلبی نے اپنی کتاب "الغرائب" میں حجاج بن یوسف ثقفی اور عبداللہ بن ہانی اودی کا ایک مکالمہ نقل کیا ہے یہ شخص حجاج کی بارگاہ میں سے تھا ایک مرتبہ دوران گفتگو اس نے اپنے قبیلہ "ابن" کے فضائل ومناقب کا تذکرہ شروع کر دیا اسی ضمن میں اس ملعون انسان نے سب سے زیادہ جس بات پر حجاج سے داد حاصل کی وہ یہ تھی کہ

وما منا رجل عرض علیہ شتم ابی تراب ولعنہ الا فعل وزاد ابنیہ حسنا وحسینا وامہما فاطمۃ فقال حجاج عن ذلک منقبۃ واللہ۔

"عبداللہ بن ہانی اودی نے اپنے قبیلہ کے فضائل بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے قبیلہ کے کسی فرد کے سامنے جب بھی سیدنا علی علیہ السلام کو گالی گلوچ کی گئی تو اس نے حضرت علیؑ کے ساتھ ساتھ ان کے دونوں بیٹوں حسنؑ و حسینؑ اور ان کی والدہ سیدہ فاطمہؑ کو بھی اس سب وشتم میں شریک کر لیا" اس پر حجاج بولا "اللہ کی قسم یہ بہت بڑی خوبی ہے"

اس معاملہ پر بنی امیہ کی جرأت اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ سیدنا علی علیہ السلام پر سب وشتم کرتے ہوئے حضرت علیؑ کے تمام شخصی امتیازات اور خارجی میزات کا ذکر بھی کیا جاتا تھا اور تب ان پر لعنت کی جاتی تھی مثلاً ایک شخص اٹھ کر کہتا تھا۔

علیؑ جو فرزند ہے ابو طالبؑ ابن عبدالمطلب بن ہاشمؑ بن عبد منافؑ کا جو پیغمبرؐ خدا کا چچازاد بھائی ہے جو پیغمبرؐ خدا کی بیٹی فاطمہؑ کا شوہر ہے جو حسنؑ اور حسینؑ کا باپ ہے اس پر لعنت کرتا ہوں اور اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کہتا تھا میں نے کوئی بات اشارۃً تو نہیں کہی (الکامل للمبرد ج ۲ ص ۶)

کسی انصاف پسند سنی مسلمان سے پوچھیں وہ دل پر ہاتھ رکھ کر بتائے کہ

جب کہ سیدنا علیؑ کی روح مقدس نے آخرت کو تیرے مقابلہ میں دنیا پر فوقیت دی اور انھیں زندگی جاوید کی ضمانت ملی خدائے قدوس کی انصاف وعنایات سے زیادہ پائیدار اور غیر قانونی سے اور کیا ہو سکتی ہے۔

جن لوگوں کو سفر شام کا اتفاق ہوا ہے اور معاویہ کی قبر کی خستہ حالی اور بدنظری دیکھنے کا جنھیں موقع ملا ہے اور اس کے مقابلہ میں جو لوگ نجف اشرف کی بارگاہ امامت میں حاضری کے شرف سے مشرف ہوئے ہیں وہ اس قصیدے کے ایک ایک شعر کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ رسوائی کس کا ابدی مقدر بن گئی اور عظمت وجلالت کا رتبہ بلند کسے ملا۔

برزمینے کہ نشان کف پائے تو بود
سالہا سجدہ گہ صاحب نظراں خواہد بود

معاویہ اور اس کی ذریت اور اس کے خاندان اور اس کے اعوان وانصار نے جن میں ایک نمایاں نام مغیرہ بن شعبہ کی بھی ہے۔ کیا کچھ کوشش اس باب میں نہیں کی کہ سیدنا علیؑ ابن ابی طالبؑ کی بلند وبالا شخصیت کی عظمت کو مجروح کیا جائے برسہا برس تک معاویہ نے مسجد کے منبر ومحراب سے سیدنا علی علیہ السلام پر سب وشتم کرایا انھیں علانیہ گالیاں دلوائیں اور اس کے زرخرید ملازموں نے جن میں ابوہریرہ جیسے ضمیر فروش لوگ بھی تھے حضرت امیر علیہ السلام کی ذات میں کیڑے ڈالنے کی ناپاک کوششیں کیں لیکن وہ ذات قدسی صفات جسے پیغمبرؐ نے اپنا وصی اپنا جانشین اپنا خلیفہ اور اپنے بعد اپنی امت کا امام قرار دیا تھا مشرق ومغرب میں اس کا نام آفتاب کی مانند روشن ہے اور اس کے معاندین کی روسیاہی اور بخت کی دارگونی پر وقت نے مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

اما وجود الحرب بینهم فمعلوم قطعا واما کونه بهذا السبب فمعلوم کذلک قطعا واما الصواب فیه فمع علی لئن طالب الدم لا یصح ان یحکم وتهمة الطالب القاضی لا توجب علیه ان یخرج علیه بل لیطلب الحق عنده فان ظهر له قضاء والا سکت وصبر فکم من حق یحکم الله فیه وان لم یکن له دین فحینئذ یخرج علیه فیقوم له عذر فی الدنیا ولئن اتهم علی بقتل عثمان فلیس فی المدینة احد من اصحاب النبی صلی الله علیه وآله وسلم الا وهو متهم به معلوم قطعا انه قتله لان الف رجل جاؤ القتل عثمان لا یغلبون اربعین الفا۔

جہاں تک صحابہ میں جنگ کے برپا ہونے کا تعلق ہے تو یہ تو قطعی طور پر ایک امر واقعہ ہے اور جہاں تک اس جنگ کے محرکات وعوامل کا معاملہ ہے تو اس کی وجہ بھی حتمیت کے ساتھ سب کو معلوم ہے کہ اس کا محرک قتل عثمان تھا۔ لیکن اس جنگ میں علیؑ ابن ابی طالبؑ کا موقف درست تھا کیونکہ قصاص کا مطالبہ کرنے والے کو فیصلہ کرنے کا حق نہیں ہوتا اور اگر قصاص کا مطالبہ کرنے والا شخص فیصلہ کرنے والے جج یا حکمراں کو متہم قرار دے تو اس سے اسے یہ حق نہیں مل جاتا کہ وہ اس کے خلاف بغاوت اور خروج کرے اس کو صرف اپنے حق کا مطالبہ کرنے کی اجازت ہے اگر فیصلہ اس کے حق میں ہوا تو ٹھیک ہے ورنہ اس پر صبر کرے اور خاموشی اختیار کرے کیونکہ بہت سے حقوق کی بازیابی کے سلسلے میں اللہ رب العزت کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ ہوتا ہے البتہ اگر حاکم یا قاضی دین سے بے بہرہ ہو اور شریعت کو نہ مانتا ہو اس صورت میں اس کے خلاف بغاوت کی جاسکتی

ہے اور باغی کا عذر قبول ہو سکتا ہے

اگر حضرت علیؑ کو قتل عثمان میں ملوث کیا جا سکتا ہے تو مدینہ منورہ میں دوسرا ایسا کونسا صحابی ہے جو اس الزام سے بری الذمہ قرار دیا جا سکے۔ جب کہ قطعی طور سے یہ بات ثابت نہیں کہ حضرت علیؑ نے یا کسی دوسرے صحابی نے قتل عثمان میں حصہ لیا ہے اور آخر یہ بات کیوں کر باور کی جا سکتی ہے کہ ایک ہزار آدمیوں کا جتھہ جو عثمان کو قتل کرنے کے لیے مدینہ میں گھس آیا تھا۔ مدینے کی چالیس ہزار آبادی پر غالب آ گیا ہو" اس موقعہ پر محب الدین الخطیب نے جو "العواصم من القواصم" کا حاشیہ نگار ہے اپنی جانب سے اس عبارت کی حاشیہ آرائی کی ہے۔ لیس فی اهل السنة رجل واحد یتهم علیا بقتل عثمان لا فی زماننا ولا فی زمانه ۔۱۲۵

اہل سنت میں ایک بھی شخص ایسا نہیں جو حضرت علیؑ کو قتل عثمان میں ملوث قرار دیتا ہو نہ ہمارے زمانہ میں ایسا کوئی شخص ہے نہ خود حضرت علیؑ کے زمانہ میں کسی نے آپ پر اس کا الزام لگایا" کوئی اس لال بجھکڑ سے پوچھے کہ اگر حضرت علیؑ قتل عثمان کی سازش میں شریک نہیں تھے تو طلحہ و زبیر اور معاویہ کی ہنگامہ آرائی اور ام المومنین عائشہ کی جنگی تیاریاں کس سلسلے میں تھیں اور محاذ آرائی کی جو روش ان حضرات نے اختیار کی وہ کس بنا پر تھی۔

اس حاشیہ نگار کی اس عبارت سے یہ بھی پتہ چلا کہ حضرت علیؑ کے زمانہ میں بھی اہل سنت کا گروہ موجود تھا۔

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست

ہم تو اہل سنت کا مفہوم آج تک یہ سمجھتے رہے ہیں کہ جو سنت نبوی پر عمل پیرا ہیں لیکن جن لوگوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

بیماری کے ایام میں سنت پیغمبرؐ کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا ہو کہ "حسبنا کتاب اللہ" ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے. جن لوگوں نے سنت انبیاءؑ کو ٹھکرا دیا ہو یہ کہہ کر کہ پیغمبرؐ کے مال کا کوئی وارث نہیں ہوتا اور اس من گھڑت اور جعلی دلیل کے سہارے پیغمبرؐ علیہ السلام کی اکلوتی... صاحبزادی کو اس کے باپ کے عطا فرمودہ ورثے سے محروم کر دیا ہو انھیں اہلِ سنت کہنا" بازی بازی بارلیش بابا ہم بازی" تو کہہ سکتے ہیں اہل سنت کہنا حقائق کا منہ چڑانا ہے۔

البتہ اگر اس سنت سے مراد سنت شیخین ہے تو ایسی سنت کو دور کا سلام کہ اس سنت شیخین نے ہر غلط کو صحیح قرار دے کر شریعت اسلامیہ کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

اس سنت شیخین پر عمل کرنے کا جس شخص نے وعدہ کیا تھا اس نے اپنے دورِ حکومت میں جو گل کھلائے اور پھر اس کے نتیجہ میں وہ جس انجام بد سے دوچار ہوا وہ اپنے اندر عبرت و موعظت کے بہت سے پہلو رکھتا ہے بشرطیکہ دیدۂ بینا اور چشم عبرت پذیر ہو۔

اہل سنت کے تین بڑوں میں وہ پیر فرتوت جس نے سنت نبیؐ اور سنت شیخین پر عمل کرنے کا اعلان کر کے خلافت راشدہ کو بنی امیّہ کے گھر کی داشتہ بنا دیا اس کی سنت یہ تھی کہ اس نے اپنے خاندان کے لیے بیت المال کا منہ کھول دیا۔ شاید بہت کم سُنیوں کو اس کی خبر ہوگی کہ اہل سنت والجماعت کی وجہ تسمیہ کیا ہے میرا خیال ہے کہ اگر اس کی حقیقت انصاف پسند، غیر متعصب، اور غیر جانب دار سنیوں پر منکشف ہو جائے تو وہ خود کو کبھی اس نام سے موسوم کرنا گوارا نہ کریں۔

جس سال معاویہ نے سیدنا امام حسین علیہ السلام سے مصالحت کا ڈھونگ رچایا اور زمام اقتدار پر ناجائز طور پر قبضہ کیا تو اس سال کا نام اس نے "عام الجماعت" رکھا گویا اہل سنت والجماعت کا مطلب یہ ہوا کہ وہ لوگ جو سنت شیخین کو بھی مانیں خواہ اس سے سنت رسول مجروح ہی کیوں نہ ہوتی ہو اور جو معاویہ کے اقتدار کی چوکھٹ پر بھی سجدہ ریز ہوں وہی معاویہ جو اپنے مشکوک نسب کی بنا پر اس قابل بھی نہ تھا کہ نماز کی امامت کے مصلی پر کھڑا ہو سکے، وہی معاویہ جس کا اسلام مارے باندھے کا اسلام تھا جس نے اسلام کے پیغام ہدایت کی بنا پر اسلام کو قبول نہیں کیا تھا بلکہ حالات نے اسلام کے غلبہ و اقتدار کے سامنے اسے سر جھکانے پر مجبور کر دیا تھا وہ معاویہ جس نے امام برحق اور خلیفہ راشد کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، وہ معاویہ جس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سب سے محبوب شخصیت کے خلاف علانیہ منبر و محراب سے سب وشتم کی رسم قبیح کا اجرا کیا وہ معاویہ جس نے ایک حرام زادہ کو محض سیاسی مصلحت کی بنا پر اپنا حقیقی بھائی بنا لیا، وہ معاویہ جس نے اپنے بدکردار، بدنہاد فاسق و فاجر بیٹے کو جانتے بوجھتے ہوئے اپنا ولی عہد نامزد کیا۔ وہی معاویہ جس نے حجرؓ بن عدی جیسے جلیل القدر صحابی کو محض اس جرم کی پاداش میں شہید کرا دیا کہ وہ سیدنا علی علیہ السلام کی شان میں گستاخی کرنے کے حکم کو ماننے پے آمادہ نہ ہوئے، وہی معاویہ جس نے حضرت امام حسن علیہ السلام کو زہر دلوا کر ہلاک کر ڈالا، وہی معاویہ جس نے مالک اشترؓ کو شہد میں زہر ملا کر کھلایا جس سے ان کی موت واقع ہو گئی وہی معاویہ جس کے دربار میں ایک عیسائی درباری نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کعب بن اشرف کے قتل کے سلسلہ

ایک بات جو آج تک میری سمجھ میں نہیں آسکی اور میں نے ہر زاویہ سے اس موضوع پر غور کیا ہے لیکن یہ بات کسی طور حلق سے نیچے نہیں اتری کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ دو آدمی آپس میں برسرِ پیکار ہوں دونوں کے درمیان زبردست جنگ برپا ہوئی جس میں فریقین کے ہزاروں شرکا موت کے گھاٹ اتر گئے ہوں وہ دونوں بیک وقت صحیح کیسے ہو سکتے ہیں دونوں کو خدا کی جانب سے خوشنودی کا سرٹیفکٹ کیسے مل سکتا ہے اور دونوں اجرو ثواب کے مستحق کیسے ہو سکتے ہیں۔

ہدایات عقل کا فیصلہ تو یہ ہے کہ دونوں غلطی پر ہیں یا ان میں سے ایک غلطی پر ہے اور دوسرا حق پر ایک طرف حضرت علیؑ ہیں دوسری جانب معاویہ ہے دونوں میں فرق مراتب پر بھی پوری امت کا اجماع اور اتفاق ہے ایک "مسلم اول شہ مرداں علیؑ" ہے اور یہ اقبال کہتا ہے اور سب ہی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں دوسری جانب معاویہ ہے جو فتح مکہ کے روز مسلمان ہوتا ہے۔

اول الذکر نے ہر معرکہ میں اور جہاد کے ہر محاذ پر دادِ شجاعت دی ایثار و قربانی کی روایتیں قائم کیں دشمنان دین کو اس کی تیغ خارا شگاف نے خاک و خون میں تڑپایا بڑے بڑے سورماؤں کا غرور اس نے خاک میں ملایا۔ دوسری جانب اس کا حریف اس قسم کے کسی اعزاز سے متصف نہیں ہے نہ اس نے کسی جنگ میں حصّہ لیا نہ کسی میں شریک ہوا نہ ایثار و قربانی کی کوئی روایت قائم کی حتیٰ کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کی کسی جنگ میں بھی اس نے شرکت نہیں کی۔

دونوں کے اسلوب زندگی اور انداز فکر میں بھی نمایاں فرق ہے

جس سال معاویہ نے سیدنا امیشہور محدث نا قرار دیا ہے لیکن
ڈھونگ رچایا اور زمام اقتدار پر ناجائز طور پر بلم ببعح دک خلافت راشدہ
نے "عام الجماعت" رکھا گویا اہل سنت والجماعت کا مقہ ہنیں لاویہ کی
جوسنت شیخین کو بھی مانیں خواہ اس سے سنت رسولؐ مجروح ہی ہیعت ہت
اور جو معاویہ کے اقتدار کی چوکھٹ پر بھی سجدہ ریز ہوں وہی معاویہ،
مشکوک نسب کی بنائ پر اس قابل بھی نہ تھا کہ نماز کی امامت کے مصلیٰ پر کھڑا
ہو سکے، وہی معاویہ جس کا اسلام مارے باندھے کا اسلام تھا جس نے اسلام
کے پیغام ہدایت کی بنا پر اسلام کو قبول نہیں کیا تھا بلکہ حالات نے
اسلام کے غلبہ و اقتدار کے سامنے اسے سر جھکانے پر مجبور کر دیا تھا وہ
معاویہ جس نے امام برحق اور خلیفہ راشد کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، وہ
معاویہ جس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سب سے محبوب شخصیت کے
خلاف علانیہ منبر و محراب سے سب و شتم کی رسم قبیح کا اجرا کیا وہ معاویہ
جس نے ایک حرم زادہ کو محض سیاسی مصلحت کی بنا پر اپنا حقیقی بھائی
بنا لیا، وہ معاویہ جس نے اپنے بدکردار، بد نہاد فاسق و فاجر بیٹے کو جانتے
بوجھتے ہوئے اپنا ولی عہد نامزد کیا۔ وہی معاویہ جس نے حجرؓ بن عدی جیسے
جلیل القدر صحابی کو محض اس جرم کی پاداش میں شہید کرا دیا کہ وہ سیدنا
علی علیہ السلام کی شان میں گستاخی کرنے کے حکم کو ماننے پے آمادہ
نہ ہوئے، وہی معاویہ جس نے حضرت امام حسن علیہ السلام کو زہر دلوا کر ہلاک
کر ڈالا، وہی معاویہ جس نے مالک اشترؓ کو شہد میں زہر ملا کر کھلایا جس سے
ان کی موت واقع ہو گئی وہی معاویہ جس کے دربار میں ایک عیسائی درباری
نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کعب بن اشرف کے قتل کے سلسلہ

اُن کے بارے میں بھی محدثین کی یہ رائے ہے کہ وہ سراسر جعلی اور من گھڑت حدیثیں ہیں۔

لغت کی مشہور کتاب "قاموس" کے مرتب علامہ مجدالدین فیروز آبادی نے اپنی کتاب "سفر السعادۃ" میں لکھا ہے۔

باب فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ اشھر المشہورات من الموضوعات"

"ابوبکر کے فضائل میں جتنی مشہور روایتیں اور حدیثیں مذکور ہیں وہ سب بعد کی گھڑی ہوئی ہیں۔"

اس قسم کی تمام روایتوں کو بیان کرنے کے بعد صاحب قاموس نے تصریح کی ہے۔

وامثال ھذا من المفتریات المعلوتہ بطلانھا سبدیھۃ العقل۔"

"اس قسم کی افترا پردازیوں کا بطلان عقل سے ثابت ہے۔"

بہت سی جعلی اور وضعی حدیثیں اس مطلب کی بیان کی جاتی ہیں جن میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلافت کا استحقاق ابوبکر و عمر کے لیے ثابت کیا گیا ہے مثلاً

عن عبداللہ بن عمر مرفوعا اقتدوا بالذین بن بعدی ابوبکر و عمر۔

(عبداللہ بن عمر خطاب کہتے ہیں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میرے بعد دو آدمیوں کی پیروی کرنا ایک ابوبکر دوسرے عمر اس حدیث کو بھی ہمارے اہل سنت والجماعت حضرات بڑی شد و مد سے اثبات دعویٰ کے

طور پر پیش کرتے ہیں لیکن تمام محدثین نے اسے موضوع قرار دیا ہے لیکن انھی جھوٹی روایتوں کے سہارے ابوبکر و عمر کی خلافت کو خلافت راشدہ ثابت کیا جاتا ہے اور اس قسم کی جھوٹی روایتوں کے بل بوتے پر معاویہ کی فضیلت کے گن گائے جاتے ہیں گویا مسلک اہل سنت والجماعت کی اوقات چند موضوع اور جعلی حدیثیں ہیں جن پر ان کے مذہب کا تمام تر دارومدار ہے اور یہ بات بھی نہیں کہ اہل سنت سے وابستہ علماء کو اس جھوٹ کا پتہ نہ چل سکا ہو خود انھیں کے محدثین اور ناقدین حدیث نے ان روایتوں کو مجروح قرار دیا ہے لیکن اس کے باوجود پچھلے تیرہ سو برس سے جھوٹ کا یہ دھندا بڑے زوروں سے چل رہا ہے اور یار لوگ اس پر سر دھن رہے ہیں اور داد کے ڈونگرے برسا رہے ہیں۔

یہاں ایک اور دلچسپ امر کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہو گا کہ فضائل شیخین میں سنی کتب حدیث میں جو حدیثیں ملتی ہیں ان میں ابوبکر کے فضائل کی روایتیں حضرت عائشہ سے زیادہ تر مروی ہیں یا انہی کے خاندان کے کسی دوسرے فرد کی روایت کردہ ہیں اسی طرح عمر ابن خطاب کے فضائل کے باب میں جو حدیثیں منقول ہیں وہ عبداللہ ابن عمر وغیرہ سے مروی ہیں یا پھر ہر پھر کے بھاڑے کے وہ ٹٹو اور کرایہ کے وہ راویان حدیث ہیں جن کا پیشہ ہی پیسے لے کر حدیثیں گھڑنا تھا جیسے ابوہریرہ ہوئے عبداللہ بن عمرو بن العاص ہوئے مغیرہ بن شعبہ اور عمرو بن زبیر اور اسی قماش کے دوسرے بکاؤ صحابی تھے کہ بقول شاعر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاع سخن کے ساتھ
لیکن عیار طبع خریدار دیکھ کر

ایک بات جو آج تک میری سمجھ میں نہیں آسکی اور میں نے ہر زاویہ سے اس موضوع پر غور کیا ہے لیکن یہ بات کسی طور حلق سے نیچے نہیں اتری کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ دو آدمی آپس میں برسر پیکار ہوں دونوں کے درمیان زبردست جنگ برپا ہوئی جس میں فریقین کے ہزاروں نفر کا موت کے گھاٹ اتر گئے ہوں وہ دونوں بیک وقت صحیح کیسے ہو سکتے ہیں دونوں کو خدا کی جانب سے خوشنودی کا سرٹیفکٹ کیسے مل سکتا ہے اور دونوں اجر و ثواب کے مستحق کیسے ہو سکتے ہیں۔

ہدایات عقل کا فیصلہ تو یہ ہے کہ دونوں غلطی پر ہیں یا ان میں سے ایک غلطی پر ہے اور دوسرا حق پر ایک طرف حضرت علیؑ ہیں دوسری جانب معاویہ ہے دونوں میں فرق مراتب پر بھی پوری امت کا اجماع اور اتفاق ہے ایک "مسلم اول شہ مرداں علیؑ" ہے اور یہ اقبال کہتا ہے اور سب ہی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں دوسری جانب معاویہ ہے جو فتح مکہ کے روز مسلمان ہوتا ہے۔

اول الذکر نے ہر معرکہ میں اور جہاد کے ہر محاذ پر داد شجاعت دی ایثار و قربانی کی روایتیں قائم کیں دشمنان دین کو اس کی تیغ خارا شگاف نے خاک و خون میں تڑپایا بڑے بڑے سورماؤں کا غرور اس نے خاک میں ملایا۔ دوسری جانب اس کا حریف اس قسم کے کسی اعزاز سے متصف نہیں ہے نہ اس نے کسی جنگ میں حصّہ لیا نہ کسی میں شریک ہوا نہ ایثار و قربانی کی کوئی روایت قائم کی حتیٰ کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کی کسی جنگ میں بھی اس نے شرکت نہیں کی۔

دونوں کے اسلوب زندگی اور انداز فکر میں بھی نمایاں فرق ہے

ایک طرف دین کی مکمل پابندی اور پاسداری کا اس درجہ اہتمام ہے کہ خود ارشاد فرمایا۔ لولا الدین لکنت اسوس العرب" مجھے اگر دین کی پاسداری کا احساس نہ ہوتا تو میں عرب کا سب سے بڑا سیاست داں ہوتا۔

دوسری جانب دھوکہ بازی، دھاندلی، بدعہدی اور بدنیتی کا یہ عالم ہے کہ خود اہل سنت کے ایک بہت بڑے امام علامہ راغب اصفہانی جنھوں مفردات القران" جیسی معرکتہ الارا کتاب لکھی اپنی کتاب المحاضرات میں اعتراف کرتے ہیں کہ لم یکن غایتہ الادرک الحاجتہ حل اوحرم ثم لم یکن یبالی بالدین ولا یتفکر فی سخط رب العالمین۔"۔

"معاویہ کی زندگی کا مقصد محض مطلب براری تھا۔ حلال و حرام کی پروا کئے بغیر دین کی اسے کچھ پروا نہیں تھی اور خدا کی ناراضگی کا اسے کوئی فکر نہیں تھا۔"

ایک جانب سیدنا علیؑ ابن ابی طالبؑ کی ذات گرامی ہے جنھیں کیا سنی اور کیا شیعہ سب ہی خلیفہ راشد مانتے ہیں۔

دوسری جانب اسی خلیفہ راشد کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والا شخص معاویہ بن ابی سفیان ہے۔

زبان نبوت و وحی پہلے ہی خبر دے چکی ہے کہ عمارؓ بن یاسرؓ کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا اور عمارؓ بن یاسرؓ سیدنا علیؑ کی فوج ظفر موج کے مقتدر سپہ سالار ہیں جنھیں معاویہ کی فوج کے ہاتھوں جام شہادت نوش کرنا پڑا اور تمام علماء اہل سنت نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان کی توثیق کی ہے۔

حافظ المغرب ابن عبدالبر نے اس حدیث بحوالہ بالا پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے تواترت الاخبار عن النبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم انہ قال تقتل عمارا الفئۃ الباغیۃ وھذا من اخبارہ بالغیب واعلام نبوتہ وھو من اصح الاحادیث۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے تواتر کے ساتھ یہ حدیث روایت کی گئی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ عمارؓ کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔" یہ حدیث جہاں غیب کی ایک خبر دیتی ہے وہاں اسے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نبوت کی علامات میں سے قرار دیا گیا ہے اور یہ نہایت صحیح حدیث ہے۔" مشہور ناقد حدیث ابن وحیہ کہتے ہیں"

۔ لا مطعن فی صحتہ ولو کان غیر صحیح لردہ معاویۃ والکرہ۔

اس حدیث کی صحت کے بارے میں کسی حلقہ سے کوئی طعن و جرح نہیں کی گئی اگر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا یہ ارشاد روایت و سند کے اعتبار سے درست نہ ہوتا تو معاویہ اسے ضرور مسترد کر دیتا اور اس حدیث کی صحت سے انکار کر دیتا۔ گویا معاویہ نے اس حدیث نبوی کی صحت کو تسلیم کرتے ہوئے باغی فوج کا سربراہ بننا قبول کیا اور حضرت عمارؓ بن یاسرؓ کی شہادت کے بعد تو اس کی آنکھیں کھل جانی چاہیے تھیں مگر وہ اپنی باغیانہ روش پر بدستور قائم رہا۔

خلافت راشدہ کی مسند پر فائز ہونے والا بھی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مصداق ہے اور خلافت راشدہ کا باغی بھی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے۔ یہ ہے مسلک اہل سنت کہ باغبان بھی خوش رہے، راضی رہے صیاد بھی

اور اسی بغاوت کے سلسلہ کی ایک اور شہادت اہل سنت کے مستند محدث حافظ ابن حجر عسقلانی نے حضرت عمارؓ بن یاسرؓ کے بارے میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کے متعلق لکھا: رواہ جمع عن الصحابۃ ۔ صحابہ کی ایک کثیر تعداد نے اس روایت کو نقل کیا ہے[1]

اس کے بعد ابن حجر نے ان صحابہ کے نام گنوائے ہیں اور اس کے بعد وہ اپنے تبصرہ میں کہتا ہے۔

وفیہ علم من اعلام النبوۃ وفضیلۃ ظاھرۃ لعلی وعمار رضی اللہ عنھما۔

اس حدیث میں علامات نبوت میں سے ایک علامت موجود ہے اور یہ حضرت سیدنا علیؑ اور حضرت عمارؓ کی فضیلت پر ایک واضح دلیل ہے۔

ایسے بے دین شخص کو جو خلیفۂ برحق کے خلاف خروج کرتا ہے علم بغاوت بلند کرتا ہے عمر بھر اس کی ذات اقدس پر سب وشتم کرتا ہے اور عقل کے اندھے اس کے قصیدے پڑھتے ہیں اور جھوٹی حدیثوں کے سہارے اسے سیّدنا علیہ السلام کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں ؎

شرم تم کو مگر نہیں آتی

اہل سنّت والجماعت کے مذہبی پیشواؤں سے تو کچھ کہنا بے سود ہے

---

[1] اس روایت کے راوی صحابہ کی کل تعداد ۲۷ ہے جن میں ذوالشہادتین، حضرت خزیمہؓ بھی شامل ہیں جن کی اکیلی گواہی دو گواہوں کے برابر تھی۔

کیونکہ وہ تو حقیقت حال کا علم رکھنے کے باوجود صدیوں سے یہ راگ الاپ رہے ہیں لیکن سواد اعظم کو اس مسئلہ پر اور عامتہ المسلمین کو اس بارے میں ضرور غور وفکر کرنا چاہیے کہ وہ کس ڈگر پر چل رہے ہیں اور دو کشتیوں کے سوار بن کر کس منزل کا رخ کر رہے ہیں۔ کتاب کی تنگ دامانی اگرچہ مانع ہے تاہم ایک سنی عالم کی لکھی ہوئی ایک زبردست دستاویزی کتاب "النصائح الکافیہ عن یتولی معاویہ" (معاویہ کی محبت کا دم بھرنے والوں کے لیے جامع نصیحتیں) میں سیدنا علیؑ علیہ السلام اور معاویہ کے انداز سیاست پر جو تبصرہ کیا گیا ہے جی چاہتا ہے کہ اسے یہاں من وعن نقل کردیا جائے تاکہ عبرت وبصیرت کا ایک اور پہلو واضح ہو جائے اور معاویہ سے اظہار بیزاری کی توفیق ارزانی ہو۔ مذکورہ بالا کتاب کے مصنف سید عقیل انڈونیشیا کے بڑے علماء اہل سنت میں سے تھے وہ فرماتے ہیں۔

وانضاح هذا الامر بين انه يقتضى التمهيد له بذكر ما كان من التفاوت بين حال على عليه السلام فى سيرته وبين حال معاويه ومن يشاركه فى آرائه كعمرو بن العاص والمغيرة بن شعبة وذلك ان عليا كرم الله وجهه كان لا يستعمل فى حروبه وسائر افعاله الا ما يوافق الكتاب والسنة ملازما فى جميع حركاته قوانين الشريعة مدفوعا الى اتباعها رافضا ما كان يستعمله المشركون فى الجاهلية والبغاة القاسطون فى الاسلام فى حروبهم من المكر المحظور والخبث والدهاء والغدر والحيلة والتغرير بالاجتهاد فى مقابلة المنصوص وتخصيص العمومات بالآراء

لتوافق الهوى وغير ذلك مما لا ترخص فيه الشريعة
ولا يرضاه الله ولا رسوله فكان كرم الله وجهه يقول
لاصحابه لا تبدأوهم بالقتال حتى يبدأوكم ولا تقتحموا بابا مغلقا
لانه كرم الله وجهه كان ملجما بلجام الورع عن جميع القول
الا ما كان فيه الرضى وممنوع اليدين عن كل بطش
الا ما ارتضاه الكتاب والسنة ومنقبض عن كل تدبير
الا ما اذن الله فيه فكان مجال التدبير عليه ضيقا ومن
هذا التضيق وقعت امور كثيره ينسب اليه القاصرون
التقصير فيها كعدم اقراره معاوية على الولاية فى اول
خلافته ثم يعزله بعد ذلك لما يعلم فى تقريره من الظلم
والجور وكعدم ارضاء طلحة والزبير توليتهما المصرين كما
طلبا حتى فارقاه وكمخاشنته فى الله لبعض اصحابه
كاخيه عقيل وشاعره النجاشى ومصقلة بن هبيرة حتى
فارقوه الى معاويه ولا غرو ان من اقتصر على الكتاب
والسنة فقد حجر على نفسه الواسع ومنع نفسه الطويل العريض
ومالا يتناهى من المكائد ووجوه الفلج والظفر وكان معاوية
واصحابه غير متقيدين بدين ولا ملتزمين فى الباطن
لشريعة بل كانوا يستعملون المكر والخبث والغدر والكذب وا
لتغرير والتاويل مما يستخرجون به وجوه مصالحهم
سواء كان جائزا فى الشرع او محظوراً وسواء اكان فيه
سخط الله تعالى ام رضاه

ومن المعلوم البديهی ان الصدق والكذب معا اوسع مجالا من الصدق وحده وان الحلال والحرام معا اكثر طرفا من الحلال وحده نا تح بذلك لمعاوية واصحابه مجال التدبير من التفريق بين الناس بالكذب والقاء الكتب المزورة فی العسكر بالسعايات ودس السموم فی الاطعمة وبذل الرشوة من مال الله وامثال ذلك من المكائد الاثيمة وزخارف القول المفتعلة. وقد اشار كرم الله وجهه، الی جميع ما قدمناه بكلمات وجيزة مذكورة فی نهج البلاغة قال عليه السلام. والله ما معاويه بادهی منی ولكنه يغدر ويفجر ولولا كراهة الغدر لكنت من ادهی الناس ولكن لكل غدرة فجرة ولكل فجرة كفرة ولكل غادر لواء يعرف به يوم القيامة والله ما استغفل بالمكيدة ولا استغمره بالشديدة.

اس امر کا فیصلہ کہ سیدنا علی اور ان کے حریف روسیاہ معاویہ کے کردار میں کیا تفاوت تھا اور ان میں سے کون حق پر تھا اور کون ناحق اس کے لیے ایک اصولی بات ذہن میں بہ طور تمہید رکھنی ہوگی ایک طرف سیدنا علیؑ کی ذات گرامی اپنی سیرت کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ دوسری جانب معاویہ اور اس کے شرکائے کار عمرو بن العاص اور مغیرہ بن شعبہ جیسے لوگ سیدنا علیؑ کی زندگی کا انداز یہ تھا کہ وہ جنگ ہو یا زندگی کا کوئی اور مرحلہ کسی موقعہ پر بھی وہ کتاب وسنت سے انحراف گوارہ نہیں کرتے تھے اور زندگی کے

تمام معاملات میں اتباع شریعت کا بطور خاص اہتمام ملحوظ رکھتے تھے اور دور جاہلیت کے مشرکانہ ہتھکنڈوں اور اسلام کے باغیوں کے حربوں اور ان کے مروجہ مکروفریب کے طور طریقوں سے اور سیاسی حیلہ جوئیوں اور بدعہدیوں سے ہمیشہ پہلو تہی فرماتے اور احکام خداوندی کے مقابلہ میں اجتہاد یا اپنی یا دوسروں کی رائے کو کوئی وقعت نہیں دیتے تھے اور شریعت کی حدود اور خدا و رسولؐ کی رضا سے انحراف کا تصور تک نہیں کرتے تھے۔ امیرالمومنین سیدنا علیؑ کرم اللہ وجہہ اپنے ساتھیوں سے فرمایا کرتے تھے کہ جب تک دشمن لڑائی میں تم سے پہل نہ کرے تم ان سے مت لڑو اور نفاق و افتراق کے اس بند دروازہ کو کھولنے کی کوشش مت کرو" سیدنا علی کرم اللہ وجہہ خدا خوفی اور تقویٰ شعاری کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے انسان تھے ان کی زبان سے اور ان کے ہاتھ سے کوئی ایسی چیز یا بات سرزد نہیں ہوتی تھی جو خدا اور اس کے رسولؐ کو پسند نہ ہو جس کی سند جواز کتاب وسنت سے انھیں نہ ملتی ہو، وہ کسی ایسی تدبیر کو ہرگز بروئے کار لانے کے روادار نہ تھے جس کی اجازت خدا اور اس کے رسولؐ کی کتاب شریعت میں موجود نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سیاست کاری کا میدان بہت تنگ اور محدود تھا اور اسی بنا پر ان کے بعض قریبی ساتھی بھی انھیں چھوڑ گئے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ جو شخص سیاست میں سیدنا علیؑ کا طرز عمل اختیار کرتا ہے اسے اسی قسم کی دشواری سے سابقہ پڑنا ناگزیر ہے۔ اس کے مقابلہ میں معاویہ اور اس کے ساتھیوں کا کردار واضح ہے وہ شریعت

کے کسی حکم کے پابند نہیں تھے وہ حلال وحرام اور جائز و ناجائز کی پرواہ کیے بغیر اور حدود و احکام شریعت کو پس پشت ڈال کر ہر وہ سیاسی ہتھکنڈہ اور ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کرتا تھا جھوٹ، عیاری، فریب کاری، رشوت کی گرم بازاری، مخالفوں کو زہر دے کر ہلاک کر ڈالنا اور ایسے ہی بدعنوانی کے دوسرے کئی طریقوں کا میدان اس کے سامنے کھلا تھا۔

اور یہی وہ فرق ہے جس کی بنا پر امیر المومنین سیدنا علی علیہ السلام نے اپنے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا۔ آپؑ نے فرمایا تھا اللہ کی قسم! معاویہ مجھ سے زیادہ سیاست داں نہیں ہے لیکن اسے بدعہدی اور بدعنوانی کے کسی عمل سے جھجک محسوس نہیں ہوتی اور اگر بدعہدی مجھے طبعًا ناپسند نہ ہوتی تو میں معاویہ سے بڑا سیاست داں ہوتا۔

لیکن ہر بدعہدی کا سلسلہ فسق وفجور سے جا ملتا ہے اور فسق وفجور کا انجام بجز کفر کے اور کچھ نہیں اور ہر بدعہد شخص کو قیامت کے روز ایک نشان دیا جائے گا جس سے حشر کے مجمع عام میں اس کی رسوائی کے چرچے ہوں گے۔ اللہ کی قسم میں نہ کسی قسم کی فریب کاری کا سہارا لوں گا نہ کسی مشکل سے ہراساں ہوں گا۔

اس طویل اقتباس سے جس کا اختتام سیدنا علیؑ علیہ السلام کے ایک ارشاد گرامی پر ہوا ہے۔

یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ امیر المومنینؑ نے ایک کامل واکمل شریف انسان کی مانند مکر و فریب کی سیاست سے اپنا دامن ہمیشہ پاک رکھا اس وقت بھی جب کہ خلیفۂ اول و دوم ان کے حق پر ڈاکہ ڈالنے

کے لیے اسلام دشمن قبیلوں سے گٹھ جوڑ کر رہے تھے اور اس وقت بھی جب کہ خلیفہ اول و دوم کی در پردہ سازشوں سے بنوامیہ کا بدترین اسلام دشمن شخص معاویہ بن ابی سفیان مسند اقتدار پر قبضہ جمانے کی سازش میں کامیاب ہو چکا تھا۔

دنیا کی ظاہری کامیابی یا ناکامی ہی کو معیار حق و باطل سمجھنے والوں کی نگاہ میں سیدنا علیؑ کی ناکامی شاید کچھ زیادہ اپیل نہ کرے لیکن جن لوگوں کی نظر امروز سے زیادہ فردا پر اور حال سے زیادہ مستقبل پر اور دنیا سے زیادہ آخرت پر ہے انھیں یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ ابدی سرفرازی اور دائمی کامرانی کا تاج امیرالمومنین سیدنا علیؑ کے سر اقدس پر رکھا گیا ہے

جب بھی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جود و کرم حضور نبیؐ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ورثہ علمی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روحانی وراثت، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جود و کرم، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بخشش وعطا، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شجاعت و جواں مردی کا ذکر آتا ہے تو لبوں پر خواہ اپنے ہوں یا بیگانے ایک ہی وارث و امین کا نام آتا ہے اور وہ امیرالمومنین سیدنا علی علیہ السلام کی ذات گرامی کا نام نامی و اسم سامی ہے۔ کرم اللہ وجہہ الکریم دنیا کے علمی ادب میں اگر کسی سورما کا، کسی جواں مرد کا، علم و فضل کے کسی مینار نور کا عزم و استقامت کے کسی ہمالہ کا نام ابھرتا ہے تو وہ صرف علیؑ اور اس کے خانوادہ کا وہ گل سرسبد ہے جس کا نام حسینؑ ہے۔

آخر کیا وجہ ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام نہاد جانشینوں میں کسی کو حسینؑ جیسے شہید اعظم کا باپ ہونے کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ علیؑ کے وارث پیغمبر ہونے کی اگر ساری دلیلیں نظر انداز کر دی جائیں تو شہید کربلا سے اس کی نسبت پدری ہی وہ سب سے بڑی دلیل ہے اس کے وارث پیغمبر ہونے کے لیے کافی ہے۔

خاک کربلا پر خون حسینؑ سے لکھی ہوئی یہ تحریر اس امر کی شہادت ہے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسند امامت و ولایت کا وارث شہدائے کربلا کا مورث اعلیٰ ہے اور کوئی نہیں۔

خاک و خون کی یہ تحریر مٹائے مٹ نہیں سکتی ہے اور جوں جوں انسانی تہذیب کا ارتقائی سفر درجہ کمال کو پہنچتا چلا جائے گا۔ ایک نام وقت کے صفحات پر پوری آب و تاب کے ساتھ روشن سے روشن تر ہوتا چلا جائے گا اور وہ نام ہے

علیؑ ابن ابی طالبؑ کا

دم بہ دم علیؑ علیؑ

دم ہمہ دم

علیؑ علیؑ علیؑ

PANJTANI BOOKS
209 PADHOLME ROAD,
PETERBOROUGH PE1 5JA
TELEPHONE: 01733 347514
SUBSIDISED BY:
MAJLIS-E-ULEMA-E-SHIA (EUROPE)
FIXED SUBSIDISED PRICE [illegible].99
EYE OPENER, LEEDS. Tel: 0374 662607